دکن کی سیاسی تاریخ

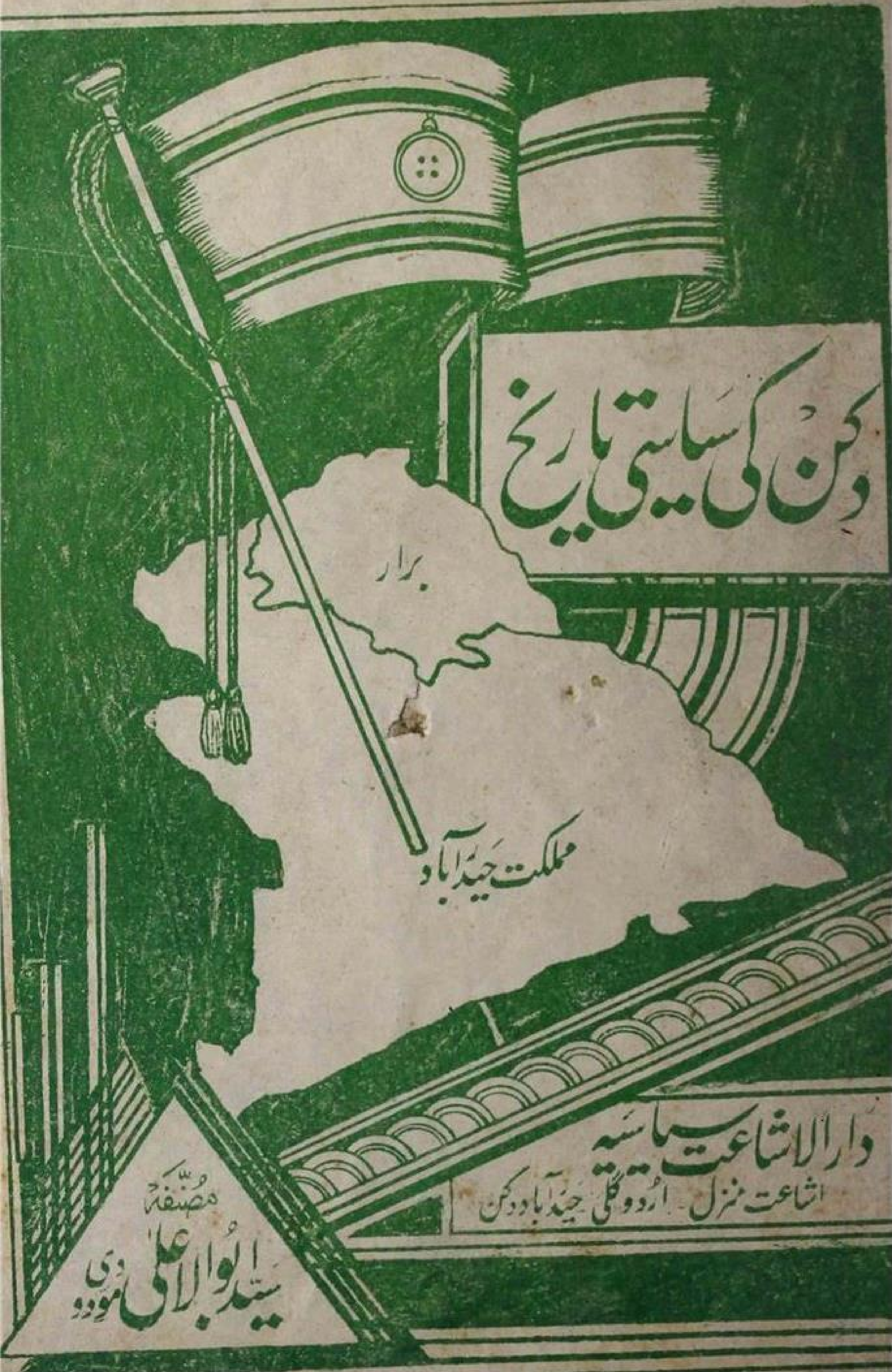
برار
مملکت حیدرآباد

دار الاشاعت سیاسیہ
اشاعت منزل - اردو گلی حیدرآباد دکن

مصنفہ
سید ابوالاعلیٰ مودودی

دکن کی سیاسی تاریخ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دارالاشاعت سیاسیہ (مجلس اتحاد المسلمین)
اشاعت منزل۔ اردو گلی حیدرآباد دکن

جملہ حقوق بحقِ دارالاشاعت سیاسیہ محفوظ ہیں

طبعِ اوّل .... (۱۰۰۰

مارچ ۱۹۴۴ء

قیمت .... قسم دوم عہ ۸ر .... قسم اول ے ۸

عرضِ ناشر

تاریخ ایک آئینہ ہے جس میں ماضی کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ یہ آئینۂ عبرت بھی ہوتا ہے اور آئینۂ بصیرت بھی اس میں خاندانوں سلطنتوں اور قوموں کی تباہی و بربادی کا نقشہ بھی نظر آتا ہے اور آئندہ کے لیے لائحہ عمل مرتب کرنیکا مواد بھی ملتا ہے۔

دکن کی سیاسی تاریخ، بلکہ اور زیادہ صاف الفاظ میں "دولت اسلامیہ آصفیہ کی سیاسی تاریخ" ایک جدید سلطنت کے وجود میں آنے کی تاریخ ہی نہیں بلکہ ایک بہت بڑی شہنشاہیت کے اضمحلال کی تاریخ بھی ہے۔ اور ان دونوں امور سے قطع نظر کرکے دیکھیے تو ایک شخص کی ہمت و جرأت اور تدبر و بصیرت کی تاریخ ہے۔ اس میں ہمیں ایسے بہت سے واقعات و حوادث کے مطالعہ کا موقع ملتا ہے جن سے اب تک ہمارے کان آشنا نہ تھے۔

یہ تو عام بات ہے کہ جب کسی بڑی سلطنت کے قوائے حیات مضمحل ہو جاتے ہیں، اور وہ قوت جامعہ باقی نہیں رہتی جو مختلف عناصر حکومت کو ایک دوسرے سے مربوط رکھے، تو چھوٹی چھوٹی کئی حکومتیں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن نظام الملک آصف جاہ اول کی زندگی اس سے زیادہ کچھ چیزیں ہمارے سامنے پیش کرتی ہے، اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک بہادر سپاہی اور ایک مدبر وزیر کس طرح اپنے آقا کی بہبودی کے لیے اپنی انتہائی توانائیاں قربان کر دیتا ہے۔ اور پھر جب اس کی بصیرت بتاتی ہے کہ آقا اور اس کے گھرانے سے

مردم شناسی اور فکر وبصیرت مفقود ہو چکی ہے تو کس طرح اپنی دانشمندی سے سلطنت کے بہت بڑے حصہ کی قسمت کو ڈوبنے والی سلطنت سے جُدا کر دیتا ہے۔

جزیرہ نمائے ہندوستان کی چھوٹی بڑی بہت سی تاریخیں موجود ہیں لیکن اس خاص موضوع پر زیر نظر کتاب یکتا اور لا ثانی کتاب ہے۔ اب تک دکن کی سیاسی تاریخ پر کوئی ایسی وسیع کتاب لکھی نہیں گئی ہے جس میں حوادث و واقعات کا اس طرح استقصاء کیا گیا ہو۔

کتاب کے مصنف مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، اس سے بلند ہیں کہ ان کا تعارف کرایا جائے، اُن کے خاص موضوع جدید علم کلام کے علاوہ موصوف نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا، حق یہ ہے کہ اس کا حق ادا کر دیا۔ مولانا مودودی جنھوں نے برطانیہ اور آصفیہ کے تعلقات پر مشہور اور معلومات آفریں کتاب لکھی ہے سیاسی تاریخ دکن پر ایسا عبور رکھتے ہیں کہ کسی دوسرے شخص کو سالہا سال کے مطالعہ کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ کتاب مولانا کے وسیع مطالعہ کا ماحصل ہے جو آج دارالاشاعت سیاسیہ کی طرف سے ناظرین کرام کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

سید علی شبر حاتمی

۱۳۶۲۱

فہرست

باب اوّل

نظام الملک اور اُن کا خاندان

۱ نظام الملک کے اسلاف ۱
۲ قلیچ خاں اور میر عابد ۲
۳ غازی الدین خاں فیروز جنگ ۳
۴ نظام الملک کے اسلاف اور ان کے ۱۶
بنی اعمام۔ ″

باب دوم

عالمگیر کی وفات کے بعد

۵ عالمگیر کے بیٹوں کی خانہ جنگی ۱۸
۶ اعظم کی ناکامی اور اس کے اسباب ۲۰
۷ شاہ عالم بہادر کا دورِ حکومت ۲۹
۸ بہادر شاہ کی بے خبری ۳۰
۹ چین قلیچ خاں اور ان کے خاندان ۳۳
سے ناموافقت۔ ″
۱۰ خطابات ومناصب کی ۳۵
ارزانی۔
۱۱ مذہبی فتنہ ۳۷
۱۲ دکن کی صوبہ داری کا جدید عہد ۳۸
۱۳ مرہٹوں کے ساتھ معاملہ ۴۰
۱۴ بہادر شاہ کے بیٹوں کی خانہ جنگی ۴۹
۱۵ بہادر شاہ کے بیٹے اور ان کے ۵۰
اختلافات۔ ″
۱۶ ذوالفقار خاں کی سازشیں ۵۲
۱۷ عظیم الشان شکست ۵۴
۱۸ جہاندار شاہ کا دورِ حکومت ۵۵
۱۹ سلطنت کے پرانے ارکان کی ″
تباہی اور نئے ارکان کی نااہلی ″
۲۰ رفیع الشان اور جہاں شاہ ۵۶
کا خاتمہ۔ ″
۲۱ بادشاہ کی سفلہ نوازی ۵۹
۲۲ شاہانہ رعب ووقار کا خاتمہ ۶۰
۲۳ وزیر کی عیاشی ۶۱
۲۴ وزیر اور بادشاہ کی مخالفت ۶۲
۲۵ چین قلیچ خاں کا واقعہ ۶۳
۲۶ پورب تی میں فرخ سیر کی ۶۴
تحریک۔

۲۷ سادات بارہ فرخ سیر کی حمایت پر۔ ۶۵

۲۸ فرخ سیر کے دوسرے حامی۔ ۶۷

۲۹ فرخ سیر کی پہلی کامیابی ۶۸

۳۰ مقابلہ کے لئے جہاندار شاہ کی طیاری۔ 〃 ۷۰

۳۱ جہاندار شاہ کی شکست ۷۲

۳۲ فرخ سیر کا دور حکومت ۷۴

۳۳ دہلی میں فرخ سیر کا داخلہ ۷۵

۳۴ فرخ سیر کے امراء ۷۶

۳۵ فرخ سیر اور اس کے ارکان دولت کی سیرت۔ ۷۷

۳۶ فرخ سیر اور سادات بارہ کی مخالفت۔ ۸۰

۳۷ سازشوں اور دورخی چالوں کی ابتدا۔ ۸۲

۳۸ سیّدوں اور بادشاہ کے درمیان کش مکش۔ ۸۳

۳۹ دکن میں مرہٹوں سے نظام الملک کے معاملات۔ ۸۶

۴۰ نظام الملک کے عزل کا اثر دکن ریاست پر۔ ۹۱

۴۱ مرہٹوں کے مقابلہ میں حسین علی کی ناکامی۔ ۹۴

۴۲ مرہٹوں سے حسین علی کی صلح۔ ۹۵

۴۳ معاہدہ کی تفصیلات۔ ۹۸

۴۴ معاہدہ پر تبصرہ ۹۹

۴۵ شاہی اجازت کے بغیر معاہدہ کی تصدیق۔ ۱۰۴

۴۶ نظام الملک کی فوجداری مرادآباد 〃

۴۷ فرخ سیر اور سید عبداللہ خاں کے اختلافات۔ ۱۰۶

۴۸ محمد مراد کشمیری کا ظہور اور اس کی سازشیں۔ ۱۰۸

۴۹ دکن سے حسین علی خاں کی واپسی۔ ۱۱۳

۵۰ بادشاہ کی بے کسی اور خوشامد ۱۱۴

۵۱ شہر میں ہنگامہ اور مرہٹوں کا قتل۔ ۱۱۷

۵۲ فرخ سیر کا عزل ۱۱۹

۵۳ رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ ۱۲۰

۵۴ نظام الملک صوبہ داری مالوہ ۱۲۱

۵۵ مرہٹوں کو چوتھ اور سردیسکھی کی اسناد۔ ۱۲۲

۵۶	فرخ سیر کا قتل	۱۲۲	۷۲	محمد شاہ کے نئے ارکان سلطنت۔	۱۵۵
۵۷	آگرہ میں نیکوسیر کا دعویٰ بادشاہی۔	۱۲۵	۷۳	دکن میں مرہٹوں سے نظام الملک کے معاملات۔	″
۵۸	نیکوسیر کی دعوت رد کی جاتی ہے۔	۱۲۶	۷۴	نظام الملک کی وزارت	۱۵۸
۵۹	رفیع الدولہ کی تخت نشینی	۱۲۸	۷۵	بادشاہ اور وزیر میں اختلاف۔	۱۶۲
۶۰	قلعہ آگرہ کی فتح	۱۲۹	۷۶	محمد شاہ کے دوستوں کی حالت۔	۱۶۴
۶۱	محمد شاہ کا دور حکومت	۱۳۰	۷۷	اصلاحات کے لئے نظام الملک کی تجاویز۔	۱۶۸
۶۲	جے سنگھ سے مصالحت	۱۳۱	۷۸	مالوہ اور گجرات کا انتظام	۱۶۹
۶۳	گروہ بہادر سے مصالحت	″	۷۹	نظام الملک کے خلاف سازشیں۔	۱۷۱
۶۴	نظام الملک سے مخالفت کی ابتداء۔	۱۳۲	۸۰	سلطنت کی مایوس کن حالت۔	۱۷۳
۶۵	نظام الملک دکن پہنچتے ہیں۔	۱۳۹	۸۱	نظام الملک پھر دکن میں	۱۷۵
۶۶	دلاور علی خاں کی شکست	۱۴۱	۸۲	مبارز خاں کو نظام کے مقابلہ پر روک دیا جاتا ہے	۱۷۶
۶۷	نظام الملک کے نام صوبہ داری دکن کا فرمان۔	۱۴۳	۸۳	نظام الملک پھر صوبہ دار دکن بنائے جاتے ہیں۔	۱۸۰
۶۸	عالم علی خاں کی شکست	۱۴۵	۸۴	مبارز خاں کی شکست	۱۸۳
۶۹	حسین علی خاں خود مقابلہ کے لئے آتا ہے۔	۱۴۷	۸۵	بادشاہ کے نام نظام الملک کی عرضی	۱۸۶
۷۰	حسین علی خاں کا قتل	۱۴۸			
۷۱	عبداللہ خاں کی سعی انتقام اور ناکامی۔	۱۵۲			

۸۶	نظام الملک کا مالوہ اور گجرات سے معزول اور دکن پر بحال ہونا۔	۱۸۷
۸۷	دولت آصفیہ کی خود مختاری۔	۱۸۷
۸۸	انقراض سلطنت اور دکن کی علیحدگی کے اسباب	۱۸۹

باب سوم

نظام الملک آصفجاہ

۸۹	دولت آصفیہ اور سلطنت مغلیہ کے تعلقات کی نوعیت	۲۰۱
۹۰	دکن میں مرہٹوں سے کش مکش۔	۲۰۷
۹۱	شمالی ہند کے معاملات	۲۱۹
۹۲	گجرات پر مرہٹوں کا تسلط	۲۲۸
۹۳	مالوہ پر مرہٹوں کا تسلط	۲۳۳
۹۴	بندیل کھنڈ پر مرہٹوں کا تسلط۔	۲۳۸
۹۵	قلب سلطنت پر مرہٹوں کی یورشیں۔	۲۴۰
۹۶	نظام الملک دہلی میں	۲۴۹
۹۷	نادر شاہ کا حملہ	۲۵۵
۹۸	حملہ نادر شاہی کے بعد	۲۸۳
۹۹	نقشہ کی تشریح	″

باب اوّل

نظام الملک اور ان کا خاندان

دولت آصفیہ کے قیام میں جن اہم اسباب نے حصہ لیا ہے انہیں سے ایک خود نظام الملک آصفجاہ کی شخصیت اور ان کی خاندانی وجاہت بھی ہے، لہذا اس سلطنت کے قیام کی تاریخ کو قدرتی طور پر بانی سلطنت اور اسکے خاندان کے حالات سے شروع ہونا چاہئے۔ لیکن چونکہ ہماری تاریخ ایک عمومی تاریخ نہیں، بلکہ ایک سیاسی تاریخ ہے۔ اس لئے ہم کو شخصیتوں کے حالات سے صرف اسی حد تک تعرض کرنا چاہئے۔ جس حد تک وہ سیاسی حیثیت سے اہم اور نتیجہ خیز ہوں۔

نظام الملک کے اسلاف

نظام الملک کا سلسلۂ نسب سترہ واسطوں سے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ تک، اور ۳۲ واسطوں سے امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔ فتنۂ تاتار کے بعد یہ خاندان ماوراءالنہر میں آباد ہو گیا تھا، اور وہاں اپنی عالی نسبی اور علم و عمل کے سبب سے اس کو خاص قدر و منزلت حاصل تھی۔ اسی خاندان کے ایک بزرگ خواجہ میر اسمٰعیل عرف عالم شیخ

تھے جن کو امیر سمرقند نے اعلم العلما کا خطاب دیا تھا ان کی متعدد تصانیف میں جن میں سے عوارف اور رشح النصائح اور اعلام التقی کے نام تاریخوں میں ملتے ہیں۔ عالم شیخ کے دو بیٹے تھے۔ ایک خواجہ عابد جو نظام الملک کے دادا ہیں۔ دوسرے خواجہ بہاء الدین جو سمرقند کے قاضی ہوئے اور جن کے بیٹے محمد امین خاں اور پوتے قمر الدین خاں سلطان محمد شاہ کے عہد میں سلطنت کی وزارت پر سرفراز ہوئے۔

قلیچ خاں اور عابد نظام الملک کے دادا خواجہ عابد تحصیل علوم کے بعد سمرقند سے بخارا گئے اور وہاں پہلے منصب قضا اور پھر شیخ الاسلامی پر مامور ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان شاہجہاں کے زیر حکومت دولت کے چشمے اگل رہا تھا۔ امنیت و خوشحالی کے ساتھ قدردانی و جوہر شناسی کے اجتماع سے ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی تھی جسمیں ہر شخص کے لئے اپنے ذاتی کمال اور فطری جوہر کے مطابق ترقی کے غیر معمولی امکانات مہیا تھے، اور دور دور کے لوگ دربار شاہجہانی کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ انہی حالات کی کشش نے خواجہ عابد کو بھی ہندوستان پہنچایا اور سنہ ۲۹ شاہجہانی (۱۰۶۶ھ / ۱۶۵۵-۵۶ء) میں انھوں نے ہندوستان آکر شاہی ملازمت حاصل کی۔ اسکے تھوڑے ہی عرصہ بعد انقلاب سلطنت نے اورنگ زیب عالمگیر کو تخت سلطنت پر پہنچایا۔ اور اس تغیر سے خواجہ عابد کے لئے مزید ترقیات کا دروازہ کھل گیا۔ جلوس کے بعد ہی بادشاہ نے انکو منصب چہار ہزاری عطا کیا۔ سنہ ۶ جلوس (۱۰۷۳ھ / ۱۶۶۲ء) میں صدارت کل سنہ ۱۰ (۱۰۷۹ھ / ۱۶۶۸ء) میں صوبہ داری اجمیر اور سنہ ۱۴ (۱۰۸۲ھ / ۱۶۷۱ء) میں صوبہ داری ملتان پر مامور کیا۔ سنہ ۲۴ (۱۰۹۲ھ / ۱۶۸۱ء) میں قلیچ خاں کا خطاب دیا،

سنہ ۲۴ (سنہ ۱۰۹۳ھ / ۱۶۸۲ء) میں دوبارہ خدمت صدارت کل پر مقرر کیا۔ سنہ ۲۵ (سنہ ۱۰۹۴ھ / ۱۶۸۲ء) میں دکن بھیجا جہاں مختلف جنگی خدمات انجام دینے کے بعد وہ سنہ ۲۹ (سنہ ۱۰۹۷ھ / ۱۶۸۶ء) میں بیدر کے صوبہ دار بنائے گئے۔ سنہ ۳۰ عالمگیری (سنہ ۱۰۹۸ھ / ۱۶۸۷ء) میں جب قلعہ گولکنڈہ کا محاصرہ شروع ہوا تو اسمیں خواجہ عابد پیش پیش تھے۔ ابتدائی چھیڑ چھاڑ ہی تھی کہ قلعہ پر سے ایک زنبورک کا گولہ آکر انکے شانے میں لگا جس سے ہاتھ الگ ہوگیا۔ انکی بہادری کا یہ واقعہ تاریخ دکن میں یادگار رہنے والا ہے کہ وہ گولہ کھانے اور ہاتھ ٹوٹ جانے کے باوجود پورے استقلال کے ساتھ گھوڑے پر بیٹھے ہوئے اپنی خرد گاہ پر آئے۔ جملۃ الملک اسد خاں وزیر اعظم انکی عیادت کو آیا تو دیکھا کہ جراح انکے شانے سے ہڈی کی کرچیاں چن چن کر نکال رہا ہے اور وہ اطمینان کے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں سے باتیں کر رہے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے قہوہ پیتے جاتے ہیں۔ یہی زخم آخرکار انکی جان کا لیوا ثابت ہوا، اور وہ قلعہ کے باہر مدفون ہوئے۔ یہ گویا کارکنان قضا و قدر نے اس سرزمین میں انکے خاندان کی حکومت کا پہلا سنگ بنیاد رکھا تھا۔

غازی الدین خاں فیروز جنگ خواجہ عابد کے پانچ بیٹے تھے جنمیں سے تین نے ناموری حاصل کی۔ غازی الدین خاں فیروز جنگ میر شہاب الدین، معز الدولہ صلابت جنگ میر حامد خاں، اور نصیر الدولہ تہور جنگ میر عبد الرحیم خاں۔ میر شہاب الدین ان میں سب سے بڑے تھے۔ اور سب سے زیادہ نامور بھی تھے۔ سنہ ۱۰۶۰ھ / ۱۶۴۹-۵۰ء میں بمقام سمرقند پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ ۲۰ سال کی عمر میں ہندوستان کا قصد کیا۔ سبحان قلی فرمانروائے ماوراء النہر نے سنا تو کہا کہ "تو یہ ہندوستان میروی؟

مرد عمدہ خواہی شد۔" یہ پیش گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ ۱۲ سنہ عالمگیری (۱۰۸۱ھ ۱۶۷۰ء) میں ہندوستان پہنچے اور عالمگیر بادشاہ کے ہاں منصب سیصدی ہفتاد سوار پر مقرر کئے گئے۔ ابتداءً ان کا اعزاز انکے والد کے اعزاز کا ضمیمہ رہا۔ مگر ایک مدت بعد خود انکے جوہر کھلے جنھوں نے بادشاہ کی نظر التفات انکی طرف بلاواسطہ مائل کر دی۔ سنہ ۲۳ جلوس (۱۰۹۲ھ ۱۶۸۱ء) میں بادشاہ رانائے اودیپور کی سرکوبی کے لئے گیا ہوا تھا، اور اس نے حسن علی خان بہادر کو رانا کے تعاقب میں کوہستان کے اندر بھیج رکھا تھا، کئی روز تک بادشاہ کو حسن علی خاں کی خبر نہ ملی۔ بادشاہ نے ڈاک چوکی کا سلسلہ از سر نو قائم کرنے کی متعدد کوششیں کیں، لیکن راجپوتوں کی غارتگر ٹکڑیوں نے کامیاب نہ ہونے دیا۔ آخر بادشاہ نے میر شہاب الدین کو طلب کیا اور حسن علی خاں کی خبر لانے کا حکم دیا۔ یہ اس اجنبی ملک سے ناواقف تھے، مگر بلا توقف امتثال امر پر آمادہ ہو گئے، اور پہاڑی راستوں سے بے خوف گذرتے ہوئے اندرون کوھستان میں گھستے چلے گئے، یہاں تک کہ دو دن کی مختصر مدت میں بادشاہ کو حسن علی خاں کی خبر لا دی۔ بادشاہ نے اسکے صلہ میں خطاب خانی عطا کیا اور آئندہ کے لئے انہیں بڑی مہموں کے لئے مخصوص کر لیا۔ اسکے بعد شہزادہ اکبر کی بغاوت کا واقعہ پیش آیا۔ اس موقع پر میر شہاب الدین کو بہت کچھ طمع دلائی گئی اور اکبر نے بڑے بڑے مناصب دینے کا وعدہ کیا۔ مگر انھوں نے بادشاہ کی وفاداری سے یک سر مو انحراف نہ کیا، اور اپنے بھائی مجاہد خاں کو بھی، جو باغی شاہزادے سے مل گئے تھے، اس سے الگ کر لیا۔ اکبر کی بغاوت کو فرو کرنے میں انھوں نے بادشاہ کی جو خدمات انجام دیں انکے صلہ میں بادشاہ نے انکو داروغگی عرض مکرر کا عہدہ اور شہاب الدین خاں

کا خطاب عطا کیا۔ سنہ ۲۶ (۱۰۹۵ھ / ۱۶۸۴ء) میں جُنیر کی طرف مرہٹوں کے خلاف انھوں نے متعدد معرکے سر کیے اور غازی الدین خان بہادر کا خطاب پایا۔ سنہ ۲۸ (۱۰۹۶ھ / ۱۶۸۵ء) میں انھوں نے مرہٹوں سے قلعہ راھیری فتح کیا اور فیروز جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ محاصرہ بیجاپور کے موقع پر جب شاہزادہ محمد اعظم کے لشکر میں قحط شدید رونما ہوا، اور محاصرہ پر لشکر کا قیام محال ہو گیا تو بادشاہ نے لشکر شاہی سے رسد لے جانے کے لئے فیروز جنگ ہی کو منتخب کیا۔ راستہ میں بیجاپوریوں کی ایک عظیم الشان فوج نے جو خافی خاں کے بیان کے مطابق انکی فوج سے دس گنی تھی انہیں روکنے کی کوشش کی مگر وہ انہیں شکست دیکر آگے بڑھ گئے، اور ایک بہت بڑے قافلے کو جو کرناٹک کی طرف سے بیجاپور کے محصورین کے لئے غلہ کی مقدار کثیر لا رہا تھا، لوٹتے ہوئے اعظم کے لشکر میں جا پہنچے۔ یہ امداد اس قدر قیمتی تھی کہ اسی نے شاہزادے کے لشکر کو کامل تباہی کے ساتھ پسپائی کی ذلت سے بچا لیا، اور اس کے صلہ میں بادشاہ نے فتح بیجاپور کا سہرا غازی الدین خاں فیروز جنگ کے سر باندھا۔ چنانچہ خود اپنے قلم سے یہ فقرہ تحریر کیا کہ

"بدستیاری فرزند بے دیو رنگ غازی الدین خاں بہادر
فیروز جنگ مفتوح شد"

خافی خاں لکھتا ہے کہ جب فیروز جنگ کے اس کارنامے کی اطلاع بادشاہ سے عرض کی گئی تو فرمایا:-

"چنانچہ حق سبحانہ تعالیٰ از تردد فیروز جنگ شرم اولاد تیموریہ نگاہ داشت، آبروی اولاد او تا دور قیامت خدا نگاہ دارد"

پھر جب قلعہ گولکنڈہ کا محاصرہ شروع ہوا تو بادشاہ نے "تعین مورچال

وگرد آوری مصالح وبستن دمدمہ وکندن نقب وتقسیم افواج" کے تمام امور غازی الدین خاں کے سپرد کئے۔ اس حیثیت سے گویا وہ اس جنگ میں افواج شاہی کے سالار اعظم تھے۔ فتح گولکنڈہ کے بعد انھوں نے ہفت ہزاری منصب پایا اور قلعہ ادھونی (امتیاز گڈھ) کو مسخر کیا۔ ۳۲ سنہ عالمگیری (۱۱۰۰ھ ۱۶۸۹ء) میں جبکہ وہ سنبھاجی کی مہم پر بھیجے گئے تھے انکی آنکھوں پر مادۂ دماغی گرا اور بینائی جاتی رہی، مگر اسپر بھی انھوں نے فوجوں کی قیادت و رہنمائی نہ چھوڑی۔ نابینائی کے باوجود انکی اعلیٰ انتظامی قابلیت کا یہ حال تھا کہ جب ۱۱۱۰ھ میں وہ دیوگڈھ (اسلام پور) کی مہم پر جارہے تھے، تو بادشاہ نے انکی فوج کا معائنہ کیا، اور انکی فوجوں کے نظم و ضبط، سازوسامان اور آراستگی و تجمل کو دیکھ کر اظہار حیرت کیا اور شاہزادۂ بیدار بخت (ابن شاہزادۂ اعظم) کو عار دلانے کے لئے کہا کہ فیروز جنگ سے بدرجہا زیادہ جاگیر رکھنے کے باوجود تمھاری فوج کا سازوسامان انکی فوج کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہے۔ ۱۱۱۵ھ میں فیروز جنگ نے نما سندھیا کو مغلوب کیا، اور اسکے صلہ میں انکو سپہ سالار کا خطاب دیا گیا۔ اخیر زمانہ میں عالمگیر نے انکو فوجی خدمات سے سبکدوش کرکے برار کی صوبہ داری پر مقرر کردیا تھا جس پر وہ بادشاہ کی وفات تک برقرار رہے۔ عالمگیر کے انتقال کے بعد جب شاہزادہ اعظم سلطنت کا مدعی بنکر شاہ عالم بادشاہ سے لڑنے کے لئے دکن سے چلا تو لوگوں نے اسے مشورہ دیا کہ خان فیروز جنگ کو ساتھ لینا ضروری ہے کیونکہ تمام تورانی سردار انکی سرداری کو مانتے ہیں۔ مگر اعظم نے غرور سے کہا کہ "ایک اندھے کے لئے میں اپنا سیدھا راستہ کیوں چھوڑ دوں؟" اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے تورانی امرا میں سے

کسی نے اعظم کا ساتھ نہ دیا۔ اس غلطی کو لوگ ان غلطیوں میں شمار کرتے ہیں۔ جو اعظم کی ناکامی کا سبب ہوئیں[1]۔ خانہ جنگی کے بعد شاہ عالم بہادر شاہ تخت نشین ہوا جو تورانی امرا کا مخالف تھا۔ اور ان کا زور توڑنا چاہتا تھا۔ دکن میں تورانی گروہ اور خصوصاً فیروز جنگ کے خاندان نے جو خدمات انجام دی تھیں انکی وجہ سے اس جماعت کو دکن کی افواج اور سرکاری عہدہ داروں میں خاص اثر حاصل تھا، اور اہل دکن پر انکی ہیبت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ شاہ عالم نے اس اثر کو باطل کرنے کے لیے اسی جماعت کے تقریباً تمام اکابر کو دکن سے ہٹا دیا اور اسی سلسلہ میں فیروز جنگ کو بھی برار کی صوبہ داری سے الگ کرکے احمد آباد گجرات کی صوبہ داری پر بھیج دیا جہاں سنہ ۲ بہادر شاہی میں ۱۷ر شوال ۱۱۲۲ھ (۸ر دسمبر ۱۷۱۰ء) کو انھوں نے انتقال کیا۔ ان کی نعش دہلی بھیجی گئی اور اس مقام پر دفن کی گئی جہاں اب عربک کالج قائم ہے۔ عالمگیر بادشاہ ان کے ساتھ بھی محبت کا برتاؤ کرتا تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ جب انکی آنکھوں کو صدمہ پہنچا تو بادشاہ نے انکو لکھا:۔

"خان فیروز جنگ یک رنگ! من می خواستم کہ برای عیادت آں

---

[1] ابوالفیض لکھتا ہے کہ فیروز جنگ نے تمام امراء و سرداران تورانی کو اعظم سے الگ ہو جانے کی تاکید کی تھی۔

کہ باشید جائیکہ مستند شاد بتقدیر حق داشتہ اعتقاد
کہ از بعد جنگ آنکہ بے اشتباہ زعونِ الٰہی شود بادشاہ
بہ بندیم ما و شما در جہاں بہ خدمتش از [illegible] میاں

دولت خواہ خود بیایم، اما بچہ رو و کدام نظر مشاہدہ نمایم۔ لہذا سیادت خاں را بنیابتہ فرستادیم، تا بچشم ببیند، و اظہار مافی الضمیر کند۔ و از میوہ ہائے تورس، آنچہ بہم رسید انگور است۔ اما اطبای یونان بری عمدہ مخلصان مزاج داں، مضری گویند، لہذا ما ہم برخود گوارا نکردیم۔ انشاءاللہ تعالیٰ بعد صحت کامل و شفای عاجل، یکجا می خوریم"

نظام الملک اول کے ابتدائی حالات۔ غازی الدین خاں فیروز جنگ کی شادی علامی سعد اللہ خاں وزیر اعظم شاہجہان کی بیٹی سعید النسا بیگم سے ہوئی تھی جنکے بطن سے ۱۴ ربیع الآخر ۱۰۸۲ھ (۱۱ اگست ۱۶۷۱ء) کو وہ نامور لڑکا پیدا ہوا[1] جس نے بعد میں نظام الملک آصفجاہ کے نام سے شہرت حاصل کی۔ اس زمانہ میں قاعدہ تھا کہ بڑے درجہ کے امرا میں سے جب کسی امیر کے ہاں لڑکا پیدا ہوتا تو وہ بادشاہ کے سامنے نذر پیش کرتا تھا اور خود بادشاہ لڑکے کا نام تجویز کرتا تھا۔ چنانچہ اسی رسم کے مطابق عالمگیر نے فیروز جنگ کے بیٹے کا نام میر قمر الدین رکھا۔ ۶ سال کی عمر میں انکو منصب چار صدی پنجاہ سوار عطا ہوا، اور یہ ایسا اعزاز تھا جو نہایت مقرب۔ اور منظور نظر خاندانوں کے لڑکوں کو عطا ہوا کرتا تھا۔ سلطنت مغلیہ میں عموماً مناصب صرف ان لوگوں کو دیے جاتے تھے جو ذاتی قابلیت سے کارہائے نمایاں انجام دیکر اپنے آپکو شاہی اعزاز کے قابل ثابت کردیتے تھے۔ لیکن جو بڑے گھرانے اپنی خدمات، جاں نثاریوں، اور وفاداریوں کے باعث

---

[1] صاحب مآثر نظامی نے سنہ پیدائش ۱۰۸۰ھ لکھا ہے مگر مورخین کا اجتماع اسکے خلاف ہے۔

سلطنت کے رکن بن جاتے تھے انکے لڑکوں کو بچپن ہی سے مناصب دیگر شاہی ملازمت میں داخل کر لیا جاتا تھا، اور بادشاہ بطور خاص انکی تربیت و تعلیم سے دلچسپی لیتا تھا، تاکہ وہ قیادت و امارت، اور حکمرانی و فرمانروائی کے بڑے کام انجام دینے کے لئے ابتدا ہی سے طیار ہوتے رہیں۔ میر قمر الدین خاں کا خاندان بھی انہی خاندانوں میں سے ایک تھا، اسلئے ہوش سنبھالتے ہی وہ شاہی ملازمت میں داخل کر لئے گئے۔ مگر ان کی فطری صلاحیت تھی جس نے بادشاہ کی نظر عنایت کو خاص طور پر انکی طرف کھینچ لیا اور وہ خصوصیت کے ساتھ انکی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ انکے اطوار شائستہ کو دیکھ کر کہا کرتا تھا کہ خان فیروز جنگ کے لڑکے کی پیشانی پر آثار رشد و سعادت پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح اسد خاں وزیر اعظم نے بھی خان فیروز جنگ سے بارہا کہا کہ میر قمر الدین بڑا صاحب نصیب لڑکا معلوم ہوتا ہے۔ یہ وہ پیش گوئیاں تھیں جنھوں نے انکے آغاز شباب ہی میں اپنی صداقت ظاہر کرنی شروع کر دی۔ ۲۰ سال کی عمر (۱۱۰۲ھ/۱۶۹۰ء) میں انھوں نے عالمگیر کے دربار سے "چین[1] قلیچ خاں بہادر" کا خطاب پایا۔ ۱۱۰۹ھ/۱۶۹۷ء میں انکی فوجی خدمات کا آغاز ہوا اور وہ مرہٹوں کے خلاف مہمات میں بھیجے گئے۔ ۱۱۱۲ھ/۱۷ء میں

---

[1] ترکی زبان میں "چین" کے معنی چھوٹے، اور "قلیچ" کے معنی تلوار کے ہیں۔ عالمگیر نے دادا کو "قلیچ خاں" یعنی "شمشیر خاں" کا خطاب دیا تھا۔ اس لئے پوتے کو "چین قلیچ خاں" یعنی "چھوٹے شمشیر خاں" کا خطاب دیا۔

کرناٹک بیجاپور[۱] کی فوجداری پر، اور ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۲ء میں صوبہ داری بیجاپور پر، اور پھر اسی سال تل کوکن عادلخانی[۲] کی حکومت پر مامور ہوے۔ ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء میں وہ رستم دل خاں کے بجائے کرناٹک حیدرآباد[۳] کی فوجداری پر بھیجے گئے، اور اسی سال نصرت آباد اور سنگیر اور مدگل کی حکومت پر منتقل کیے گئے۔ ۱۱۱۶ھ/۱۷۰۴ء سے ۱۱۱۷ھ/۱۷۰۵ء تک قلعہ واکنکھیڑہ کے زبردست محاصرہ میں انھوں نے بڑی جانفشانی دکھائی جس کے بعد ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء میں بادشاہ نے انکو منصب پنج ہزاری ذات و سوار عطا کیا اور صوبہ داری

---

[۱] صوبہ بیجاپور کے دو حصے تھے۔ پہلا حصہ وہ تھا جو سقوط بیجانگر سے پہلے سلطنت عادل شاہیہ کے زیر حکومت تھا۔ اور دوسرا حصہ وہ تھا جو سقوط بیجانگر کے بعد عادل شاہیوں نے دریائے کرشنا کے جنوب میں فتح کیا تھا۔ یہ دوسرا صوبہ کرناٹک بیجاپور کہلاتا تھا اور اس کا صدر مقام سرا تھا۔

[۲] کوکن مہاراشٹر کا وہ حصہ ہے جو مغربی گھاٹوں اور سمندر کے درمیان گوآ سے لیکر دریائے تاپتی تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بھی دو حصے تھے۔ ایک کوکن بالا گھاٹ جو کوکن نظام شاہی کہلاتا تھا، اور دوسرا کوکن پائیں گھاٹ جو تل کوکن عادلخانی کے نام سے موسوم تھا۔ بعد میں جب سلطنت نظام شاہیہ کا خاتمہ ہوا تو شاہجہاں نے کوکن نظام شاہی بھی عادل شاہ کو دیدیا تھا۔ لیکن مرہٹوں کی شورش میں یہ علاقہ عملاً شاہی اقتدار سے نکل گیا۔

[۳] کرناٹک حیدرآباد سے مراد وہ علاقہ ہے جس کا کچھ حصہ قطب شاہیوں نے سقوط بیجانگر کے بعد ہی، اور بیشتر حصہ میر جملہ میر محمد سعید خاں نے حیدرآباد کی ملازمت کے زمانہ میں فتح کیا تھا۔

بیجاپور پر دوبارہ مامور کیا۔ یہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں انکی ترقیات اور انکے کارناموں کا ایک مختصر بیان ہے، اسکے بعد انھوں نے کشور ہندوستان کی سیاست میں جو عظیم الشان حصہ لیا وہ ہماری کتاب کے دوسرے باب سے متعلق ہے۔

عالمگیر کے ساتھ چین قلیچ خاں بہادر کو جو خصوصیت حاصل تھی اس کا اندازہ صرف ان عہدوں اور منصبوں سے نہیں لگایا جا سکتا جو بادشاہ نے انکو عطا کئے تھے۔ بلکہ اسکے لئے شخصی تعلقات پر بھی ایک نظر ڈالنی ضروری ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ کو انکی ذات کے ساتھ غیر معمولی لگاؤ تھا۔ مثال کے طور پر یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ (۱۱۰۸ھ ۱۶۹۶ء میں) وہ اپنے والد سے کشیدہ خاطر ہوکر بادشاہ کے پاس چلے گئے۔ بادشاہ نے تادیباً انکو حاضری کی اجازت نہ دی، اور حکم دیا کہ باپ سے معافی مانگ کر آؤ، مگر اسکے ساتھ ہی اپنے دست خاص سے غازی الدین خاں فیروز جنگ کے نام یہ سفارش نامہ لکھ کر دیا کہ

"فدوی زادۂ اخلاص پرور چین قلیچ خاں بہادر می گوید
وان لم تغفر لنا و ترحمنا لنکونن من الخاسرین"

ایک دوسری روایت جو مآثر نظامی اور فتوحات آصفی کے مصنفوں نے بیان کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیر نے اپنے آخری زمانہ میں چاہا تھا کہ شاہزادہ کام بخش کی بیٹی سے چین قلیچ خاں بہادر کو منسوب کردیں اور اس غرض کے لئے اپنے معتمد خواجہ اختیار خاں کے ذریعہ انکو پیغام بھی دیا تھا۔ مگر انھوں نے بظاہر ادباً اور بباطن عاقبت بینی

کی بنا پر اظہار عذر کیا۔ اس روایت کو دو ایسے مصنفوں نے بیان کیا ہے جو نظام الملک کے ہمعصر اور انکے خاص ملازموں میں سے تھے۔ اسلئے اس کی صحت میں کسیطرح شک نہیں کیا جا سکتا۔ یہ واقعہ دو اہم حقیقتوں پر دلالت کرتا ہے۔ ایک یہ کہ عالمگیر کی نگاہ میں چین قلیچ خاں کے خاندان اور خود ان کی ذات کی عزت اسقدر بڑھ چکی تھی کہ اس نے انہیں شاہی خاندان سے مصاہرت کا شرف بخشنے کے قابل سمجھا۔ دوسرے یہ کہ وہ انکی جنگی اور سیاسی قابلیت پر اتنا اعتماد رکھتا تھا کہ اسے اپنے سب سے زیادہ کم زور بیٹے کو قوت پہنچانے کی اس سے بہتر کوئی تدبیر نظر نہ آئی کہ چین قلیچ خاں سے اسکی بیٹی بیاہ دے۔ عالمگیر خوب جانتا تھا کہ کام بخش ایک متلون اور خفیف العقل شخص ہے۔ جسے تہور نے ان صفات کے ساتھ ملا کر اور زیادہ کمزور کر دیا ہے۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ اسد خاں اور اس کا خاندان کام بخش کا مخالف ہے، جسکے باعث ایرانی امرا کی تائید اسکو حاصل نہیں ہو سکتی اسلئے اسکی رائے میں کام بخش کو محفوظ رکھنے کی صرف یہی ایک صورت ہو سکتی تھی کہ اس رشتۂ مصاہرت کے ذریعہ سے نہ صرف چین قلیچ خاں جیسے بہادر سپہ سالار اور مدبر کو اس کا مددگار بنا دے، بلکہ اسکی بدولت فیروز جنگ اور محمد امین خاں، اور تمام تورانی امرا کو بھی اسکے حامیوں میں شامل کر دے۔ یہ ایسی تدبیر تھی کہ اگر بادشاہ اس میں کامیاب ہو جاتا تو بہت ممکن تھا کہ اس کی وفات کے بعد خانہ جنگی میں معظم کے بجائے کام بخش کو کامیابی حاصل ہوتی۔ یا کم از کم دکن میں اسکی جداگانہ سلطنت قائم ہو جاتی۔ لیکن چین قلیچ خاں، جو سیاست میں عالمگیر ہی کے شاگرد

تھے، اس نکتہ کو سمجھ گئے، اور انھوں نے ایسی عزت کو قبول کرنے سے معذرت چاہی جس کے لئے انہیں اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو اتنے بڑے مہلکوں میں ڈالنا پڑتا۔ جس وقت انھوں نے اس رشتہ سے انکار کیا تھا، شاید انکے وہم میں بھی یہ بات نہ تھی کہ قدرت نے دکن کی فرمانروائی کا جامہ کام بخش کے لئے نہیں بلکہ خود انہی کے لئے سی رکھا تھا۔

نظام الملک کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ اپنی فطری افتاد اور کچھ عالمگیر کی تربیت کے اثر سے انکے اندر بڑی حد تک وہی خصوصیات موجود تھیں جو خود انکے مربی کی مایہ الامتیاز سمجھی جاتی ہیں وہی مذہبیت، وہی وقار و تمکنت، وہی آداب و مراتب کا پاس ولحاظ، وہی طرز تدبیر و انداز سیاست، وہی طریق ضبط امور، وہی کفایت شعاری اور وہی سادگی و زہد پسندی انکے ہاں بھی نظر آتی ہے جو عالمگیر کی سیرت میں نمایاں ہے۔ اور اس لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ قریب قریب ہر معاملہ میں عالمگیر کا چربہ اور مثنّیٰ تھے۔

یہ چند امور ہیں جنکے اجتماع سے نظام الملک کو وہ اثر حاصل ہوگیا تھا جس نے عالمگیر کی وفات کے بعد اور انقلاب و انتشار میں ان کو سلطنت کا سب سے زیادہ طاقتور آدمی بنا دیا تھا۔ انکے دادا، ان کے والد اور خود انھوں نے نصف صدی تک سلطنت کی جو خدمات انجام دیں، مسلسل تین پشتوں تک ان کے خاندان نے سالاری اور حکمرانی کی جس اہلیت کا ثبوت دیا، انکے دادا نے شاہی خدمت میں اپنی جان اور والد نے اپنی آنکھیں جسطرح قربان کیں، اور اسکے باوجود جسطرح وہ بے دریغ سلطنت کی خاطر جانیں لڑاتے رہے، پھر بادشاہ کی نظر عنایت نے

ان کو جن مناصب و خطابات، اور درجات تقرب سے سرفراز کیا اس کا یہ نتیجہ تھا کہ ان کا خاندان سلطنت کے سب سے زیادہ طاقتور سیاسی گروہ یعنی امرائے تورانی میں ایک چوٹی کا خاندان سمجھا جاتا تھا۔ اسد خان وزیر اعظم اور ذوالفقار خاں سپہ سالار کے بعد اگر امرائے شاہی میں کسی پر نظر پڑتی تھی تو یہی باپ بیٹے فیروز جنگ اور چین قلیچ خاں تھے۔ مگر جب فیروز جنگ کا انتقال ہو گیا، اور اسکے بعد اسد خاں اور ذوالفقار خان بھی رخصت ہوئے، تو پھر تورانی امرا کی ریاست تنہا نظام الملک کا حصہ رہ گئی، اور یہ وہ چیز تھی جس کی بدولت انہیں اپنے وقت کی ملکی سیاست میں فیصلہ کن اثر حاصل ہو گیا۔ تاہم یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ نظام الملک ترقی کے ان اعلیٰ مدارج تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے تھے اگر ان کا مدار کار صرف خاندانی اقتدار ہی ہوتا اور وہ اس مضبوط سیرت، اس جاذب شخصیت، اس ذہنی و دماغی قابلیت، اور اس منجھی ہوئی تہذیب و حضریت کے مالک نہ ہوتے، جس نے دور انتشار کے عیش پسند اور بدسیرت بادشاہوں، خود غرض اور ناقابل وزیروں، رکیک فطرت اور خفیف الحرکات ندیموں کے زمانہ میں، اورنگ زیب عالمگیر کا نمونہ پیش کر کے انھیں تمام ہندوستان کی نگاہوں کا مرجع اور امیدوں کا مرکز بنا دیا تھا۔

ماخذ:۔

مآثر الامرا، تالیف صمصام الدولہ شاہ نواز خاں، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۸۸ء

مآثر نظامی، (قلمی)، تالیف لالہ منسارام (کتبخانہ دفتر دیوانی حیدر آباد دکن) میں موجود ہے۔

منتخب اللباب، تالیف محمد ہاشم معروف بخافی خاں نظام الملکی مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۸۶۹ء

خزانۂ عامرہ، تالیف میر غلام علی آزاد بلگرامی۔ طبع کانپور سنہ ۱۸۷۱ء

سرو آزاد، تالیف میر غلام علی آزاد بلگرامی۔ مطبوعہ حیدرآباد۔

سوانح دکن (قلمی) تالیف منعم خاں اورنگ آبادی۔ نواب میر نظام علی خاں کے عہد میں لکھی گئی (کتبخانہ آصفیہ میں موجود ہے)۔

خزانہ رسول خانی (قلمی) تالیف محمد فیض اللہ منشی۔ سنہ ۱۲۵۱ھ بعہد نواب ناصر الدولہ (کتبخانہ آصفیہ میں ہے)

تزک آصفیہ۔ تالیف تجلی علی شاہ مطبوعہ حیدرآباد سنہ ۱۳۱۰ء۔

فتوحات آصفی (قلمی) تالیف ابو الفیض (دفتر دیوانی)

سیر الھند و گل گشت دکن (قلمی) تالیف قادر خاں بیدری (کتبخانہ آصفیہ)

حدیقۃ العالم، تالیف میر عالم وزیر دولت آصفیہ مطبوعہ حیدرآباد سنہ ۱۲۱

گلزار آصفیہ، تالیف غلام حسین خاں۔ مطبوعہ حیدرآباد سنہ ۱۲۶۱ھ

Later Mughels, by William Irvine Calcutta 1922

A History of Mahrattas, by Grant Duff. Calcutta. 1918

The Nizam His History and Relation with the British Government by Henry George Briggs London 1861

نظام الملک کے اسلاف اور انکے بنی اعمام[1]

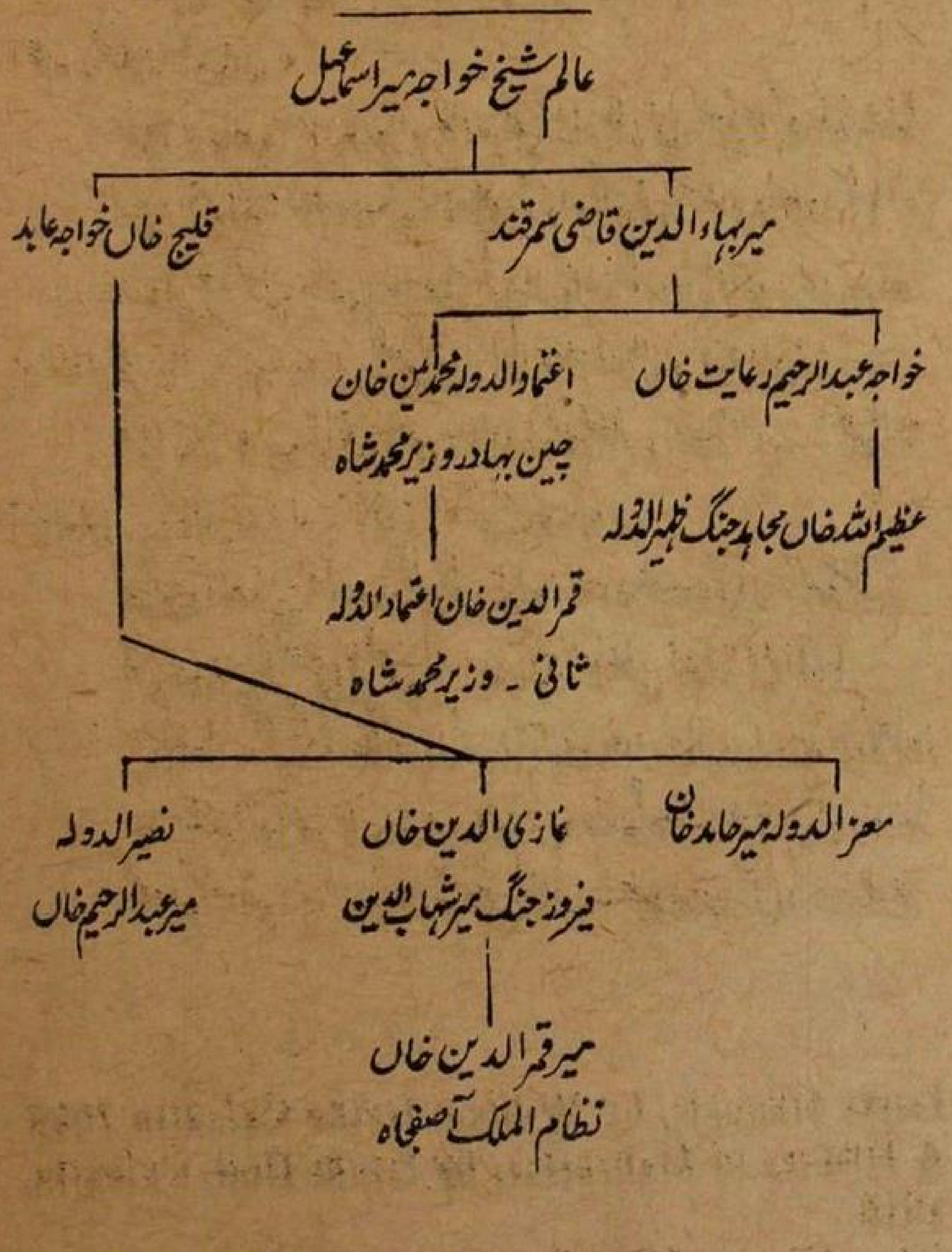
عالم شیخ خواجہ میر اسمٰعیل
میر بہاء الدین قاضی سمرقند
قلیچ خاں خواجہ عابد
خواجہ عبدالرحیم رعایت خاں
اعتماد الدولہ محمد امین خان
چین بہادر وزیر محمد شاہ
عظیم اللہ خاں مجاہد جنگ ظہیر الدولہ
قمر الدین خان اعتماد الدولہ
ثانی ۔ وزیر محمد شاہ
معز الدولہ میر حامد خاں
غازی الدین خاں
فیروز جنگ میر شہاب الدین
نصیر الدولہ
میر عبدالرحیم خاں
میر قمر الدین خاں
نظام الملک آصفجاہ

---

[1] اس شجرہ میں صرف ان اشخاص کے نام لکھے گئے ہیں جنھوں نے تاریخ میں کوئی نمایاں جگہ حاصل کی ہے۔

باب دوم

عالمگیر کی وفات کے بعد

اب ہم ان حالات کی طرف توجہ کرتے ہیں جن کی بدولت صوبہ دکن نظام الملک کے ماتحت مرکزی سلطنت سے الگ ہو کر ایک جداگانہ ریاست بن گیا۔ ان حالات کی تشریح کے لئے اُن واقعات پر نظر ڈالنا ضروری ہے جو عالمگیر بادشاہ کی وفات کے بعد مرکزی سلطنت میں پیش آئے۔ عام طور پر مورخین اس زمانہ کے واقعات کو دولت آصفیہ کی تاریخ سے غیر متعلق سمجھ کر بہت اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ کوئی شخص دولت آصفیہ کے قیام اور سلطنت مغلیہ سے اس کی علیحدگی کے وجوہ و اسباب کو سمجھ نہیں سکتا جبتک کہ وہ عالمگیر کی وفات سے محمد شاہ کے عہد تک کے واقعات پر ایک گہری نظر نہ ڈال لے اور سلطنت کے تدریجی تنزل، سیاسیات ہند کے اتار چڑھاؤ مختلف شخصیتوں اور جماعتوں کے عروج و نزول، اور اس پورے دور میں نظام الملک کی زندگی کا نقشہ پوری جزئیات و تفصیلات کے ساتھ نہ دیکھ لے علاوہ بریں اس عہد کی تاریخ کا تفصیلی مطالعہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ دولت آصفیہ کے قیام کے بعد ایک صدی تک جن مسائل کو دکن کے سیاسی حالات میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے انکی ابتدا اسی عہد سے ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ آغاز کو سمجھے بغیر انجام کو

سمجھنا مشکل ہے۔

۱۔ عالمگیر کے بیٹوں کی خانہ جنگی

عالمگیر کی زندگی ہی میں اسکے بیٹوں کے درمیان مناقشت شروع ہوگئی تھی جو پیش گوئی کر رہی تھی کہ اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس نظام شمسی کے تمام ارکان میں باہم ایک زبردست تصادم ہوگا۔ جب تک بادشاہ زندہ رہا، اسکی ہیبت سے انکی آپس کی عداوتیں دبی رہیں، مگر جب اس کا وقت آخر آیا تو انکے درمیان سازشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس نے ان آثار کو دیکھکر اپنے آخر زمانہ میں انہیں اور انکے لڑکوں کو اپنے سے دور بھیج کر مختلف اقطاع سلطنت میں متفرق کر دیا تھا تاکہ اسکی وفات کے بعد کم از کم کچھ عرصہ تک خانہ جنگی برپا نہ ہو اور انہیں باہم لڑ جانے سے پہلے اپنے اور سلطنت کے مفاد کو سمجھنے کا کافی موقع مل جائے۔ چنانچہ اپنے بڑے بیٹے معظم کو کابل اور اسکے ایک بیٹے معز الدین کو ملتان، اور دوسرے محمد عظیم کو بنگال کی صوبہ داریوں پر مقرر کیا۔ منجھلے بیٹے اعظم کو مالوہ اور گجرات کی صوبہ داری دی اور اسکے لڑکے بیدار بخت کو گجرات پر نائب صوبہ دار مقرر کیا۔ اسکے ساتھ ہی اس نے ایک وصیت نامہ بھی لکھ دیا جسمیں اپنی وسیع مملکت کو تینوں بیٹوں میں اسطرح تقسیم کیا تھا کہ دونوں بڑے بیٹے معظم اور اعظم دھلی اور آگرہ میں سے ایک ایک شہر لے لیں دھلی جس کے حصہ میں آئے وہ صوبہ شاہجہاں آباد، پنجاب، کابل۔ ملتان۔ ٹھٹھہ، بنگال، اڑیسہ، بہار، الہ آباد اور اودھ کے صوبے لے لے۔ اور جو آگرہ کو منتخب کرے اسے اکبر آباد، مالوہ، گجرات

اجمیر، خاندیس، برار، اورنگ آباد اور بیدر کے صوبے ملیں۔ باقی رہا کام بخش تو وہ حیدرآباد اور بیجاپور کے صوبے دونوں کرناٹکوں سمیت اپنے پاس رکھے۔ اسی تقسیم کے لحاظ سے بادشاہ نے معظم اور اسکے بیٹوں کو شمالی ہند کے صوبوں پر مامور کیا تھا۔ اعظم اور اسکے بیٹے کو وسط ہند میں رکھا تھا۔ اور کام بخش کو جنوبی ہند کی طرف بھیج دیا تھا[1] لیکن جو ہونا تھا وہ ان تدابیر کے باوجود ہوا۔ ۲۸، ذی القعدہ سنہ ۱۱۱۸ھ کو جب احمد نگر میں بادشاہ کا انتقال ہوا اسوقت اعظم مالوہ کے راستہ میں شاہی کیمپ سے صرف بیس کوس کے فاصلہ پر تھا، اور کام بخش بیجاپور کی جانب چالیس پچاس کوس سے زیادہ دور نہ گیا تھا۔ اس واقعہ کی اطلاع پاتے ہی اعظم نے احمد نگر واپس ہوکر خزانہ و اسباب و توپخانہ پر قبضہ کیا، امرا سے بیعت لی اور عید الاضحیٰ کے روز اپنی بادشاہی کا اعلان کردیا۔

کام بخش سیدھا بیجاپور پہنچا اور وہاں شاہ "دیں پناہ" بن بیٹھا۔

ادھر ذی الحجہ کے آخر میں معظم اور اسکے بیٹوں کو بھی اسکی اطلاع پہنچ گئی۔ محمد عظیم (ابن معظم) عالمگیر کی زندگی ہی میں اسکی طلب پر ممالک مشرقی سے کروڑوں روپیہ لیکر روانہ ہوچکا تھا، وہ دادا کی خبر وفات سنکر آگرہ پر ٹھہر گیا۔ معز الدین اور اعز الدین ٹھٹھہ اور ملتان سے فوجیں لے کر لاہور پہنچ گئے جہاں معظم کا وفادار ملازم منعم خاں فوج اور سامان حرب فراہم کرکے طیار بیٹھا تھا۔ معظم جو اسوقت پشاور سے ۱۲ میل جانب

---

[1] بادشاہ کی وفات کے وقت شاہزادہ معظم کی عمر ۶۵ سال کی، اعظم کی عمر ۵۵ سال کی، اور کام بخش کی عمر ۴۱ سال کی تھی۔

مغرب جمرود کے مقام پر خیمہ زن تھا۔ بسرعت ہندوستان کی طرف روانہ ہوا اور لاہور پہنچ کر اسنے بھی محرم ۱۱۱۹ھ ۱۷۰۷ء میں اپنا سکہ و خطبہ جاری کر دیا۔ اسطرح ایک اقلیم میں بیک وقت تین بادشاہ جمع ہو گئے۔ اب فتنہ کو سر اٹھانے سے کون روک سکتا تھا۔

اعظم کی ناکامی اور اسکے اسباب۔ ان بادشاہوں میں اعظم کی قوت سب سے زیادہ مضبوط تھی۔ وہ خود بہادر تھا۔ عالمگیر کے آزمودہ کار امرا و وزرا اسکے ساتھ تھے۔ دکن کی ریاستوں اور مرہٹوں کی تسخیر کے لیئے جو زبردست ساز و سامان مہیا کیا گیا تھا وہ سب اسکے حصہ میں آیا تھا، لیکن اسکے سوء تدبر سے یہ قوت ضعف سے بدل گئی جس کا ادراک وہ آخر وقت تک نہ کر سکا۔ اس کے بیٹے بیدار بخت نے جو احمد آباد میں اسکا نائب تھا عالمگیر کی خبر وفات سنتے ہی عرضی بھیجی کہ مجھے فوراً آگرہ جانیکی اجازت دی جاے۔ آگرہ کا صوبہ دار مختار خاں اُس کا خسر تھا۔ آگرہ کا قلعہ دار باقی خاں اور کوتوال علی شیر خاں دونوں اس کے حامی تھے۔ ان لوگوں کی مدد سے وہ بآسانی آگرہ پر قبضہ کر سکتا تھا۔ مگر اعظم خود اپنے بیٹے سے حسد رکھتا تھا۔ اسنے بیدار بخت کو حکم دیا کہ سرحد مالوہ پر پہنچ کر انتظار کرے۔ چنانچہ بیدار بخت مالوہ میں وقت ضائع کرتا رہا اور دوسری طرف محمد عظیم سبقت کر کے آگرہ پہنچ گیا۔ صوبہ دار اور قلعہ دار ناکام مزاحمت کرنے کے بعد اسکے مطیع ہو گئے اور وہاں کے خزانہ کا کروروں روپیہ اس کے ہاتھ آگیا جس سے معظم کی مالی قوت ـــ جو ظاہر ہے کہ تمام قوتوں سے فائق تر ہے ـــ بہت زیادہ مضبوط ہو گئی۔ دوسری چیز جس نے اعظم کا زور توڑ دیا اس کا غرور و تکبر، اسکا بخل، اسکی سفلہ نوازی، اور امراے

شاہی کے ساتھ اس کا بُرا برتاؤ تھا۔ عالمگیر کے بنائے ہوئے لوگ اسکی اس روش سے برداشتہ خاطر ہونے لگے اسد خاں وزیر اعظم اور ذوالفقار خاں میر بخشی دونوں کی گرمجوشی سرد مہری سے بدل گئی۔ چین قلیچ خاں جنکو اسنے صوبہ داری برہانپور کا عہدہ شش ہزاری منصب اورخان دوراں کا خطاب دیا تھا، اس سے جدا ہوکر اورنگ آباد چلے گئے۔ محمد امین خان چین[١] بہادر بھی جو کام بخش کا ساتھ چھوڑکر اسکے پاس آیا تھا، اس سے الگ ہوگیا، اور ان کے علاوہ جو امرا اسکے ساتھ رہے وہ بھی اس سے خوش نہ رہے۔ مرزا محمد صاحب تاریخ محمدی کا بیان ہے کہ امرائے تورانی خصوصاً اور دوسرے اہل سنت امرا عموماً اعظم سے اس بنا پر بھی ناخوش اور اسکی تخت نشینی پر ناراض تھے کہ وہ اعتقاداً شیعہ تھا۔ صاحب فتوحات آصفی نے بھی اسکی تصریح کی ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے

دگر در رہِ مذہب آں بادشاہ بود رافضی نیز بے اشتباہ
زدینِ بزرگاں وآبای خود بروں رفتہ آں شاہ دالاخرد

لیکن اعظم کی سب سے بڑی کمزوری جس نے اُس کو اس کار خطیر کے لیے

---

[١] ۔ یہ خواجہ عابد کا سگا بھتیجا، غازی الدین خاں فیراز جنگ کا چچازاد بھائی اور اس رشتہ سے چین قلیچ کا چچا ہوتا تھا۔ تورانی امراء میں اسکی شخصیت چین قلیچ خاں کی ہم پلہ تھی اور چین قلیچ خاں اس سے دس برس چھوٹے تھے۔ ١٠٩٥ھ (١٦٨٣-٨٤ء) میں بخارا سے ہندوستان آیا اور عالمگیر کی ملازمت میں داخل ہوا۔ اسوقت سے انکو برابر ترقی ملتی رہی یہاں تک کہ بادشاہ کے آخر زمانہ میں صدارت کل کا عہدہ اور چین بہادر کا خطاب پایا۔

بالکل نااہل بنادیا تھا، یہ تھی کہ اس میں حزم و احتیاط اور دور بینی نام کو نہ تھی، اور وہ صرف تلوار چلانا جانتا تھا، خواہ اس کا موقع و محل ہو یا نہ ہو۔ اس کی اسی کمزوری سے عالمگیر کو سب سے زیادہ خطرہ تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ یہی چیز ایک روز اسے ہلاک کردیگی چنانچہ احکام عالمگیری میں ایک جگہ لکھا ہے :۔

"عجب ازاں فرزند کہ صحبت، ہیچ اثر نہ کردہ۔ از احتیاط و دور بینی ہزار مرحلہ دور افتادہ۔ "الحزم سوء الظن" بخاطر نیاوردہ، و از آئیہ" **ولا تلقوا بایدیکم الی التہلکہ** "بہرہ نیافتہ"

اسے اپنی شجاعت۔ بہادری پر ناز و غرور، اور معظم کی بزدلی و کمزوری پر حد سے زیادہ بھروسہ تھا۔ وہ معظم کو "بنیا" کہا کرتا تھا اور اسقدر ہیچ سمجھتا تھا کہ جب کوئی اسے احتیاطی تدابیر اختیار کرنیکا مشورہ دیتا تو وہ سختی کے ساتھ کہتا کہ "ان چیزوں کی ضرورت کسی مرد کے مقابلہ کے لئے ہوتی ہے۔ معظم جیسے بزدل کے مقابلہ میں اسکی کیا حاجت ہے"۔ اسی بھروسے پر اس نے اپنے ساتھ توپخانہ نہیں لیا، اور نہ خبر رسانی کا کوئی انتظام کیا حتیٰ کہ وہ معظم کے آگرہ پہنچنے تک اسکی نقل و حرکت سے بالکل بے خبر رہا۔ ان سب باتوں نے مل جل کر جو نتیجہ ظاہر کیا وہ یہ تھا کہ جب وہ معظم کے مقابلے کے لئے روانہ ہوا تو اسکے ساتھ ۵۰ ہزار سے زیادہ فوج نہ تھی۔ اکثر امرا اس سے ناخوش تھے۔ اور روپے کی قلت کے سبب سپاہیوں کی تنخواہیں ادا نہ کرسکتا تھا جسکی بدولت اسکی فوج کے لوگ ٹوٹ ٹوٹ کر فریق مخالف کی صفوں کا رخ کر رہے تھے۔

اس وقت حصول تخت کی اس جد و جہد کا فیصلہ در اصل اس بات پر تھا کہ دونوں مدعیوں میں سے کون سلطنت کے قلب یعنی دہلی اور آگرہ پر پہلے قبضہ کرتا ہے۔ کیونکہ دولت اور قوت کا مرکز یہی دونوں مقام تھے۔ اعظم اس مسابقت میں ناکام ہوا اور معظم بازی لے گیا جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے اب معظم کے پاس ممالک مشرقی کا خزانہ تھا جسکی مالیت ۱۸ سے ۲۰ کروڑ روپیہ تک بتائی جاتی ہے۔ اور کابل، لاہور، بنگال اور دہلی کی فوج ملکر ۸۰ ہزار سوار اسکے زیر علم تھے۔ ظاہر ہے کہ جب ایک طرف روپیہ وافر، فوج کثیر اور دل بڑھے ہوئے ہوں، اور دوسری طرف روپیہ بھی قلیل، فوج بھی قلیل اور دل بھی بگڑے ہوئے ہوں، تو ایسے نامساوی مقابلہ میں نری بہادری کا وزن ترازو کے اٹھتے ہوئے پلڑے کو نہیں جھکا سکتا۔ چنانچہ ایسے مقابلہ کا جو قدرتی نتیجہ تھا وہی ظاہر ہوا۔ ۱۸؍ ربیع الاول ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء کو جاجو کے میدان میں جنگ ہوئی جسمیں اعظم اپنے دو بیٹوں سمیت مارا گیا اور سلطان معظم، شاہ عالم بہادر شاہ کشور ہند ــــ باستثناء جنوبی ہند ــــ کا مالک ہو گیا۔ بہادر شاہ ایک حلیم، صلح جو اور نرم خو آدمی تھا۔ اس نے آخر وقت تک خانہ جنگی سے بچنے کی پوری کوشش کی تھی۔ اس نے اعظم کو لکھا تھا کہ والد مرحوم نے اپنے وصیت نامہ میں ملک کی جو تقسیم کی تھی اس میں تم کو دکن کے چھ صوبوں میں سے چار صوبے، گجرات و مالوہ سمیت عطا کئے تھے۔ میں اسکے ساتھ تمہیں دو صوبے اور دیتا ہوں۔ اور اس سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں میں باہم خونریزی نہ ہو:

"نزد اہل اسلام و جمع کہ بہرہٗ از ایمان دارند ظاہر است کہ مقابل خون یک مسلمانے کہ ناحق ریختہ شود خراج ملکے اگر گنجہا

آں دہند تلافی نمی تواند شد"

لیکن اگر یہ صلح تمہیں منظور نہ ہو تو ہم اور تم اپنی غرض نفسانی کی خاطر ایک عالم کو کیوں تباہ کریں؟ آؤ باہم تنہا لڑکر فیصلہ کرلیں۔ اور اس صورت میں تمہارا ہی فائدہ ہے، کیونکہ تم اپنی تلوار کے سامنے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے ہو۔ مگر اس نیک دل شخص کے پیغام کا جواب اعظم کے پاس یہ تھا کہ اس بڈھے نے سعدی کی گلستان بھی نہیں پڑھی کہ اسے معلوم ہوتا کہ "دو بادشاہ در اقلیمے نگنجند"۔ میں تو یہ تقسیم چاہتا ہوں کہ

از فرش خانہ تا بہ لب بام از آں من
از بام خانہ تا بثریا از آں تو

اپنی اس خواہش کے مطابق اعظم نے جنگ کی، اور ملک کی تقسیم بھی ایسی نوعیت کی ہوئی جو وہ چاہتا تھا، مگر اس تقسیم میں اُسے از بام خانہ تا بثریا والا حصہ ملا، اور از فرش خانہ تا بہ لب بام والا حصہ اس کے علی الرغم اسکے حریف کے ہاتھ آگیا۔ جنگ کے بعد بہادر شاہ نے ان تمام امرا کو جو اعظم کے حامی تھے نہ صرف معاف کیا بلکہ انہیں اعلیٰ عہدوں اور مناصب سے سرفراز کیا۔ اسد خاں اور اسکے بیٹے ذوالفقار خاں کو گوالیار سے طلب کرکے ان کی تالیف قلب کی۔ اسد خاں کو نظام الملک آصف الدولہ کا خطاب اور وکیل مطلق کا اعزازی عہدہ عطا کیا۔ ذوالفقار خاں کو صمصام الدولہ امیر الامرا بہادر نصرت جنگ کا خطاب اور میر بخش کے علاوہ نائب وکیل مطلق کا عہدہ دیا۔ دکن میں غازی الدین خاں فیروز جنگ، چین قلیچ خان اور محمد امین خاں کو معافی نامے بھیجے باوجودیکہ

وہ ان امرا سے خوش نہ تھا، مگر اسے انہیں خوش کرنے کی کوشش کی، اور چین قلیچ خاں کو منصب ہفت ہزاری اور اعظم کا دیا ہوا خطاب خان دوراں عطا کر کے صوبہ داری اودھ اور فوجداری لکھنؤ پر مامور کیا۔

کام بخش کی ناکامی اور اسکے اسباب سلطنت کے ضروری انتظامات اور راجپوتانہ کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد بہادر شاہ کی توجہ کام بخش کی طرف منعطف ہوئی۔ کام بخش عالمگیر کی وفات کی خبر سنتے ہی بیجاپور پہنچا جہاں چین قلیچ خاں کے نائب سید نیاز خاں نے تھوڑی مزاحمت کے بعد قلعہ اسکے حوالہ کر دیا۔ کام بخش نے قلعہ پر قبضہ کرنے کے بعد اپنی بادشاہی کا اعلان کیا اور اطراف و نواح میں فوجیں بھیج بھیج کر اپنے حدود مملکت وسیع کرنے شروع کر دیئے۔ جب اعظم کے سامنے یہ سوال پیش ہوا کہ وہ شاہ عالم اور کام بخش میں سے پہلے کون سے حریف کا مقابلہ کرے، تو اس تے متعدد امرا کی رائے کے خلاف شاہ عالم کی مہم کو مقدم قرار دیا اور جنوبی ہند کو چھوڑ کر آگرہ کی راہ لی۔ اسطرح کام بخش کو جنوبی ہند میں اپنی قوت بڑھانے کا بہترین موقع حاصل ہو گیا۔ اگر اپنی ناعاقبت اندیشی، کوتاہ فہمی، اور کج بینی کی بدولت اس نے اس زرین فرصت کو بری طرح ضائع کیا۔ بیجاپور اور کرناٹک کے اکثر حصوں کو مطیع کرنے کے بعد وہ حیدرآباد گیا اور رستم دل خاں صوبہ دار کو بحلف شرعی حفظ ناموس اور جان و مال کی اماں کا یقین دلا کر شہر پر قبضہ حاصل کر لیا۔ یہاں کام بخش کے امرا میں دو جماعتیں بن گئیں جنھوں نے باہم جوڑ توڑ شروع کر دے۔ ایک جماعت کے سرگروہ احسن خاں میر بخشی، سیف خاں (کام بخش کا استاد) اور رستم دل خاں تھے۔ اور دوسری جماعت کا سردار

تقرب خاں حکیم محسن وزیر اعظم تھا۔ تقرب خاں نے کام بخش کو یقین دلایا کہ احسن خاں کی جماعت اسکو پکڑ کر بہادر شاہ کے حوالہ کرنا چاہتی ہے۔ کام بخش نے اس بات کو بلا تحقیق قبول کر لیا، رستم دل خاں کو پکڑ کر ہاتھی کے پاؤں تلے روندوا دیا، سیف خاں کے ہاتھ اور زبان کاٹ کر مروا ڈالا، احمد خان افغان کو زمین پر لٹا کر اس پر گھوڑے کدوائے، اور شہر میں ان لوگوں کی لاشوں کی تشہیر کی۔ پھر احسن خاں کو جو فوج میں نہایت ہردلعزیز تھا، اور سپاہی اور سردار سب جسکے گرویدہ تھے قید کر دیا اور دو تین مہینے تک اسے سخت عذاب دینے کے بعد قتل کرا دیا۔ ان ظالمانہ حرکات سے تمام امرا، سپاہی اور عام باشندے کام بخش سے سخت ناراض ہو گئے، حیدرآباد کے بہت سے شرفا شہر چھوڑ چھوڑ کر چلے گئے، اور فوج والوں کی ایک کثیر تعداد اس سے الگ ہو گئی۔

یہ حالات تھے جبکہ بہادر شاہ اجمیر سے حیدرآباد کی جانب روانہ ہوا، اور راستہ سے اس نے کام بخش کو خط لکھا جسمیں اسے مشورہ دیا کہ وہ حیدرآباد اور بیجاپور کے صوبوں پر قناعت کرے، اور بادشاہی کے دعوے سے دست بردار ہو جائے۔ مگر کام بخش نے نہ صرف اس پیغام صلح کو رد کر دیا بلکہ بہادر شاہ کے ایلچی کو ذلیل کر کے قید بھی کر دیا۔ اب بہادر شاہ کے لئے بجز جنگ کے چارہ نہ تھا، چنانچہ اسنے اپنی پیشقدمی جاری رکھی، اور شوال ۱۱۲۰ھ میں حیدرآباد سے دو تین منزل پر جاکر ٹھہر گیا۔ کام بخش کے پاس پانچ چھ سو سواروں سے زیادہ باقی نہ رہے تھے اور وہ بھی اسکی بدسلوکی، جفاکاری، اور ایک سال سے تنخواہیں نہ ملنے کے سبب نالاں اور بددل تھے۔ اسکے مقابلہ میں

۱۲۹۹۱

بہادر شاہ کے ساتھ دو لاکھ سے زیادہ فوج تھی۔ احسن خاں میر اسد اللہ نے (جو ذوالفقار خاں اسد اللہ خاں سے بگڑ کر راجپوتانہ گیا تھا اور وہاں راجپوتوں کو بہادر شاہ کی مخالفت اور کام بخش کی تائید پر آمادہ کر کے اسی زمانہ میں حیدر آباد پہنچا تھا) کام بخش کو مشورہ دیا کہ گونڈوانہ اور برار کے رستے بھاگ کر راجپوتانہ کی طرف نکل جائے اور راجپوت سرداروں سے مدد لیکر بہادر شاہ کے پہنچنے سے پہلے دھلی اور آگرہ پر قبضہ کر لے، مگر کام بخش نے شبہ کیا کہ یہ مجھے پکڑوانا چاہتا ہے، اور اسے جواب دیا کہ "اس جگہ تیرے حسن تردد و عقیدت کا پھل بجز سزا اور قتل کے کچھ نہ ملیگا"۔ کچھ لوگوں نے اسے مشورہ دیا کہ قریب کے سواحل میں سے کسی بندرگاہ کی طرف چلا جائے اور وہاں سے ایران کی راہ لے، مگر اسے اپنے نجومیوں پر، جو فتح کا یقین دلا رہے تھے، اسقدر اعتقاد تھا کہ اس نے کسی کا مشورہ نہ سنا، اور اسی مٹھی بھر بے دل فوج کو لیکر مقابلہ کے لئے نکل آیا۔ ۱۰؍ ذی قعدہ ۱۱۲۰ھ (جنوری ۱۷۰۹ء) کو دونوں فوجیں باہم مقابل ہوئیں۔ بہادر شاہ لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اسکی خواہش تھی کہ کام بخش خونریزی کے بغیر مطیع ہو جائے۔ مگر ذوالفقار خاں جو محاصرہ جنجی کے زمانہ سے کام بخش کے ساتھ عداوت رکھتا تھا، لڑنے پر مصر تھا۔ اس نے بادشاہ کی اجازت کے بغیر حملہ کر دیا۔ کام بخش نے ایسی سخت مدافعت کی کہ ذوالفقار خاں اور اسکے رفیق داؤد خاں پنّی کے دانت کھٹے ہو گئے مگر نری شجاعت اتنی بڑی قوت کا کہاں تک مقابلہ کرتی۔ اس کی فوج دو گھنٹے کی جنگ کے بعد تتر بتر ہو گئی اور وہ خود زخموں سے چور ہو کر گرفتار ہو گیا۔ اب بہادر شاہ بلا شرکت احدے سلطنت ہند کا مالک تھا۔

قدرت نے کام بخش کے لئے ایک بڑا موقع بہم پہنچایا تھا جسے اسنے قصداً اپنی کوتاہ اندیشی سے کھو دیا۔ اگر وہ اپنے حصہ پر قانع رہتا تو بہادر شاہ جیسا صلح جو آدمی اسے بے دخل کرنے کی کبھی کوشش نہ کرتا۔ اسطرح حیدرآباد اور بیجاپور کے دو عظیم الشان صوبے ملا کر ایک نئی سلطنت بن جاتی جسکے حدود دریائے بھیم اور گوداوری سے لیکر راس کماری تک وسیع ہوتے، جسکی آمدنی ۱۵ کروڑ روپیہ سے کم نہ ہوتی، اور جو پوری سلطنت ہند کے ایک چوتھائی حصہ کے برابر ہوتی۔ یہ نئی سلطنت متعدد حیثیات سے ایک مضبوط سلطنت ہو سکتی تھی۔ اس کا فرمانروا تیموری خاندان کا فرد ہوتا، اسلئے اسے تمام جنوبی ہند کے امرا اور رؤسا کی اطاعت و وفاداری حاصل ہوتی۔ اس کے لئے ایک چھوٹی جسامت کی مملکت کو ضبط میں رکھنا زیادہ آسان ہوتا۔ وہ مرہٹوں کی طاقت کو، جسے عالمگیر آدھ موا کر کے چھوڑ گیا تھا، آسانی کے ساتھ دبا کر تابع فرمان کر لیتی۔ جنوبی ہند کے نائکوں، پالیگروں[۱]، اور چھوٹے چھوٹے راجاؤں کو بھی، جو ابھی تک پوری طرح مطیع نہ ہوئے تھے، زیروزبر کر کے ایک نظام حکومت میں

---

[۱] جنوبی ہند میں نائک فوج کے سردار کو کہتے ہیں۔ اور پالیگر زمیندار کو سلطنت بیجانگر کے زوال کے بعد کرناٹک کے پورے علاقہ میں بہت سے نائک اور پالیگر اپنی چھوٹی چھوٹی سی ریاستیں بنا کر خود مختار ہو گئے جنھیں مطیع کرنے میں عادل شاہ اور قطب شاہ پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ سلطنت مغلیہ کے ماتحت حیدرآباد اور بیجاپور کے صوبہ داروں کا سب سے بڑا کام انہی سرکش نائکوں اور پالیگروں کو تابع فرمان اور باجگذار بنانا تھا۔

منسلک کرلیتی، اور کٹک سے لیکر کوکن تک پورے جنوبی ہند کے سواحل اسکے حیطۂ اقتدار میں آجاتے۔ ایسی ایک مضبوط سلطنت کی موجودگی میں شاید انگریزوں اور فرانسیسیوں کو وہ مواقع حاصل نہ ہوسکتے جو اس واقعہ کے ۳۰ برس بعد ان کو حاصل ہوئے اور جنکی بدولت ہندوستان کی تاریخ کا نقشہ ہی بدل گیا۔

۲- شاہ عالم بہادر شاہ کا دورِ حکومت

اسمیں شک نہیں کہ اعظم اور کام بخش دونوں بہادر اور اولوالعزم تھے، مگر انکی سیرت میں غرور، درشت مزاجی، تنگ دلی، اور بے تدبیری اسقدر زیادہ تھی کہ وہ سلطنت مغلیہ کی فرمانروائی اور عالمگیر کی جانشینی کے قابل ہرگز نہ تھے۔ اسلیۓ انکی شکست اور موت کو فی الحقیقت ہندوستان یا سلطنت کا نقصان نہیں قرار دیا جاسکتا۔ انکے مقابلہ میں بہادر شاہ، اپنی بہت سی کمزوریوں، اپنی حد سے بڑھی ہوئی صلح پسندی، نرم دلی، مروت، فیاضی، اور سیاست نافہمی کے باوجود یقیناً قابل ترجیح تھا۔ وہ اپنے علم و فضل کے لحاظ سے تمام سلاطین تیموریہ میں ممتاز تھا، علم حدیث میں اسے "قدوۃ المحدثین" تسلیم کیا جاتا تھا، تفسیر اور فقہ پر اسکو پورا عبور تھا، اسکی پرہیزگاری اور مذہبیت خود اپنے باپ سے کم نہ تھی، عالمگیر کے بیٹوں میں وہی ایسا شخص تھا جو اپنی فراخ دلی، نیک مزاجی، بردباری، اور حسن سلوک سے سلطنت کے امراء و اعیان کو کسی حد تک خوش رکھ سکتا تھا۔ مگر عالمگیر کے بعد اس سلطنت کے بادشاہ میں جن دوسری صفات کی ضرورت تھی افسوس

ہے کہ وہ صفات اسمیں نہ تھیں۔ اس نے چار یا پانچ سال کے مختصر سے زمانۂ حکومت ہی میں اپنی کمزوریوں سے ایسے اسباب مہیا کردیئے، جنکی بدولت اسکی آنکھ بند ہوتے ہی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔

بہادر شاہ کی بے خبری۔ اسکی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے سلطنت کا تمام کاروبار وزراء و امراء پر چھوڑ دیا اور جزئیات و فروع تو درکنار، کلیات و اصول تک میں ان پر شخصی نگرانی نہ رکھی۔ اسکی یہ بے توجہی اسقدر مشہور ہوئی کہ لوگوں نے اسکو "شہِ بے خبر" کہنا شروع کردیا۔ یہ سلطنت کی بدنصیبی تھی کہ عالمگیر جیسے فرمانروا کے بعد جو اپنی سلطنت کے چھوٹے چھوٹے معاملات تک پر نظر رکھتا تھا، اور جسکی گہری نگاہ سے ہندوستان کے کسی بعید سے بعید گوشے کے عامل یا تھانہ دار کی کارروائی بھی پوشیدہ نہ رہ سکتی تھی، بہادر شاہ جیسا بے خبر بادشاہ حکمراں ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وزراء سے لیکر عاملوں اور متصدیوں تک ہر شخص میں ایک خود سری، اور غیر ذمہ داری کی کیفیت پیدا ہوگئی، اور یہ بالکل قدرتی بات تھی، کیونکہ جو لوگ پچاس سال سے ایک زبردست طاقت کی گرفت میں رہنے کے خوگر ہو چکے تھے، اور جنکے اندر خود اپنی ذمہ داری کو محسوس کرنے اور اپنے اختیار تمیزی کی بنا پر کام کرنے کی قابلیت باقی نہیں رہی تھی، انھوں نے دفعتہً اپنے آپ کو اس گرفت سے آزاد پایا، اور کوئی قوت انکو استبداد و مطلق العنانی سے روکنے والی نہ رہی۔

وزراء کا غلط انتخاب۔ خیر، یہ خرابی بھی کسی حد تک کم بدانجام ہوسکتی تھی اگر وزراء ایسے لوگ ہوتے جو اس کام کو بہتر طریقے پر چلانے

کے قابل ہوتے۔ عالمگیر نے وصیت کی تھی کہ اسکے وزیر اسد خاں کو بدستور وزارت پر برقرار رکھا جائے۔ یہ شخص بہادر شاہ کے لئے بہترین وزیر ہو سکتا تھا۔ نصف صدی سے زیادہ مدت تک سلطنت کے بڑے بڑے ذمہ داری کے عہدوں پر رہ چکا تھا۔ شاہجہاں کے زمانہ میں بخشی دوم تھا، عالمگیر کے عہد میں پہلے نائب وزیر ہوا اور اسکے بعد ۱۰۸۷ھ سے ۱۱۱۸ھ تک مسلسل ۳۰ سال وزیر اعظم رہا۔ سلطنت کے معاملات کو سمجھنے، اسکے کاروبار کو چلانے، اور اسکی سیاسی و انتظامی پالیسی کو بنانے اور عمل میں لانے کے لئے اس سے زیادہ تجربہ کار، اور صاحب بصیرت مدبر کوئی اور نہیں مل سکتا تھا۔ مگر بہادر شاہ نے وزارت کو محض ایک صلہ و انجام کی چیز سمجھ کر یہ عہدہ اپنے وفادار دوست منعم خاں کو دیدیا۔ اسمیں شک نہیں کہ اعظم جیسے طاقتور دشمن کے مقابلہ میں بہادر شاہ کو تخت سلطنت جن لوگوں کی کوششوں سے حاصل ہوا تھا، انمیں شاہزادہ عظیم الشان کے بعد اگر کسی کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ یہی منعم خاں تھا، اور یہ بھی صحیح ہے کہ بہادر شاہ کے مقابلہ میں جن ارکان سلطنت نے اعظم کے دعوے کی حمایت کی تھی انمیں سب سے زیادہ نمایاں یہی دونوں باپ بیٹے اسد خاں اور ذوالفقار خاں تھے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ منعم خاں اپنی بہت سی خوبیوں کے باوجود اس قابل نہ تھا کہ ان نازک حالات میں بلا کسی سابق تجربہ و واقفیت کے سلطنت ہند کا وزیر اعظم بنا دیا جاتا، اور وزیر اعظم بھی ایسا جسے بادشاہ کی شخصی نگرانی و ہدایت کے بغیر تمام

جزئیات وکلیات کا خود انتظام کرتا تھا۔ منعم خاں کو وزارت کا عہدہ دینے کے بعد اسد خاں کو خوش کرنے کے لیئے وکیل مطلق کا عہدہ دیا گیا جسکی حیثیت تو یقیناً وزارت سے بلند تر تھی، مگر اختیارات وہ نہ تھے جو شاہجہاں کے زمانہ میں آصف خاں کو حاصل تھے۔

ایک طرف اسد خاں اس غلط بخشی پر ناخوش ہوا اور دوسری طرف منعم خاں کو اسد خاں کی برائے نام بالادستی بھی گوارا نہ ہوئی۔ اسلیئے اسد خاں کو بوڑھاپے کا عذر کر کے گوشہ نشیں کر دیا گیا اور اسکی تلافی اسطرح کی گئی کہ اسکے بیٹے ذوالفقار خاں کو میر بخشی گری اور صوبہ داری دکن کے ساتھ نائب وکیل مطلق کا عہدہ بھی دے دیا گیا۔ اس طرح وزارت کے اختیارات دو شخصوں کے درمیان تقسیم ہو گئے جن میں سے ایک (ذوالفقار خاں) انتہا درجہ کا اقتدار پسند اور حکومت کا حریص تھا۔ ایسے دو شخصوں کے درمیان اختیارات کے منقسم ہونے کا قدرتی نتیجہ جو ہو سکتا تھا وہی ہوا یعنی یہ کہ دونوں میں تین چار سال تک مسلسل کشمکش برپا رہی، اور اس کشمکش کی وجہ سے سلطنت کے کام میں اور زیادہ خرابیاں پیدا ہوئیں۔ سنہ بہادر شاہی محرم فروری (۱۱۲۳ھ ۱۷۱۱ء) میں منعم خاں کی وفات کے بعد ذوالفقار خاں نے چاہا کہ اسے وزیر بنا دیا جائے۔ بادشاہ نے اتنی عقلمندی برتی کہ وکالت مطلقہ، امیر الامرائی، اور وزارت تینوں کو ایک خاندان میں جمع کر دینا مناسب نہ سمجھا، مگر اخلاقی جرأت کی کمی نے اسے اسکی اجازت بھی نہ دی کہ ذوالفقار خاں کو ناخوش کر کے کسی دوسرے شخص کو وزیر مقرر کرتا۔ اس مشکل کو اس نے اسطرح حل کیا کہ وزارت کے

اختیارات بالفعل شاہزادہ عظیم الشان کے سپرد کئے اور ہدایت اسد خاں (ابن عنایت اللہ خاں خانساماں) کو وزارت خاں کا خطاب دیکر دیوان مقرر کردیا۔ یہ نیا انتظام سابق انتظام سے بھی زیادہ خلاف مصلحت تھا۔ کیونکہ اب ذوالفقار خاں کا مد مقابل خود ایک شاہزادہ ہوگیا جو بادشاہ کے بیٹوں میں سب سے زیادہ لایق اور با اثر تھا۔ اسی زمانہ سے ان دونوں میں وہ کشمکش شروع ہوئی جس کا انجام بادشاہ کے مرتے ہی ایک تباہ کن خانہ جنگی کی صورت میں ظاہر ہوا

صرف یہی ایک غلطی نہیں۔ بہادر شاہ نے عموماً ذمہ داری کے عہدوں پر غلط آدمیوں کو مقرر کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں آدمیوں کو سمجھنے اور انکی قدر و قیمت پہچاننے کی قابلیت نہ تھی۔ اسکے پاس اسکے باپ کے جمع کئے ہوئے بہترین آدمی موجود تھے۔ مگر وہ نہ جانتا تھا کہ کون کس کام کے قابل ہے اور کس کام کے قابل نہیں اسلیے وہ اپنے باپ کی اس زریں نصیحت پر عمل نہ کرسکا کہ:-

> "کار آہن گر از درودگر فرمودن از عقلا بعید است کار بزرگان بخوردان و کار خوردان بہ بزرگان نباید فرمود کہ بزرگان از کار خورد ننگ کنند و خوردان را حوصلہ کار بزرگ نباشد۔ خلل تمام در انتظام سرکار رو دہد"

چین قلیچ خاں اور انکے خاندان سے ناموافقت بہادر شاہ کی ایک دوسری غلطی یہ تھی کہ اس نے اپنے عہد میں تورانی امرا کو جو اساطین سلطنت تھے، ناخوش رکھا، اور انکی قابلیت تجربے اور

سے کوئی کام نہ لیا۔ عالمگیر نے جسکی مردم شناسی مشہور ہے، اس جماعت کے بارے میں نصیحت کی تھی کہ:۔

> ”فرقۂ تورانی سپاہی مقرری اند۔۔ برائے تاخت وتاراج و شبخون و بندی کردن خوب اند۔ بہر صورت ایں جماعت رامحل رعایت باید داشت کہ اکثر جاہا ایں مردم بکار می آیند کہ دیگرے بکار نمی آید“

مگر بہادر شاہ زمانہ شاہزادگی ہی سے اس گروہ کے ساتھ مخالفت رکھتا تھا۔ اس کو غازی الدین خاں فیروز جنگ سے شکایت تھی کہ اس کے خلاف عالمگیر کے مزاج کو برہم کرنے میں انھوں نے بھی حصہ لیا تھا۔ اسکے وزیر معظم خاں کو محمد امین خاں سے شکایت تھی کہ ایک مرتبہ انکی مخالفانہ سعی سے اسیر عالمگیر کا عتاب ہوا تھا اور اس کو تخفیف منصب کی سزا دی گئی تھی۔ ذوالفقار خاں بھی چین قلیچ خاں کے ساتھ حسد کے جذبات رکھتا تھا، اور عالمگیر کے زمانہ سے دونوں میں چشمک چلی آتی تھی۔ ان سب اثرات نے مل جل کر بہادر شاہ کے دور حکومت کو تورانی امرا کے لیے دور نکبت بنا دیا۔ اس زمانہ میں فیروز جنگ کو دکن سے ہٹا کر احمد آباد کی طرف بھیج دیا گیا جہاں وہ آخر وقت تک شکستہ دل رہے۔ محمد امین خاں کو مراد آباد کی فوجداری پر ڈال دیا گیا جس سے وہ بھی خوش نہ رہے چین قلیچ خاں پر گو بظاہر بہت نوازشیں ہوئیں، انکو اعظم کا دیا ہوا منصب شش ہزاری وخطاب خاں دورانی عطا کیا گیا، اور صوبہ داری اودھ اور فوجداری لکھنؤ پر مقرر کیا گیا، مگر وہ دربار شاہی کی نامہربانی سے اسقدر برداشتہ خاطر

ہوئے کہ ذی الحجہ ۲۲ ۱۱۲۲ھ/۱۷۱۱ء میں انھوں نے اپنے عہدوں سے استعفا دیدیا، اپنے خطابات و مناصب واپس کر دے اپنا تمام اثاثہ فقرا پر تقسیم کر دیا اور لباس فقر پہنکر دھلی میں گوشہ نشینی اختیار کرلی[1] اسطرح بہادر شاہ کے عہد حکومت میں گویا سلطنت کا ایک بازو مستقل طور پر شل رہا۔

خطابات و مناصب کی ارزانی بہادر شاہ کی ایک اور غلطی یہ تھی کہ اس نے خطابات اور مناصب دینے میں اسقدر فیاضی و دریادلی سے کام لیا کہ ان چیزوں کی کوئی قدر و قیمت باقی نہ رہی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے خدا سے عہد کیا تھا کہ اگر مجھ کو حکومت حاصل ہوئی تو میں کسی کی درخواست رد نہ کرونگا۔ اس عہد کو اس نے اسطرح نباھا کہ "نہیں" کہنا اپنے

---

[1] اس زمانہ میں بادشاہ نے ان کے لئے ۴ ہزار روپیہ سالانہ پنشن مقرر کردی تھی۔ بعد میں انہیں انکے والد کا خطاب غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ دیکر پھر شاہی خدمت میں لینے کی کوشش کی گئی مگر انھوں نے گوشۂ عزلت نہ چھوڑا۔ منسارام لکھتا ہے کہ اس زمانہ میں دنیا سے ان کے تنفر کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ کوئی شخص امور دنیا کا ذکر بھی کرتا تھا تو مکدر ہو جاتے تھے۔ انکے یہ اشعار اس دور کی کیفیات کو خوب ظاہر کرتے ہیں:۔

بہ تنہائی اگر الفت نمی کردم چہ می کردم — بخاموشی اگر عادت نمی کردم چہ می کردم
غم دنیا جہانے را بدام آرزو دارد — اگر من رم ازیں خلقت نمی کردم چہ می کردم
تلاش بندگی کردم کہ جا از دست بردم دل — چو نامرداں اگر طاعت نمی کردم چہ می کردم

ں زمانہ میں نواب کو فقراء و علما کے سوا کسی کی صحبت پسند نہ تھی۔

اوپر حرام کر لیا۔ جس شخص نے جس چیز کی درخواست کی، اسکی قبولیت کا فرمان صادر ہو گیا۔ بے شمار خطابات ادنیٰ سے ادنیٰ لوگوں کو مل گئے یہاں تک کہ قدیم رسم کے خلاف ایک ایک خطاب میں کئی کئی آدمی شریک ہو گئے۔ چھوٹے چھوٹے مرتبے کے لوگ پنج ہزاری اور شش ہزاری منصب پر چڑھا دیے گئے۔ خانی اور ملکی اور جنگی، اور رائی و راجگی کا بھاؤ اتنا گرا کہ بڑے بڑے خطاب یافتہ بازاروں میں مارے مارے پھرنے لگے۔ ایک مرتبہ حمید الدین خاں نے اپنے دیوان کیسری سنگھ کے لئے "رائے" کے خطاب کی درخواست کی، اس پر بادشاہ نے توقیع کی کہ

> "خانی در ہر خانہ و رائی در ہر بازار، بپاس خاطر شما
> ایں گیدی ہم رائے باشد"

لوگوں نے سنا تو اس کو گیدی رائے گیدی رائے کہنا شروع کر دیا، اور یہ خطاب ایک مدت تک مضحکہ بنا رہا۔ مشرقی سلطنتوں میں خطابات اور مناصب وہ چیزیں ہیں جو بڑی بڑی جاں نثاریوں اور اعلیٰ خدمات کے صلہ میں دی جاتی ہیں اور جن کے حاصل کرنے کی تمنا لوگوں کو کارہائے نمایاں انجام دینے پر ابھارتی ہے۔ مگر جب خطابات و مناصب بلا امتیاز دیے جانے لگیں، اور انکے عطا کرنے میں خدمات اور مراتب کا کوئی لحاظ نہ کیا جائے تو پھر اہل ہمت کو کوئی چیز سلطنت اور بادشاہ کے لئے سرفروشی و جاں نثاری پر ابھارنے والی باقی نہیں رہتی۔

خطابات و مناصب کی ارزانی کا ایک دوسرا نقصان یہ بھی ہوا کہ جب ادنیٰ درجہ کے لوگ اعلیٰ مناصب پا کر بڑے درجہ کے امرا کے

برابر آ بیٹھے تو قدیم زمانہ کے امراء جو عالمگیر کے زمانہ کا رکھ رکھاؤ، حفظ آداب اور فرق مراتب دیکھے ہوئے تھے، اپنی اپنی جگہ سے ہٹ کر گوشوں میں بیٹھ گئے، کیونکہ نئے نوابوں نے آکر اپنی نالائقیوں اور بدتمیزیوں سے سیاست ہی کو نہیں بلکہ تہذیب و معاشرت تک کو گندہ کر دیا تھا۔ مورخین نے چین قلیچ خاں کے استعفیٰ اور گوشہ نشینی کے وجوہ میں سے ایک وجہ یہ بھی بیان کی ہے۔

مذہبی فتنہ۔ بہادر شاہ کی اہم سیاسی غلطیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے اپنی حکومت کی ابتدا ہی میں احکام جاری کر دیے کہ خطبہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ لفظ "وصی" استعمال کیا جائے۔ یہ دوسرے الفاظ میں اس امر کا اعلان تھا کہ سلطنت کا مذہب طریق اہل سنت کے بجائے شیعیت ہو گیا ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں جسکی بیشتر آبادی سُنی تھی، جسکی حکومت ابتدائے سلطنت اسلام سے سنی مذہب کی پیرو رہی تھی، اور جسکے تخت پر اس سے پہلے پچاس سال تک عالمگیر جیسا کٹا سنی بادشاہ متمکن رہ چکا تھا، بہادر شاہ کا اپنی حکومت کی ابتدا ہی میں، علی الاعلان شیعیت اختیار کر لینا" اور خطبہ جمعہ کو بدل دینا، سیاسی اعتبار سے ایک نہایت غیر دانشمندانہ فعل تھا۔ اس نے تمام مسلمانان ہند کے دلوں میں بادشاہ کے خلاف شدید ناراضی کے جذبات پیدا کر دیئے۔ دھلی، آگرہ اور دوسرے بڑے بڑے شہروں میں اسپر فساد برپا ہوئے، دھلی میں تبدیل خطبہ کے احکام پہنچے تو آصف الدولہ اسد خاں نے کہا کہ "ہندوستان میں ایسا نہیں ہو سکتا یہ ایران نہیں ہے۔" احمد آباد میں خطیب کی زبان

سے "وصی" کا لفظ سنتے ہی لوگ اس پر ٹوٹ پڑے اور منبر سے گھسیٹ کر اسے ذلت کے ساتھ قتل کر دیا۔ کشمیر میں بھی اسی طرح ایک خطیب قتل کیا گیا۔ لاہور میں ایک مدت تک خطبہ ہی بند رہا کیونکہ علما نے بالاتفاق ایسے خطبہ کے پڑھنے اور سننے کو ناجائز قرار دے دیا۔ رجب ۱۱۲۳ھ (اگست ۱۷۱۱ء) میں خود بادشاہ لاہور پہنچا اور علما کو جنہیں حاجی یار محمد سب سے پیش پیش تھے مباحثہ کے لئے اپنے حضور میں طلب کیا۔ بحث کے دوران میں تلخ گوئی و درشت کلامی تک نوبت پہنچی۔ بادشاہ نے حاجی یار محمد کو ڈانٹ کر کہا کہ کیا تم بادشاہ کے غضب سے نہیں ڈرتے۔ حاجی نے جواب دیا کہ میں نے خدا سے چار چیزیں طلب کی تھیں جنمیں سے علم، حفظ کلام اللہ، اور حج کی نعمتیں حاصل ہو چکی ہیں اور اب صرف نعمت شہادت کی ضرورت ہے۔ شہر میں لوگوں کے غیظ کا یہ عالم تھا کہ عمائد شہر اور افغان سردار حاجی یار محمد کے پاس جمع ہوئے اور ایک لاکھ ہتھیار بند آدمیوں سے انکی امداد کا وعدہ کیا۔ خود شاہزادہ عظیم الشان اور خجستہ اختر (جہاں شاہ) نے خفیہ پیغام بھیج کر اپنی تائید کا یقین دلایا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ مخالف علما کو پکڑ کر قید کر دیا جائے اور لاہور کو "دارالجہاد" قرار دیا جائے۔ اس پر شاہزادہ معز الدین جہاندار شاہ نے علما کی حمایت کے لئے اپنی فوج اور توپخانہ کو جمع ہونے کا حکم دیدیا اور کہا کہ اگر شاہی فوجیں انپر حملہ کرینگی تو میں ان کی طرف سے لڑونگا۔ اتنے ہنگامے برپا ہونے کے بعد بادشاہ کو معلوم ہوا کہ ایک کٹّے مذہبی ملک میں حکومت کا مذہب بدل دینا اتنا آسان نہیں ہے۔

دکن کی صوبہ داری کا جدید عہدہ۔ فتح حیدرآباد کے بعد بہادر شاہ نے

دکن کے چھ صوبوں کو ایک صوبہ قرار دیکر ان کی ولایت ذوالفقار خاں کو عطا کردی۔ منعم خاں وزیر نے اتنا بڑا ملک ایک شخص کے تصرف میں دینا خلاف مصلحت قرار دیکر خاندیس اور برار پائین گھاٹ کا علاقہ اس کی ولایت سے الگ کرلیا۔ لیکن اسکے باوجود اورنگ آباد، بیدر، حیدرآباد اور بیجاپور کے چار زبردست صوبے جو پورنا ندی سے لیکر راس کماری تک پورے جنوبی ہند پر پھیلے ہوئے تھے اس شخص کے زیر اقتدار آگئے جو پہلے ہی سلطنت کا میر بخشی اور نائب وکیل مطلق بھی تھا۔ یہ بہادر شاہ کے عدم تدبر اور سیاست نافہمی کی ایک اور مثال ہے۔ اس طرح گویا اس نے دکن کی آیندہ خود مختاری کی بنیاد رکھ دی۔ اس سے پہلے دکن کے صوبوں پر بادشاہ کی طرف سے الگ الگ صوبہ دار مقرر ہوتے تھے۔ کرناٹک بیجاپور اور کرناٹک حیدر آباد کے فوجدار بھی براہ راست بادشاہ کی جانب سے نامزد کئے جاتے تھے، اور دکن کو تقریباً ۸ انتظامی اقطاع میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ اس صورت میں اگر کبھی کوئی بغاوت رونما ہوتی بھی تو ایک صوبہ یا ایک نظامت میں ہوتی۔ جسکو دوسرے صوبہ کی مدد سے فرو کیا جا سکتا تھا۔ پورے دکن کا بیک وقت قبضہ سے نکل جانا مشکل تھا۔ لیکن بہادر شاہ اس نکتہ کو نہ سمجھ سکا۔ اس نے اس منقسم شدہ طاقت کو مجتمع کرکے ایک شخص کے ہاتھ میں دیدیا، اور یہ مجموعی طاقت ایسی ہولناک بن گئی، جسکی ٹکر کی کوئی طاقت تمام ہندوستان میں خود بادشاہ کی طاقت کے سوا نہ رہی۔ اب یہ ناممکن تھا کہ دکن کا صوبہ دار بغاوت کرے اور کسی قریب کے صوبہ دار کے ذریعہ سے اسکو فرو کردیا جائے۔ اسکے مقابلہ کے لئے لازم ہوگیا کہ خود بادشاہ اپنی پوری

قوت کے ساتھ حرکت کرے۔ اور اگر بادشاہ کمزور ہو یا کچھ دوسرے اہم مسائل کی طرف مشغول ہو تو پھر کوئی چیز اس ملک کو خود مختاری سے روکنے والی نہ تھی۔ بہادر شاہ نے اپنے اس غیر دانشمندانہ فعل سے سلطنت کے مقابلہ میں ایک سلطنت پیدا کر دی۔ اس نے دکن کے پورے علاقہ کو، جو ابتدائے آفرینش سے فطری طور پر انفرادیت پسند واقع ہوا ہے، ایک مرکز اور ایک فرمانروا بخش دیا، جسکے بعد صرف اتنی کسر باقی رہ گئی کہ کوئی چابک دست آئے اور اس کو سلطنت ہند سے الگ کر دے۔ ذوالفقار خاں یقیناً اپنی حرص اقتدار کی بنا پر اول دن سے یہ نیت رکھتا تھا کہ دکن میں خود اپنی فرمانروائی کا رنگ جمائے، مگر اسے تمام ہندوستان کی سیاسی بازیگری کا ایسا چسکا لگا ہوا تھا کہ وہ اس موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔ اس کے بعد حسین علی خاں کو یہ موقع دیا گیا، مگر اس کو بھی پورے ہندوستان کی حکومت کا شوق دامنگیر تھا، اس لیئے اسکے حوصلے بھی دکن کے تنگ رقبہ میں نہ سما سکے۔ تاہم جو اصولی غلطی کی جا چکی تھی، اسکے نتائج دیر یا سویر ظاہر ہونے ناگزیر تھے، اور وہ ظاہر ہوئے، جیسا کہ آگے چلکر معلوم ہوگا۔

مرہٹوں کے ساتھ معاملہ۔ ذوالفقار خاں کو سیواجی کے پوتے اور سنبھا کے بیٹے، راجہ ساہو کے ساتھ عالمگیر کے زمانہ سے ہی دلچسپی تھی۔ یہ

سنہ ۱۱۰۱؁ ۱۶۸۹؁ میں اپنے باپ سنبھاجی کے ساتھ گرفتار ہو کر آیا تھا اور اسوقت سات آٹھ برس کا تھا۔ اسوقت سے یہ عالمگیر کے ساتھ رہتا تھا۔ عالمگیر نے اسے راجہ کا خطاب، ہفت ہزاری منصب دے رکھا تھا، اور وہ اسکے ساتھ نہایت شفقت و محبت سے پیش آتا تھا، جس کا احسان وہ اسکے مرنے کے بعد بھی نہ بھولا۔ چنانچہ اعظم سے علحدہ ہو کر رہا ہوا تو پہلے کیا وہ یہ تھا کہ خلد آباد جا کر عالمگیر کی قبر کی زیارت کی اور وہاں غربا کو کھانا تقسیم کیا۔

بادشاہ کی وفات سے کچھ عرصہ قبل اس نے ساہو کو اپنی نگرانی میں لے لیا تھا اور اسے اپنے ساتھ قلعہ بخشندہ بخش (کندانہ) کی مہم پر لے گیا تھا۔ بادشاہ کی وفات کے بعد جب اعظم بہادر شاہ سے لڑنے کے لئے احمد نگر سے آگرہ کی جانب روانہ ہوا تو ذوالفقار خاں نے اس سے ساہو کی سفارش کی، اور اس نے ساہو کی ماں، بہن اور بھائی کو ضمانت کے طور پر اپنے پاس رکھ کر، اس شرط پر اسے رہا کر دیا کہ اگر وہ مرہٹہ راج کی گدی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو شاہی حکومت کا مطیع رہیگا۔ اس زمانہ میں ساہو کے چچا رام راجہ کی بیوہ تارا بائی مرہٹوں کی رانی بنی ہوئی تھی، اور تمام مرہٹہ سردار اس کی فرمانروائی پر متفق تھے۔ مگر جب سیواجی کا اصلی وارث ساہو رہا ہوا اور اس نے مرہٹہ قوم کو اپنی طرف دعوت دی، تو مرہٹوں کی جمیعت میں پھوٹ پڑ گئی۔ ایک بڑا گروہ تارا بائی سے الگ ہو کر ساہو سے مل گیا۔ اور اس نے محرم سنہ ۱۱۲۰ھ (مارچ سنہ ۱۷۰۸ء) میں ساہو کو ستارہ لیجاکر سیواجی کی گدی پر بٹھادیا۔ اسکے مقابلہ میں ایک چھوٹا مگر کافی طاقتور گروہ تارا بائی کی وفاداری پر بدستور ثابت قدم رہا اور اس نے ساہو کو جھوٹا مدعی قرار دیکر فیصلہ کر لیا کہ اس کو مرہٹہ قوم کا راجہ نہ بننے دیا جائیگا۔ اس پر دونوں جماعتوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی جس کا سلسلہ تقریباً ۲۲ سال تک جاری رہا۔

اس حد تک تو ذوالفقار خاں کی حکمت عملی کامیاب تھی کیونکہ اس نے حریف کے گروہ میں تفرقہ پیدا کر دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد جب وہ بہادر شاہ کے ساتھ کام بخش کی مہم پر حیدرآباد پہنچا تو

وہاں ساہو کے وکیل اس کے پاس پہنچے اور انھوں نے اس کے توسط سے درخواست کی کہ راجہ ساہو کو ششش صوبہ دکن کی سردیسمکھی اور چوتھ[۱] اس شرط پر عطا کی جائے کہ وہ ملک کے امن کا ذمہ دار ہوگا، اور لوٹ مار کرنے والے گروہوں کو (جو خود مرہٹے ہی تھے) اس فعل سے باز رکھیگا۔ ذوالفقار خاں نے اس درخواست کی پرزور سفارش کی اور بہادر شاہ نے اپنی کمزوری سے اس کو قبول کر لیا۔ لیکن اس دوران میں تارابائی نے بھی اپنے وکلا، بادشاہ کے پاس بھیجے اور انھوں نے منعم خاں وزیر کی وساطت سے درخواست کی کہ اگر ہم کو صرف سردیسمکھی کا فرمان دیدیا جائے تو ہم تمام مفسدوں کو دفع کرکے امن قائم کرنے کا ذمہ لیتے ہیں۔ چونکہ ذوالفقار خاں ساہو کی تائید کر رہا تھا اسلئے منعم خاں نے اس کی ضد پر تارابائی کے وکلاء کا ساتھ دیا۔ بادشاہ کی فطرت اس قسم کی تھی کہ وہ کسی شخص کی درخواست رد نہ کرتا تھا، حتیٰ کہ بسا اوقات صبح شام کے تفاوت سے مدعی اور مدعا علیہ دونوں کی موافقت میں فرمان صادر کر دیتا تھا۔ اس لئے

---

[۱] سردیسمکھی کل مالگذاری کا ۹ یا ۱۰ فی صدی، اور چوتھ کل مالگذاری کا ۲۵ فی صدی حصہ تھا۔ اس طرح ساہو دکن کی پوری آمدنی کے ۳۴ فی صدی کا دعویدار تھا۔ شاہ نواز خاں صاحب مآثر الامرا کا بیان ہے کہ ساہو نے چوتھ کا نہیں بلکہ صرف سردیسمکھی کا مطالبہ کیا تھا اور وہ بھی ششش صوبہ دکن میں نہیں بلکہ اورنگ آباد، برار، خاندیس، بیدر، اور بیجاپور کے صوبوں میں۔ لیکن متن میں جو بیان کیا گیا ہے وہ خافی خاں کی روایت کے مطابق ہے۔

وہ نہ ذوالفقار خاں کی بات رد کر سکا، اور نہ منعم خاں کی، آخر اس نے یہ راہ اختیار کی کہ دس فی صدی سردیسمکھی کا فرمان تو لکھ دیا، مگر اس کی تعمیل کو اسوقت تک کے لئے ملتوی کر دیا، جبتک کہ دونوں فریق لڑ کر باہم اس امر کا تصفیہ نہ کر لیں کہ دونوں میں سے کون مرہٹہ راج کی گدی کا اصلی وارث ہے۔

گو اس موقع پر مرہٹوں کو اپنی آپس کی نا اتفاقی، اور منعم خاں کی عاقلانہ مداخلت سے (جو معلوم نہیں اس نے دانستہ کی تھی یا نادانستہ) سردیسمکھی کا فرمان حاصل کرنے میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی، لیکن انکے لئے یہی ایک بڑی کامیابی تھی کہ مغل بادشاہ نے دکن کے صوبوں میں انکا سردیسمکھی وصول کرنے کا حق تسلیم کر لیا، اور یہ بھی مان لیا کہ شاہی حکومت خود اپنے ملک میں امن قائم کرنے اور مفسدوں کو دفع کرنے کی قابلیت نہیں رکھتی، اور اب وہ اس کی محتاج ہو گئی ہے کہ مرہٹہ راجہ آکر اس کی رعایا کو ظالموں کی دست درازی سے بچائے، لوٹ مار کو روکے، اور وہ فرض انجام دے جو خود شاہی پولیس اور فوج کو انجام دینا چاہیئے تھا۔ ایک منظم اور باضابطہ حکومت کا اولین فرض یہی ہے کہ وہ اپنے ملک میں امن قائم کرے اور اپنی رعایا کی حفاظت کرے۔ جو حکومت اس فرض کو خود انجام نہیں دے سکتی اور اسکے انجام دینے میں کسی دوسری طاقت کی محتاج ہوتی ہے، وہ در اصل اس امر کا اعلان کرتی ہے کہ وہ حکمرانی کی قابلیت سے محروم اور فرمانروائی کے حق سے دست بردار ہو چکی ہے، اور اب حکومت اس طاقت کا حق ہے جو حکمرانی کے اصلی فرائض کو انجام دے سکتی ہے۔ لیکن بہادر شاہ

کے نزدیک اس معاملہ میں اگر کوئی سوال اہمیت رکھتا تھا تو وہ صرف یہ تھا کہ وہ ذوالفقار خاں کی بات مانے یا منعم خاں کی۔ اس سے زیادہ کسی عمیق سیاسی معنی کو سمجھنے کی اس نے کوشش ہی نہ کی، اور اس نا فہمی کی بدولت اس نے ایک فعل کا ارتکاب کر دیا جو سلطنت مغلیہ کی جانب سے پہلی مرتبہ مرہٹوں کے سامنے شکست کا اعتراف، اور آئندہ کی مزید شکستوں کا فتح باب تھا۔ عالمگیر چالیس برس تک سیواجی اور اس کے جانشینوں سے جس بات پر لڑتا رہا وہ یہی تھی کہ سیواجی اور اس کے جانشین شاہی علاقوں میں بدامنی برپا کر کے حکومت کو یقین دلانا چاہتے تھے کہ اس کے ملک کا امن و امان ہمارے ہاتھ میں ہے، اگر وہ امن چاہتی ہے تو ہم کو ملک کے حاصلات میں سے چوتھ اور سر دیسمکھی عطا کرے، ہم امن قائم کر دینگے۔ اس کے مقابلہ میں عالمگیر ان کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ میرے ملک کا امن خود میرے ہاتھ میں ہے، جب تک میں بادشاہ ہوں ملک میں امن قائم کرنا میرا فرض ہے، اور ملک کے حاصلات بھی میرا حق ہیں۔ یہ حق اور یہ فرض دونوں تقسیم نہیں کئے جا سکتے۔ یہی بات تھی جس پر عالمگیر اور مرہٹوں کے درمیان تقریباً نصف صدی تک جنگ برپا رہی، سیواجی، سنبھاجی، اور رام راجہ کی زندگیاں اسی کی خاطر لڑنے میں ختم ہوئیں، اور وہ بادشاہ سے اس کو تسلیم کرانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر میں تارابائی نے پیہم معرکہ آرائیاں اور غارتگریاں

کرکے اس چیز کو حاصل کرنا چاہا اور وہ بھی اس میں ناکام رہی[لہ]۔ یہ اس وقت ہوا جب کہ مرہٹوں کی تمام قوت ایک مرکز پر مجتمع تھی۔ مگر اب شاہی حکومت کے پاس وہی فوج تھی، وہی جنرل تھے، وہی ساز و سامان تھا، اور اس کے مقابلہ میں مرہٹوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی، ان کی قوت منقسم تھی اور وہ خود ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ باوجود اس کے مرہٹے شاہی حکومت سے وہی چیز تسلیم کرانے میں کامیاب ہو گئے، اور وہ بھی تلوار کے زور سے نہیں بلکہ محض گفت و شنید کے ذریعہ سے۔ اس کی وجہ بجز اس کے اور کیا بتائی جا سکتی ہے کہ اب اس حکومت کا صدر نشین عالمگیر نہیں بلکہ بہادر شاہ تھا!

عالمگیر نے مرہٹوں کی مہم کو اس حال میں چھوڑا تھا کہ انکے تقریباً تمام مقبوضات حتیٰ کہ کوکن بھی جہاں سیواجی نے اپنا سوراج قائم کیا تھا، شاہی فوجوں کے تصرف میں آ چکے تھے۔ انکے پہاڑی قلعوں کا بھی ایک بڑا حصہ فتح ہو چکا تھا، اور صرف چند قلعے انکے

[لہ] آزاد بلگرامی نے خزانہ عامرہ میں لکھا ہے کہ آخر میں تارا بائی کی درخواست پر بادشاہ نے بصیغہ سردیسمکھی مرہٹوں کو محصول ملکی میں سے ۹ فی صدی حصہ دینے کا فرمان لکھ دیا تھا اور قاصد اسے لیکر روانہ بھی ہو گئے تھے، مگر پھر اسکی رائے بدل گئی اور اس نے فرمان واپس منگا کر چاک کر ڈالا۔ یورپین اور ہندو مورخوں نے عموماً اسی روایت کو تسلیم کیا ہے لیکن دوسری کوئی تاریخ اسکی تائید نہیں کرتی۔ خافی خاں نے بتصریح لکھا ہے کہ "ہر چند وکلائے تارا بائی رانی... التماس مصالحہ بشرط عطا نمودن سردیسمکھی شش صوبہ دکن بدستور سر صدرہ دیہہ رجوع آوردہ بود بادشاہ مغفور از غیرت اسلام... قبول نہ نمود"

پاس رہ گئے تھے۔ مرہٹہ طاقت ایک مرتب اور منظم حکومت کی حیثیت سے قریب قریب مٹ چکی تھی۔ ان کے بے خانماں گروہ جو جنگ و جدال کے خوگر ہو چکے تھے اور جن کو آزمودہ کار سردار بھی میسر تھے، ہزار ہزار دو دو ہزار کی غارتگر ٹکڑیوں کی صورت میں اورنگ آباد، بیدر، بیجاپور، برار، خاندیس، مالوہ، اور گجرات کے مختلف اقطاع پر پھیل گئے تھے، اور قصبات و دیہات کو لوٹتے اور رہزنی کرتے پھرتے تھے۔ جہاں کہیں شاہی فوج آس پاس موجود ہوتی وہاں سے بھاگ جاتے، اور جہاں کوئی محافظ قوت موجود نہ ہوتی وہاں کی زراعت پیشہ آبادیوں سے جبراً چوتھ وصول کرتے، قافلوں کو روک کر ان کے مال کا چوتھائی حصہ چھین لیتے، اور جو کوئی انکے مطالبہ سے روگردانی کرتا اس کو لوٹ لیتے تھے۔ عالمگیر نے ان غارتگر گروہوں کے مقابلے کے لئے اپنی فوجیں تمام ملک میں پھیلادی تھیں اور ان سے زدوخورد کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری تھا۔

یہ حالت ابھی کسی فیصلہ کن مرحلے پر نہیں پہنچی تھی کہ ادھر بادشاہ کا انتقال ہو گیا۔ اور اُدھر مرہٹوں کے درمیان ایک تباہ کن خانہ جنگی شروع ہو گئی، جو عالمگیر کے بیٹوں کی خانہ جنگی سے بہت زیادہ طویل مدت تک جاری رہی، اور جس کی بدولت چند سال کے لئے مرہٹوں کے غارتگر ہاتھ شاہی علاقوں پر دراز ہونے کے بجائے آپس میں ایک دوسرے سے الجھ گئے۔ اس حالت میں عالمگیر کے جانشین کے لئے مرہٹوں کے مسئلہ کو حل کرنے کی اگر کوئی بہتر صورت ہو سکتی تھی تو وہ یہ تھی کہ وہ تارابائی کے مقابلہ

میں ساہو کو کھڑا کرتا جو مرہٹہ سردار شاہی حکومت کے تابع فرمان تھے ان کے ذریعہ سے اس کو ہر قسم کی فوجی و مالی امداد دیتا یہاں تک کہ وہ تارا بائی کا زور توڑنے میں کامیاب ہو جاتا، پھر اسے کوکن اور اس کے گرد و نواح کے علاقہ میں سوراج دیکر ایک باجگذار، نیم آزاد ریاست کی حیثیت سے اپنی نگرانی میں رکھتا اور اسی کے سپرد یہ کام کرتا کہ مرہٹہ سرداروں کو اپنے ہاں جاگیریں دے دے کر ایسا وسیلہ معاش بہم پہنچا دے، جسکے بعد انہیں شاہی علاقوں میں غارتگری کی نہ ضرورت رہے اور نہ خواہش۔ یہ حکمت عملی کسی حد تک اختیار کی گئی مگر وہ ادھوری تھی اور پوری طرح سوچی سمجھی نہ گئی تھی۔ ساہو کو رہا کیا گیا مگر اس کا اصلی وقت مدعیان تخت کی خانہ جنگی کے آغاز میں نہ تھا، بلکہ جانشینی کا مسئلہ طے ہونے کے بعد تھا۔ پھر ساہو کو محض چھوڑ دینا کافی نہ تھا، اسے پوری فوجی اور مالی امداد دینی چاہیئے تھی تاکہ وہ اپنی کامیابی کو اپنی قوت و کوشش کا نتیجہ نہ سمجھتا بلکہ ہمیشہ یہ محسوس کرتا کہ اس کا وجود شاہی امداد پر منحصر ہے۔ اس کو اور تارا بائی کو آپس میں نمٹ لینے کے لئے آزاد چھوڑ دینا بھی ایک اہم غلطی تھی۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ فریقین میں سے ایک لامحالہ دوسرے کو دبا لیتا اور پھر کامیاب فریق پوری مرہٹہ طاقت کا مرکز بن کر سلطنت کے مقابلہ پر اتر آتا، اور فی الواقع یہی نتیجہ ظاہر ہوا اس طرح انہیں باہمی تصفیہ کے لئے چھوڑ دینے کے بجائے صحیح سیاسی تدبیر یہ تھی کہ شاہی حکومت ان دونوں مخاصموں کے درمیان حکم بن کر ایسے طریقہ

سے تصفیہ کراتی جس سے ستارہ اور کولھاپور کی ریاستیں ایک دوسرے کے مقابل شاہی حمایت میں قائم ہوئیں، تاکہ ضرورت کے وقت ایک کی شورش و بغاوت کو فرد کرنے میں دوسری کو استعمال کیا جاتا' اور ترازو کے دونوں پلڑوں کو جھکانا اور اٹھانا شاہی حکومت کے اختیار میں رہتا۔ اس حکمت عملی کو بعد میں نظام الملک نے اپنی پہلی صوبہ داری کے زمانہ میں استعمال کرنے کی کوشش کی، مگر اس کے نتیجہ خیز ہونے سے پہلے ہی انہیں واپس بلا لیا گیا' اور جب دوسری مرتبہ وہ دکن پہنچے تو اس کی کامیابی کے مواقع باقی نہ رہے تھے۔

حیدرآباد کی مہم ختم ہونے کے بعد سنہ ۱۱۲۱ھ (۱۷۰۹ء) میں جب بہادر شاہ دکن سے واپس ہوا' تو ذوالفقار خاں نے اپنی جانب سے داؤد خاں پنی کو نائب صوبہ دار دکن مقرر کیا۔[۱] یہ شخص اس زمانہ میں ذوالفقار خاں کے ماتحت کرناٹک بیجاپور اور کرناٹک حیدرآباد کا فوجدار تھا' اور ایک قائد کی حیثیت سے یقیناً ایک قابل اور بہادر شخص تھا، مگر اس وقت دکن کے انتظام کے لئے فوجی قابلیت سے زیادہ سیاسی قابلیت کی ضرورت تھی، جو اس میں نہ تھی۔ اس نے سلطنت کے ساتھ مرہٹوں کی سیاسی وضعیت کو بالکل نہ سمجھا اور اپنی پوری قوت ساہو اور اسکی جماعت کی تائید میں

---

[۱] منعم خاں کی وفات کے بعد خاندیس اور براہ پایان گھاٹ کی صوبہ داری بھی اس کو مل گئی، اور اس طرح وہ دکن کے پورے چھ صوبوں کا مالک و مختار بن گیا۔

صرف کردی جس سے بہادر شاہ کا توازن قوت بالکل بگڑ گیا۔ ساہو کی طاقت اتنی مضبوط ہوگئی کہ اسکے مقابلہ میں تارا بائی کی جماعت کو استعمال کرنے کے مواقع بہت کم رہ گئے، اور مرہٹہ راج پائدار بنیادوں پر قائم ہوگیا۔ اس سے زیادہ بڑی غلطی اس نے یہ کی کہ شاہی سند کے بغیر مرہٹوں کو اپنے اختیار سے شش صوبہٴ دکن میں سردیسمکھی اور چوتھ وصول کرنے کا حق دیدیا، اور اسکے معاوضہ میں اُن سے یہ سمجھوتہ کرلیا کہ اسکی (یعنی داوٴد خاں کی) اور شاہزادوں کی جاگیروں سے تعرض نہ کریں۔ ان جاگیرات کے سوا باقی تمام شاہی علاقوں سے خود داوٴد خاں کا نائب ہیرامن چوتھ وصول کر کے ساہو کے حوالہ کرنے لگا، اور اکثر محالات میں اسکے عمال نے مرہٹہ سرداروں سے "ما بخیر و شما بہ سلامت" اور "نصف لنا و نصف لکم" کا معاملہ کرلیا۔

یہ بنیادی غلطیاں تھیں جنکی وجہ سے چند سال بعد ہی دکن سے مرہٹوں کا وہ زبردست فتنہ اٹھا جس نے نہ صرف دکن بلکہ تمام ہندوستان میں تہلکہ برپا کردیا، اور سلطنت مغلیہ کے پرخچے اڑا دیے۔

۳ - بہادر شاہ کے بیٹوں کی خانہ جنگی

اب ہم ایک دوسرے دور میں قدم رکھتے ہیں جس سے سلطنت کی اصل تباہی کا آغاز ہوا۔ بہادر شاہ نے اپنے زمانہٴ حکومت میں گو بہت سی غلطیاں کیں، اور بعض ایسی غلطیاں کیں جنسے بعد میں بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہوئیں۔ تاہم وہ ایک تجربہ کار شخص تھا اور کم از کم اسمیں اتنی قابلیت ضرور تھی کہ سلطنت کا شیرازہ کسی حد تک مجتمع

رکھ سکتا تھا۔ لیکن اسکے وارثوں میں کوئی اتنی قابلیت بھی نہ رکھتا تھا، اور یہ امر یقینی تھا کہ اس بوسیدہ عصا کے ٹوٹتے ہی سلیمان حکومت کا جسد کسی طاقت سے نہ سنبھل سکے گا۔ بادشاہ جب تخت پر بیٹھا تھا اُس وقت وہ ایک ۶۵ سال کا بوڑھا تھا جس کے قویٰ جواب دے چکے تھے۔ چار پانچ برس اسکی قوتوں نے اور ساتھ دیا۔ آخر محرم ۱۱۲۴ھ (فروری ۱۷۱۲ء) میں اس کا وقت آن پورا ہوا، اور لاہور میں اس نے وفات پائی۔

بہادر شاہ کے بیٹے اور ان کے اختلافات

اس کے بیٹوں میں چار نمایاں شخصیت رکھتے تھے:۔

(۱) معز الدین، جسکو اس نے اپنی تخت نشینی کے بعد جہاندار شاہ کا خطاب دیکر ٹھٹھ اور ملتان کا صوبہ دار مقرر کیا تھا۔

(۲) محمد عظیم جس کا خطاب عظیم الشان تھا اور بنگال و بہار کی صوبہ داری پر مامور تھا۔

(۳) رفیع القدر جسے رفیع الشان کا خطاب اور کابل کا صوبہ ملا ہوا تھا۔

(۴) خجستہ اختر جس کا خطاب جہاں شاہ تھا اور مالوہ کا صوبہ اس کے سپرد تھا۔

بڑا بیٹا جہاندار شاہ ابتداء عمر میں ایک بہادر سپاہی تھا۔ دکن کی مہموں اور ملتان کی حکومت کے ابتدائی دور میں اس نے خاصی قابلیت اور کاردانی کا اظہار کیا تھا جس کا یہ اثر تھا کہ بہادر شاہ مقابلہ پر جاتے وقت اگر اعظم کو کسی کا خوف تھا تو وہ بھی شاہزادہ

تھا۔ لیکن آگے چلکر اُسکی تمام خوبیاں عیوب سے بدل گئیں، اور اسے دور شراب ناب اور لال کنور کے[1] عشق کے سوا کسی اور چیز سے دلچسپی باقی نہ رہی۔ ان وجوہ سے بہادر شاہ اسکو سخت ناپسند کرنے لگا تھا۔ تیسرا بیٹا رفیع الشان سیاست و معرکہ آرائی سے دور کا تعلق بھی نہ رکھتا تھا۔ اس کا تمام تر شوق و ذوق اپنے بناؤ سنگھار تزئین و آرائش، اور کپڑے، جواہر اور زیورات جمع کرنے میں تھا۔ چنانچہ عظیم الشان اسپر اسطرح پھبتی کستا تھا کہ:۔

آئینہ و شانہ گرفتہ بدست
چوں زن رعنا شدہ گیسو پرست

بہادر شاہ کی شاہزادگی کے زمانہ میں یہ اس کا چہیتا بیٹا تھا اور ایک مدت تک وہی اس کا مشیر و صلاح کار رہا۔ پھر اس کی جگہ چوتھے لڑکے جہاں شاہ نے لے لی اور اس کا اثر اتنا بڑھ گیا کہ بعض مورخین نے منعم خاں کی وزارت کو اسی کی سفارش کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ لیکن اخیر زمانہ میں دوسرا لڑکا عظیم الشان ان سب پر سبقت لے گیا۔ بادشاہ نے کاروبار سلطنت اسی کے ہاتھ میں چھوڑ دیا تھا، شاہی مہر اس کے پاس رہتی تھی، منعم خاں کے بعد وزارت کا کام عملاً وہی انجام دیتا تھا، اور بادشاہ سے لیکر امرا اور عمال تک سب پر اس کا اثر چھایا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ بنگال اور آگرہ کے خزانوں سے جو زبردست دولت اسنے حاصل کی تھی

---

[1] یہ ایک مغنیہ تھی جس کے حسن پر جہاندار شاہ بری طرح فریفتہ تھا، اور تمام امور دنیا کو چھوڑ کر اسی کے عیش و نشاط میں منہمک ہو گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تان سین کی نسل سے تھی۔

اور جسقدر ساز و سامان اور لشکر اس نے فراہم کر لیا تھا۔ اسکی بدولت اپنے سب بھائیوں میں وہی سب سے زیادہ طاقتور تھا اور عام طور پر لوگ اسی کو بہادر شاہ کا آئندہ جانشین سمجھتے تھے۔

بہادر شاہ کی زندگی ہی میں ان چاروں کے درمیان تخت کے حصول کے لئے رقیبانہ عداوت پیدا ہو چکی تھی اور وہ ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کر رہے تھے، مگر عظیم الشان کا خوف سب کے دلوں پر غالب تھا۔ چنانچہ بادشاہ کی آخری بیماری کے زمانہ میں ایک مرتبہ عظیم الشان اور جہاندار شاہ دونوں اسکے قریب بیٹھے تھے، عظیم الشان نے اپنا خنجر اٹھا کر اس سے کھیلنا شروع کیا، جہاندار شاہ سمجھا کہ کھیلنے کے بہانے مارنا چاہتا ہے، گھبرا کر اٹھا، اور اس بدحواسی کے ساتھ بھاگا کہ دروازے سے ٹکرا کر پگڑی گر گئی اسے چھوڑا، جوتی بھی چھوڑی، ننگے سر ننگے پاؤں اپنی پالکی کی طرف لپکا اور خیمے کی رسیوں میں الجھ کر اوندھے منہ جا پڑا۔ اپنے حریف کی قوت کو دیکھ کر آخر میں اس نے طے کر لیا تھا کہ باپ کے مرتے ہی ملتان بھاگ جائے، اور وہاں اپنے حامیوں کو جمع کر کے قسمت آزمائی کرے۔ اسی طرح دوسرے بھائی بھی شکستہ دل ہو چکے تھے اور میدان بظاہر عظیم الشان کے لئے صاف تھا۔

ذوالفقار خاں کی سازشیں ۔ لیکن تمام امرا میں ایک شخص اور سب سے زیادہ طاقتور شخص اس کا مخالف تھا، جسکی قوت نے اسکی قسمت کا پانسہ پلٹ دیا۔ یہ ذوالفقار خاں تھا۔ ان دونوں کی مخالفت اور اسکے اسباب کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ بہادر شاہ کی وفات سے کچھ مدت قبل اس نے چاہا کہ عظیم الشان سے صفائی کر لے اور اس کے

حامیوں میں شامل ہوجائے۔ مگر شاہزادہ نے اسکے پیغام کو نامناسب درشتی کے ساتھ رد کردیا۔ اس پر، بگڑ کر ذوالفقار خاں جہاندار شاہ سے مل گیا۔ اور اس نے رفیع الشان اور جہان شاہ کو دعوت دی کہ وہ دونوں عظیم الشان کے خلاف جہاندار شاہ کے ساتھ اتحاد کریں۔ چنانچہ اسی کی کوشش سے تینوں بھائیوں کے درمیان اس پر اتفاق ہوا کہ جہاندار شاہ بڑا بھائی ہونے کی حیثیت سے بادشاہ بنایا جائیگا اور سکہ و خطبہ اسکے نام کا رہیگا رفیع الشان کو کابل، کشمیر، ملتان، ٹھٹہ اور بھکر کے صوبے ملینگے نربدا سے لیکر راس کماری تک پورا دکن جہان شاہ کے حصہ میں آئیگا، اور عظیم الشان کے لشکر سے جو کچھ اموال و غنائم ہاتھ آئینگے وہ تینوں میں برابر تقسیم ہونگے۔ اسکے ساتھ ایک عجیب و غریب شرط یہ بھی تھی کہ ذوالفقار خاں تینوں بھائیوں کا وزیر رہیگا۔ یہ ایسی مضحکہ انگیز تجویز تھی، جس پر خود ذوالفقار خاں مذاق کے طور پر کہتا تھا کہ "تین بادشاہوں کا ہونا تو اسقدر مستبعد نہیں ہے، مگر وزیر ایک اور بادشاہ تین، یہ ایک نادر بات ہے"۔ غرض یہ ماہدہ قرآن پر لکھا گیا اور تینوں بھائیوں نے قسمیں کھائیں کہ اس پر قائم رہینگے۔ اس فریق کے ساتھ ذوالفقار خاں کی شرکت کا نتیجہ یہ ہوا کہ یا تو قلت سپاہ و عسرت مال کے سبب سے جہاندار شاہ اور اسکے بھائی ڈر رہے تھے، یا اب ذوالفقار خاں کا نام سنتے ہی سپاہی اور سردار فوج در فوج انکے گرد جمع ہونے لگے، یہاں تک کہ صفر کے وسط میں جب جنگ کی نوبت آئی تو ان تینوں کے پاس مجموعی طور پر ۵۰ ہزار سوار اور ۶۰ ہزار پیادہ فوج تھی، اور انکے مقابلہ میں عظیم الشان کی فوج ۳ ہزار سوار اور ۳۰ ہزار پیادہ سے زیادہ

نہ تھی۔ اپنی اس کمزوری کو عظیم الشان نے بالکل آخر وقت میں محسوس کیا۔ اور اس کی تلافی اس نے اسطرح کی کہ چین قلیچ خاں کو بعلجت پیغام بھیجا کہ میری مدد کے لئے فوراً آئے۔ یہ تدبیر یقیناً اسکے لئے مفید تھی۔ کیونکہ اسوقت امرائے سلطنت میں اگر ذوالفقار خاں کی ٹکر کا کوئی شخص تھا تو وہ یہی امیر تھا جس نے دھلی میں گوشۂ عزلت اختیار کر رکھا تھا۔ لیکن عظیم الشان نے اس طرف توجہ اسوقت کی جب تلافی کا وقت گذر چکا تھا۔ اس کا پیغام پہنچتے ہی چین قلیچ خاں نے محسوس کیا کہ اگر سلطنت کو بچانا ہے تو اس کا یہی وقت ہے۔ چنانچہ اپنے منتشر آدمیوں کو جمع کر کے وہ تیزی کے ساتھ دھلی سے نکلے۔ لیکن ابھی بادلی کی سرائے ہی تک پہنچے تھے کہ لاہور سے عظیم الشان کی شکست اور اس کے مفقود الخبر ہو جانے کی خبر آگئی، اور انہیں پھر اپنے کنج فقر کی طرف واپس ہونا پڑا۔

عظیم الشان کی شکست بہادر شاہ کی وفات سے پہلے ہی لوگوں میں عام طور پر یہ چرچا شروع ہو گیا تھا کہ ایک زبردست فتنہ برپا ہونے والا ہے۔ جس رات بادشاہ کا انتقال ہوا، اس رات تمام سردار (باستثناء چند) اپنی اپنی جمعیتوں کے ساتھ شاہی کیمپ چھوڑ چھوڑ کر فریقین میں سے کسی ایک کے ساتھ ملنے کے لئے چلے گئے، شاگرد پیشہ، خدام، اور بازار لشکر کے سوداگر نہایت بدحواسی کے عالم میں اپنے اسباب سروں پر لاد لاد کر اور عورتوں اور بچوں کے ہاتھ پکڑ پکڑ کر شہر کی طرف بھاگ گئے، آن کی آن میں تمام کیمپ سونا ہو گیا، اور معسکر شاہی سے لیکر شہر تک ایک عام اضطراب برپا ہو گیا۔ تخت کے امیدوار بیٹے جو باپ کی موت کے لئے چشم براہ بیٹھے تھے، یہ اطلاع پاتے ہی خونریز جد و جہد کے لئے طیار ہو گئے اور اسی وقت سے

فوجوں کی نقل و حرکت شروع ہو گئی۔ اگر عظیم الشان جرأت سے کام لیکر ابتدا ہی میں حریف گروہ پر حملہ آور ہو جاتا تو ممکن تھا کہ تخت اسی کے ہاتھ آتا۔ لیکن اس نے خود حملہ آور ہونے کے بجائے مدافعت کا پہلو اختیار کیا اور اس قیمتی وقت کو اپنی خندقوں کے قلعے میں بیٹھے بیٹھے ضائع کرتا رہا اسکی فوج کے امرا حملہ کے لئے اصرار کرتے کرتے تھک گئے مگر وہ "اندک باشید" کہتے نہ تھکا۔ اسکی وجہ یا تو یہ تھی کہ وہ ذوالفقار خاں کی قائدانہ قابلیت سے خوف زدہ ہو گیا تھا، یا وہ اس غلط فہمی میں تھا کہ مخالفین کے پاس روپیہ اور سامان رسد کم ہے اور فوج زیادہ فراہم کر رہے ہیں، اسلئے اگر انکو زیادہ ڈھیل دی جائے گی تو وہ خود تباہ ہو جائینگے۔ اسکی ایک اور غلطی یہ تھی کہ اس نے اپنی دولت فوج کے سرداروں اور سپاہیوں کی وفاداری خریدنے پر صرف نہیں، اور اپنے بخل سے سب کو بددل کر دیا، حتیٰ کہ عام طور پر اسکی کنجوسی ضرب المثل بن گئی اور لوگ کہنے لگے کہ عظیم الشان کے باورچی خانہ سے زیادہ سرد مقام کوئی نہیں ہے۔ بہر حال اپنی ان کوتاہیوں سے اس نے ذوالفقار خاں کو طیاری کی پوری فرصت دے دی، اور ذوالفقار خاں اپنی طیاریاں مکمل کر کے یکم صفر سنہ ۱۱۲۴ھ (۹ مارچ ۱۷۱۲ء) کو تینوں حلیف شاہزادوں کے ساتھ عظیم الشان کے مقابلہ پر آ گیا۔ ایک ہفتہ تک چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ جاری رہا جسکے دوران میں عظیم الشان کی فوج کے لوگ بددل ہو ہو کر راتوں کو بھاگنے لگے، اور اسکی ساٹھ ستر ہزار فوج میں سے دس بارہ ہزار آدمی باقی رہ گئے۔ ۹ صفر کو ایک زبردست معرکہ ہوا جسمیں عظیم الشان کی فوج کا بڑا حصہ شریک ہوا، مگر خود عظیم الشان اپنی جگہ سے نہ ہلا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ ابتک اس کا ساتھ دے رہے تھے وہ بھی اسے چھوڑ کر بھاگ گئے اور ۱۰ صفر کی فیصلہ کن جنگ میں ایک قلیل جماعت

کے سوا کوئی اسکے ساتھ نہ رہا۔ بعض لوگوں نے رائے دی کہ بنگال یا دکن کی طرف بھاگ جائے اور پھر طیاری کر کے قسمت آزمائی کرے، مگر اس نے کہا کہ دارا شکوہ اور محمد شجاع نے بھاگ کر جو انجام دیکھا وہی مجھے بھی دیکھنا پڑیگا، آخر کار اس نے جنگ کی اور دوران جنگ میں اس کا ہاتھی ایک گولہ کھا کر دریائے راوی کی طرف ایسا بھاگا کہ پھر نہ اسکا پتہ چلا نہ اس کے سوار کا۔ اسکے بعد اس کا بڑا بیٹا محمد کریم بھی گرفتار ہوا اور قتل کر دیا گیا۔

رفیع الشان اور جہاں شاہ کا خاتمہ

جنگ ختم ہونے کے بعد دونوں چھوٹے شاہزادوں نے معاہدہ کے مطابق اموال غنیمت کی تقسیم کا مطالبہ کیا۔ مگر ذوالفقار خاں کی نیت کبھی ان عہدوں اور قسموں کو پورا کرنے کی تھی ہی نہیں۔ اس نے کچھ دن ٹالنے کے بعد ان کو صاف جواب دیدیا اور ان کے لئے لڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ تاہم وہ دونوں ملکر نہ لڑے۔ پہلے جہاں شاہ میدان میں اترا اور ۱۸ اور ۱۹ صفر کو اس سے جنگ ہوئی جسمیں جہاندار شاہ کی فوج منتشر ہو گئی اور وہ اپنی معشوقہ لال کنور کو ساتھ لیکر میدان جنگ سے بھاگ نکلا، مگر عین موقع پر ذوالفقار خاں نے بڑھ کر نقشہ بدل دیا اور اسکے ایک ہی حملہ میں جہاں شاہ شکست کھا کر مارا گیا۔ اب دوسرے مدعی رفیع الشان کی باری تھی جو اس دوران میں الگ کھڑا تماشا دیکھتا رہا تھا اور اس کے نجومی اسے یقین دلا رہے تھے کہ آخر کار تخت اسی کے حصہ میں آئے گا۔ ۲۰ صفر کو ذوالفقار خاں نے حملہ کر کے اس کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اور ۲۱ صفر سنہ ۱۱۲۴ھ (۲۹ مارچ سنہ ۱۷۱۲ء) کو ابو الفتح محمد معز الدین جہاندار شاہ کی شہنشاہی کا باقاعدہ اعلان ہو گیا۔

۴ - جہاندار شاہ دور حکومت

ذوالفقار خاں نے بہادر شاہ کے بیٹوں میں سے سب سے زیادہ نالائق بیٹے کو یہ سمجھ کر تخت کے لئے انتخاب کیا تھا کہ وہ ایک عیش پسند شخص ہے، امور سلطنت سے واسطہ نہ رکھے گا، محل سرا میں اسکی حکومت رہیگی، اور ہندوستان پر میری۔ لیکن جو شخص اپنے ملک اور اپنی قوم کے نقصان میں اپنا نفع تلاش کرتا ہے اسے نقصان کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اس نے اپنی اس حرکت سے سلطنت اور ملک کو بھی تباہ کیا اور اپنے آپ کو بھی۔

سلطنت کے پرانے ارکان کی تباہی اور نئے ارکان کی نااہلی

تخت نشینی کے بعد جہاندار شاہ نے ذوالفقار خاں وزیر اعظم اور اسکے سکرٹری سبھاچند کو دیوان خالصہ شریفہ مقرر کیا، مگر اسکے سوا جتنے اہم عہدے تھے، سب ایسے لوگوں کو دے جو اسکے مخالف تھے۔ خصوصیت کے ساتھ جو انتظام ذوالفقار خاں کے لئے سخت نامطبوع تھا کہ جہاندار شاہ نے اپنے برادر رضاعی کوکلتاش خاں علی مراد کو خانجہاں کا خطاب دیکر امیر الامرا میر بخشی بنایا اور اسکے بہنوئی خواجہ حسین (یا خواجہ حسن) کو خان دوراں کا خطاب دیکر بخشی دوم مقرر کیا۔ بچپن میں کوکلتاش خاں سے اس نے وعدہ کیا تھا کہ جب میں بادشاہ ہوں گا تو تجھے وزیر بناؤں گا۔ اس وقت سے یہ وزارت کی امید رکھتا تھا۔

اب جو ذوالفقار خاں کو وزارت دی گئی تو یہ اور اس کا تمام خاندان آتش زیر پا ہو گیا، اور اس نے ہر معاملہ میں وزیر کی مخالفت کرنا اپنا

فرض قرار دے لیا۔ فطری طور پر اس کا بہنوئی خواجہ حسین خاں دوراں اس معاملہ میں اسکے ساتھ تھا۔ یہ دونوں شخص فوج کے انتظام اور جنگ کے قواعد و اصول سے قطعی ابلد تھے، اور اتنی قابلیت بھی نہ رکھتے تھے کہ فوج میں ان کو کوئی ادنیٰ عہدہ دیا جاتا۔ مگر فوج کلیتہً انہیں کے اختیار میں دیدی گئی، انھوں نے ذوالفقار خاں جیسے آزمودہ کار سپہ سالار کی رائے کے خلاف عمل کرنا شروع کر دیا، اور بادشاہ انکی ہمت افزائی کرنے لگا۔ اس کے نتائج تھوڑے ہی عرصہ بعد ایسے خوفناک نکلے کہ بادشاہ اور خانجہاں اور خان دوراں اور ذوالفقار خاں سب کے سب تباہی کے ایک ہی چکر میں فنا ہوگئے۔

مخالف شاہزادوں کے ساتھ جتنے نامور سردار تھے، اور جو سب کے سب عالمگیر کے زمانہ سے سرداری کے مرتبوں پر فائز تھے، انمیں سے اکثر کو پکڑ پکڑ کر ہلاک کر دیا گیا اور جو بچ گئے انہیں تباہ ہونے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ رستم دل خاں، مخلص خاں، الہ وردی خاں وغیرہ سخت عذاب کے ساتھ قتل کئے گئے، مہابت خاں (سابق وزیر منعم خاں کا بیٹا) حمید الدین خاں (جو عالمگیر کے زمانہ میں کوتوال تھا اور بادشاہ کے بڑے مقرب لوگوں میں سے تھا) سرفراز خاں، امین الدین خاں سنبھلی وغیرہ قید کر دیے گئے۔ اس قحط الرجال میں ایسے ایسے کام کے لوگوں کو محض اس قصور پر ضائع کر دینا کہ انھوں نے خانہ جنگی میں مخالف شاہزادوں کا ساتھ دیا تھا، انتہا درجہ کا احمقانہ فعل تھا۔ اس سے پہلے بہادر شاہ اور اعظم کی خانہ جنگی میں بھی بہت سے امرا اعظم کے ساتھ شریک تھے، مگر بہادر شاہ نے فتحیاب ہونے کے بعد یہ کھکر

ان سب کو معاف کر دیا کہ "ایسے حالات میں لوگ ایک نہ ایک جانب حصہ لینے پر مجبور ہی ہوتے ہیں۔ اگر خود میرے بیٹے دکن میں ہوتے تو انہیں اپنے چچا کا ساتھ دینا پڑتا۔"

بادشاہ کی سفلہ نوازی جمادی الاولیٰ ۱۱۲۴ھ (جون ۱۷۱۲ء) میں جہاندار شاہ لاہور سے دہلی پہنچا اور اب ایک نالائق عیش پسند شخص کو بادشاہ بنانے کے نتائج ظاہر ہونے لگے۔ بادشاہ نے لال کنور کو امتیاز محل کا لقب دیکر سلطنت کے خزانے اور مناصب و مراتب سب کے سب اسکے لیے اور اسکے متعلقین و متوسلین کے لیے وقف کر دیے۔ اہل فضل و کمال پر شاہی عنایات کا دروازہ بند، اور ڈوم ڈھاڑیوں، سفلوں اور اوباشوں پر لطف و کرم کا دریا جاری کر دیا۔ لال کنور کے رشتہ داروں کو جو سب گوّیے اور سازندے تھے پنج ہزاری اور ہفت ہزاری منصب دیئے اور خطابات اور نوبت و علم سے سرفراز کیا[لہ]۔ اسکے حقیقی بھائی خوشحال خاں کو آگرہ کی اور چچازاد بھائی نعمت خاں کی

[لہ] جہاندار شاہ نے خطابات و مناصب کا معیار اتنا گرا دیا تھا کہ ادنیٰ ادنیٰ خادموں کو معمولی خدمات پر وہ خطابات اور منصب عطا کر دیتا تھا جو کسی زمانہ میں بڑے بڑے امرا کو سالہا سال کی خدمات کے بعد ملتے تھے۔ مثال کے طور پر محلسرا کی ایک قلماقنی شادمان نامی کو اس نے رضا بہادر رستم ہند کا خطاب اور پنج ہزاری منصب صرف اس خدمت کے صلہ میں عطا کیا تھا کہ ایک مرتبہ جب کچھ لوگوں نے جہاندار شاہ کو قتل کرنے کی کوشش کی اس نے بروقت شور مچا کر محل والوں کو بیدار کر دیا اور لوگوں کے آنے تک وہ حملہ آوروں سے تنہا لڑتی رہی۔

کو ملتان کی صوبہ داری دی۔ خود لال کنور کے خانگی مصارف کے لئے دو کرور سالانہ کی جاگیر مقرر کی، اسے شاہی چتر اور علم و نقارہ استعمال کرنے کا حق دیا، اسکے نام کا سکہ جاری کیا اور اسکو اتنا نوازا کہ جہانگیر نے نورجہاں کو بھی نہ نوازا تھا۔ اس کی خواہشات پوری کرنے میں وہ جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے جمنا میں آدمیوں سے بھری ہوئی کشتی جاتے دیکھ کر حسرت سے کہا کہ میں نے آجتک کشتی ڈوبتے ہوئے نہیں دیکھی۔ یہ سنتے ہی بادشاہ نے حکم دیا اور وہ کشتی اسکی آنکھوں کے سامنے لاکر ڈبو دی گئی۔ عالمگیر کی بیٹی اور جہاندار شاہ کی پھوپھی زینت النسا بیگم نے لال کنور کے پاس حاضر ہونے سے انکار کیا تو جہاندار نے اونکی صورت تک دیکھنی گوارا نہ کی۔ خود جہاندار کے اپنے بیٹے اعزالدولہ اور معزالدولہ لال کنور کو ناپسند تھے، اسلئے باپ نے انکو قید کر دیا۔

شاہانہ رعب و وقار کا خاتمہ تمام شاہی آداب و مراسم بالائے طاق رکھ کر یہ ۵۲ برس کا بوڑھا عاشق اپنی معشوقہ اور اسکے ساتھی گویّوں اور سازندوں کے ساتھ بیٹھ کر شرابیں پیتا گاتا، ناچتا اور وہ لوگ مدھوش ہونے کے بعد اس سے دھول دھپّے تک کا مذاق کر بیٹھتے۔ وہ لال کنور کے ساتھ رتھ میں بیٹھ کر بازاروں میں نکلجاتا اور شراب خانوں میں پہنچتا۔ ایک مرتبہ ان دونوں نے ایک مے خانے میں جاکر خوب شراب پی اور مدھوش ہوگئے، چلتے وقت ساقی کو ایک گاؤں جاگیر میں مرحمت ہوا، رتھ میں سوار ہونے کے بعد دونوں سوگئے، محل پر پہنچے تو لال کنور کو مامائیں اٹھا کر لے گئیں اور بادشاہ کو

اٹھانا کسی کو یاد نہ رہا، رتھ بان نے لیجا کر رتھ گاڑی خانے میں رکھ دی، رات کا بڑا حصہ گذرنے کے بعد محل میں بادشاہ کی جستجو شروع ہوئی، اور بڑی تلاش کے بعد سلطنت ہند کا تاجدار محل سے دو میل کے فاصلے پر گاڑی خانے کے اندر ایک رتھ میں پڑا ہوا پایا گیا۔ عالمگیر کی وفات کو ابھی پانچ برس سے زیادہ نہ ہوئے تھے، اتنی قلیل مدت میں یہ زمین و آسمان کا فرق دیکھکر لوگ بادشاہ سے اسقدر بیزار ہوگئے تھے کہ جب وہ نکلتا تو کوئی اس کا ادب نہ کرتا اور کوئی معزز امیر اس کی مشایعت نہ کرتا۔

وزیر کی عیاشی بادشاہ کو اسطرح زندگی کا "لطف" اٹھاتے دیکھکر ذوالفقار خاں کو بھی ۵۹ برس کی عمر میں عیاشی کا شوق ہوا اور خود حرمسرا کے مشاغل میں مشغول ہوکر اس نے سلطنت کا کاروبار سبھا چند کے حوالہ کر دیا جسکی بدزبانی و فحش گوئی سے ایک عالم نالاں تھا۔ خود ذوالفقار خاں کے اخلاق و خصائل بھی وہ نہ رہے جو عالمگیر کے زمانہ میں تھے اب وہ ایک تنگ حوصلہ، تنگ نظر اور حاسد شخص ہوگیا تھا، لوگوں کو فائدہ پہنچانے سے اسکو تکلیف ہوتی تھی، کسی کو ابھرتے دیکھکر اسے مدد دینے کے بجائے گرانے کی فکر کرتا تھا، اور اسکی وعدہ خلافیاں اور دروغ گوئیاں زبان زد عوام تھیں۔ یا وہ زمانہ تھا جبکہ یہی ذوالفقار خاں عالمگیر کا ایک بہترین جنرل اور نامور مدبر شمار ہوتا تھا، یا اب یہ زمانہ آیا کہ اس کا وجود سلطنت کے لئے نقصان دہ ہوگیا، اور اسکی قابلیت ناقابلیت سے اور نیک نامی بدنامی سے بدل گئی۔

وزیر اور بادشاہ کی مخالفت تاہم ذوالفقار خاں میں اتنا ہوش اب بھی باقی تھا کہ وہ جہاندار شاہ کو اسکی تباہ کن حرکات سے روکتا اور بعض اوقات لال کنور اور اسکے عزیزوں تک کے مقابلہ پر اتر آتا تھا۔ لال کنور کے چچازاد بھائی نعمت خاں کلاونت[1] کو جب ملتان کی صوبہ داری کی سند دی گئی تو ذوالفقار خان نے اسکی سند جاری نہیں کی، اور حق التحریر کے طور پر اس سے چند ہزار طنبورے اور ڈھول طلب کئے۔ اس نے لال کنور کے ذریعہ بادشاہ سے اسکی شکایت کی۔ بادشاہ نے ذوالفقار خاں سے ذکر کیا۔ اس نے جواب دیا کہ صوبوں کا انتظام اور مہام بادشاہی کا انصرام امراء خاندانی کا کام تھا، اور گانا بجانا رقاصوں اور کلاونتوں کا کام۔ اب اگر وہ کام ان سے لیا جاتا ہے، تو خاندانی امراء کے لئے ڈھول تاشے ہی مہیا کردے جائیں تاکہ یہ غریب گا بجا کر ہی کچھ کما کھائیں۔ لال کنور کے حقیقی بھائی خوشحال خاں، نے نئی نئی دولت اور نوابی کے نشے سے بدمست ہوکر شرفا کی بہو بیٹیوں پر دست درازیاں شروع کردی تھیں۔ ایک دفعہ اسی قسم کی ایک بیہودہ حرکت کی شکایت ذوالفقار خاں سے کی گئی تو اس نے سپاہی بھیج کر خوشحال خاں کو کشاں کشاں بلوایا اور اپنے سامنے اتنا پٹوایا کہ بیہوش ہوگیا، پھر اسے قلعہ سلیم گڈھ میں قید کردیا اور اسکے اموال ضبط کرلئے۔

---

[1] بعض لوگوں نے اس واقعہ کو نعمت خاں کے بجائے خوشحال خاں، لال کنور کے حقیقی بھائی کی طرف منسوب کیا ہے جسے آگرہ کی صوبہ داری دی گئی تھی

چین قلیچ خاں کا واقعہ اس سے زیادہ اہم واقعہ وہ ہے جو چین قلیچ خاں کے ساتھ پیش آیا۔ دھلی کی ایک کنجڑن لال کنور کی دوگانہ بنی ہوئی تھی۔ ملکۂ ہند ہونے کے بعد لال کنور نے اسکو زہرہ بیگم بنادیا اور وہ صاحب جاگیر ہوگئی۔ وہ جب ہاتھی پر سوار ہوکر لال کنور سے ملنے کے لئے قلعہ جاتی تو اسکے ساتھ ملازموں کا ایک جم غفیر ہوتا، اور یہ لوگ راستے میں بلا لحاظ شریف و وضیع ہر شخص کو چھیڑتے ہوئے چلتے۔ ایک مرتبہ چین قلیچ خاں بہادر کی سواری کا آمنا سامنا ہوگیا۔ چین قلیچ خاں اس زمانہ میں امارت چھوڑ کر فقر و درویشی اختیار کر چکے تھے۔ انکی سواری کے ساتھ گنتی کے چند آدمی تھے۔ زہرہ کے ملازموں نے انکو بھی چھیڑا اور جب اسکی سواری چین قلیچ خاں کے قریب پہنچی تو اس نے پردے سے منہ نکال کر کہا کہ "اندھے (فیروز جنگ) کا بیٹا چین قلیچ خاں تو ہی ہے نا"۔ اس بیہودگی پر ان کو غصہ آگیا اور انھوں نے اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ اس کو اور اسکے ہمراہیوں کو سزا دیں۔ اشارہ پاتے ہی سپاہی تلواریں سونت کر حملہ آور ہوئے اور اسکے ہمراہیوں کو مارنے کے بعد انھوں نے خود زہرہ کو بھی ہاتھی سے اتار کر خوب لات گھونسے سے اسکی خبر لی۔ اسکے بعد چین قلیچ خاں سیدھے ذوالفقار خاں کے پاس پہنچے اور اسکو سارا واقعہ سنادیا۔ ذوالفقار خاں نے اسی وقت بادشاہ کو کہلا بھیجا کہ "ہم سب خانہ زادوں کی آبرو ایک ہے، اور میں اس معاملہ میں چین قلیچ خاں کے ساتھ ہوں"۔ اس پیغام سے بادشاہ کو کچھ کرنے کی جرأت نہ ہوسکی، ورنہ لال کنور نے اسے آمادۂ انتقام کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ اسی قسم کے واقعات

نے ایک طرف تمام امرا و اعیان سلطنت کو بادشاہ سے نفور کر دیا تھا، اور دوسری طرف بادشاہ اور وزیر کے درمیان روز بروز کشیدگی بڑھتی جاتی تھی۔

مشرق میں فرخ سیر کی تحریک۔ جبکہ دار السلطنت میں حالات اس ڈھنگ پر جاری تھے، مشرق کی جانب ایک اور انقلاب کی طیاری ہو رہی تھی۔ بہادر شاہ کی وفات کے بعد جو خانہ جنگی ہوئی تھی انہیں شاہزادہ عظیم الشان اور اسکے بڑے بیٹے محمد کریم کے مارے جانے کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ عظیم الشان عالمگیر کے زمانہ میں بنگال اور بہار کا صوبہ دار تھا۔ وفات سے کچھ مدت قبل جب عالمگیر نے اسکو احمد نگر بلایا تو وہ اپنے دوسرے بیٹے فرخ سیر[1] کو بنگال میں چھوڑ آیا تھا۔ بہادر شاہ کے عہد میں عظیم الشان کو اپنے ان صوبوں کی طرف جانے کا موقع نہیں ملا، اور نوجوان فرخ سیر باپ کی نگرانی سے دور بنگال ہی میں رہا۔ ۱۱۲۲ھ میں دکن سے واپس ہو کر بہادر شاہ نے اعز الدولہ خان عالم (ابن خانجہاں کوکلتاش عالمگیری) کو نائب صوبہ دار بنگال بنا کر بھیج دیا، اور فرخ سیر کو اپنے پاس طلب کیا، چنانچہ وہ راج محل سے روانہ بھی ہو گیا، مگر وہ باپ اور دادا کے پاس جانا نہ چاہتا تھا، اسلئے اس نے اپنے سفر میں بہت تساہل سے کام لیا، یہاں تک کہ جب وہ پٹنہ میں تھا تو اسے

---

[1] یہ شاہزادہ ۹ رمضان ۱۰۹۴ھ (۱۱ ستمبر ۱۶۸۳ء) میں بمقام اورنگ آباد دکن پیدا ہوا تھا۔

بہادر شاہ کی وفات کی خبر پہنچی اس نے کسی مزید ہدایت کا انتظار کئے بغیر پٹنہ میں اپنے باپ عظیم الشان کی بادشاہی کا اعلان اور اسکے نام کا سکہ وخطبہ جاری کر دیا۔ مگر اسکے چند ہی روز بعد اسے اطلاع ملی کہ عظیم الشان جہاندار شاہ سے شکست کھا کر بے نشان ہو گیا۔ اول اول تو وہ سخت پریشان ہوا اور دکن یا بنگال کی طرف بھاگنے کی فکر کرنے لگا، مگر اسکی ماں اور بعض دوستوں نے اسے قسمت آزمائی کرنے کا مشورہ دیا، اور اس نے کسی ساز و سامان اور طیاری کے بغیر ربیع الاول ۱۱۲۴ھ (اپریل ۱۷۱۲ء) میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ اسوقت اسکے ساتھ ۴ سو آدمیوں سے زیادہ کی جمعیت نہ تھی۔ طاقتور امرا جنکو اس کے باپ نے بڑھایا تھا اسکی مدد کے لئے طیار نہ تھے۔ مرشد قلی خاں دیوان بنگال، اعز الدولہ خان عالم نائب صوبہ بنگال، سربلند خاں[1] علی اصغر خاں فوجدار اٹاوہ، چھبیلہ رام ناگر فوجدار کڑہ مانک پور غرض سب نے اس سے منہ موڑ لیا۔ اس حالت میں اس نے سید حسین علی خاں صوبہ دار عظیم آباد (پٹنہ) سے مدد کی درخواست کی، اسکی ماں نے انتہائی الحاح و زاری کے ساتھ اس سے التجائیں کیں اور ان باتوں سے متاثر ہو کر نہ صرف وہ خود فرخ سیر کی حمایت پر آمادہ ہو گیا، بلکہ اس نے اپنے بڑے بھائی سید حسن علی خاں صوبہ دار الہ آباد کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔

سادات بارہ فرخ سیر کی حمایت پر

یہ دونوں بھائی جو تاریخ میں "بادشاہ گر" مشہور ہیں، اعاظم سادات بارہ سے تھے،

---

[1] یہ شخص عظیم الشان کا ہم زلف تھا، اور اسی رشتہ کی بدولت سے ترقی حاصل ہوئی تھی

اور سادات بارہہ وہ لوگ تھے جنکی شجاعت و شمشیر زنی اکبر بادشاہ کے زمانہ سے شہرۂ آفاق تھی۔ ان کا باپ سید عبد اللہ خاں عالمگیر کے زمانہ میں بیجاپور اور اجمیر کی صوبہ داریوں پر رہ چکا تھا، اور اخیر زمانہ میں شاہزادہ محمد معظم کی ملازمت میں تھا۔ سید حسن علی خاں عالمگیر کے زمانہ میں سلطان پور، ندربار (یا نذربار)، سیونی، اور اورنگ اباد دکن کی فوجداریوں پر، اور سید حسین علی خاں رنتھبور اور ہنڈورہ بیانہ کی فوجداریوں پر رہ چکا تھا۔ ١١٠٦ھ / ١٦٩٤-٩٥ء میں جب عالمگیر نے شاہزادۂ معز الدین (جہاندار شاہ) کو ملتان کی صوبہ داری پر مقرر کیا تو یہ دونوں بھائی اسکے ساتھ بھیجے گئے، مگر اس سے انکی نہ بنی اور یہ بگڑ کر لاہور چلے گئے۔ یہ جہاندار شاہ سے انکی مخالفت کی ابتدا تھی۔ عالمگیر کی وفات کے بعد جب شاہ عالم بہادر شاہ حصول تخت کی جد و جہد کے لئے پشاور سے لاہور پہنچا تو اس نے ان دونوں کو سہ ہزاری اور دو ہزاری منصب (علی الترتیب) دے کر اپنے ساتھ لے لیا اور جنگ جاجو میں، انھوں نے بڑی جانفشانی دکھائی، جسکے صلہ میں ان دونوں کو چہار ہزاری منصب دیا گیا اور بڑے بھائی حسن علی خاں کو سید عبد اللہ خاں کا خطاب دیا گیا۔ لیکن بادشاہ کے بیٹے جہاندار شاہ اور وزیر اعظم کے بیٹے زمانہ زاد خاں سے مخالفت ہونے کے باعث انکو کوئی عہدہ نہ مل سکا، اور یہ ایک مدت تک بیکار رہے۔ آخر فرخ سیر کے باپ شاہزادہ عظیم الشان نے انکی حمایت کی اور سید عبد اللہ خاں کو اپنے نائب کی حیثیت سے الہ آباد کے صوبہ پر اور سید حسین علی خاں کو بہار کے صوبہ پر مقرر کر دیا۔ یہ فرخ سیر کے ساتھ ان کی موافقت کی ابتدا تھی۔ جہاندار شاہ نے تخت نشین ہونے

کے بعد سید عبداللہ خاں کو الٰہ آباد سے معزول کر کے سید راجی محمد خاں کو اسکی جگہ مامور کیا، اور نئے صوبہ دار نے ایک شخص سید عبدالغفار خاں کو اپنا نائب بنا کر بھیجا۔ مگر عبداللہ خاں نے اسکا مقابلہ کیا اور اسے شکست دے کر بھگا دیا۔ اب جہاندار شاہ نے اپنے اس فعل کی تلافی کرنی چاہی اور عبداللہ خاں کو صوبہ داری کا پروانہ بھیج دیا۔ لیکن اسکے دل میں جو گرہ پہلے سے پڑی ہوئی تھی۔ وہ اور مضبوط ہو گئی، اور اس نے فرخ سیر کی تائید وحمایت کے لئے حسین علی خاں کی دعوت کو قبول کر لیا۔

فرخ سیر کے دوسرے حامی اسی زمانہ میں فرخ سیر کے ساتھ کچھ لوگ اور بھی شامل ہو گئے جنہوں نے بعد کے واقعات میں نمایاں حصہ لیا انمیں سے ایک خواجہ عاصم تھا جو ابتداءً عظیم الشان کے والاشاہیوں میں شامل تھا، فرخ سیر کے ساتھ بچپن سے اسکے تعلقات تھے۔ اور وہ پہلوانی، تیراندازی، چوگان بازی شہسواری اور اسی قسم کے دوسرے کھیلوں میں اسکا شریک رہتا تھا۔ اسکے تعلقات یہاں تک بڑھ گئے تھے کہ فرخ سیر کے دوسرے ساتھیوں نے عظیم الشان کو اسکی شکایات لکھ کر بھیجیں اور اس نے بہادر شاہ کی وفات سے کچھ عرصہ قبل اسکو لاہور بلا لیا۔ جہاندار شاہ اور عظیم الشان کی لڑائی کے موقع پر یہ شخص موجود تھا۔ عظیم الشان کے مارے جانے کے بعد جان بچا کر آگرہ کی طرف بھاگا اور وہاں سے سیدھا فرخ سیر کے پاس پہنچا، یہاں پھر وہی تعلقات تازہ ہو گئے اور فرخ سیر نے اسے اشرف خاں کا خطاب دیکر داروغگی دیوان خاص و داروغگی توپخانہ کا عہدہ دیا اور پھر اپنے خاص دوستوں میں شامل کر لیا۔ چونکہ آدمی پورا دربار دار تھا، کم علمی کے باوجود اپنی خوش گفتاری

اور ظاہری شائستگی سے دوسروں پر اثر قائم کر لیتا تھا، اسلئے اسے فرخ سیر کے مزاج میں بڑا دخل حاصل ہو گیا۔ ایک دوسرا شخص عبید اللہ نامی تورانی الاصل تھا، اوائل عمر میں ہندوستان آیا، ملا آدمی تھا، عالمگیر نے اسکو پہلے جہانگیر نگر (ڈھاکہ) اور پھر عظیم آباد (پٹنہ) کا قاضی مقرر کیا۔ اسی زمانہ میں عظیم الشان اور خصوصاً فرخ سیر سے اسکے تعلقات قائم ہوئے، اور نوجوان شاہزادے پر اس نے بہت گہرا اثر جما لیا۔ بعد میں اس کو شریعت اللہ خاں کا خطاب مل گیا تھا۔ ان دونوں اشخاص نے آیندہ تاریخ میں جو حصہ لیا ہے اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

فرخ سیر کی پہلی کامیابی جہاندار شاہ کو جب پیہم خبریں پہنچیں کہ بہار اور الہ آباد کے صوبہ دار فرخ سیر کی حمایت پر کھڑے ہو گئے ہیں، اور وہ تخت حاصل کرنے کے لئے ایک زبردست مقابلہ کی طیاری کر رہا ہے، تو اس نے اپنے بڑے بیٹے اعز الدین کو جمادی الآخری ۱۱۲۴ھ (جولائی ۱۷۱۲ء) ۵۰ ہزار فوج کے ساتھ آگرہ کی جانب بھیجا، تاکہ وہ فرخ سیر کی پیش قدمی کو بروقت روک سکے۔ لیکن لال کنور کے ساتھ اسکے تعلقات ناخوشگوار تھے، اور اسکے اثر سے بادشاہ بھی اس سے ناراض تھا، اسلئے خواجہ حسین خاں دوراں، اور لطف اللہ خاں صادق کو اسکی اتالیقی پر مامور کر دیا گیا۔ ذوالفقار خاں نے اس انتظام کی سخت مخالفت کی کیونکہ دونوں اتالیق فن حرب سے قطعی نابلد تھے اور خان دوراں نے تو میدان جنگ کی صورت بھی نہ دیکھی تھی۔ خود شاہزادہ اعز الدین اس پہ بہت آزردہ ہوا کہ فوج کی قیادت میں اسکے ساتھ دو آدمیوں کو شریک بلکہ شریک غالب کر دیا گیا، مگر کوکلتاش خاں کے اثر سے بادشاہ نے وزرا اور شاہزادے دونوں کی

رائے کے خلاف عمل کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اعزالدین بددل ہو گیا، اور عملاً فوج کی قیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں رہی جو ۵۰ ہزار فوج تو درکنار، ۵۰ آدمیوں کو بھی لڑانے کی قابلیت نہ رکھتے تھے۔

شعبان (ستمبر) میں فرخ سیر پٹنہ سے ۲۵ ہزار فوج کے ساتھ روانہ ہوا، راستہ میں حسین علی خاں اور سید عبد اللہ خاں اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ اس سے مل گئے، اور متحدہ فوج آگرہ کی طرف روانہ ہوئی۔ ادھر اعزالدین آگرہ میں بیٹھا وقت ضائع کر رہا تھا، دھلی سے اسکو پیشقدمی کے لیے پے۲ احکام بھیجے گئے، مگر اس نے جنبش تک نہ کی۔ آخر جب تقاضے حد سے بڑھ گئے تو وہ آگرہ سے "آہستہ خرام بلکہ مخرام" کی نصیحت پر عمل کرتا ہوا روانہ ہوا۔ یہ بددلی اسکی ساری فوج میں سرایت کر چکی تھی، حتیٰ کہ فوج اور توپخانہ کے بہت سے افسر ایسے تھے جو فرخ سیر کے حامیوں کے ساتھ خفیہ خط و کتابت کر رہے تھے، اور انھوں نے یہ سازش کر لی تھی کہ مقابلہ کے وقت وہ ۲۰ ہزار آدمیوں کو ساتھ لیکر فرخ سیر کی فوج سے جا ملینگے۔ غرض اس حالت میں دونوں حریف ایک دوسرے کی طرف بڑھتے رہے یہاں تک کہ شوال کے آخر میں کھجوہ پر (الٰہ آباد اور اٹاوہ کے درمیان)، دونوں ایک دوسرے کے مقابلہ خیمہ زن ہوئے۔ ۲۹ شوال (۲۸ نومبر) کا دن جنگ کے لئے مقرر ہوا۔ مگر ۲۸ اور ۲۹ کی درمیانی شب کو مجلس مشاورت منعقد ہوئی جسمیں خواجہ حسین خاں دوراں اور لطف اللہ خاں صادق نے شاہزادہ کو بھاگ جانے کا مشورہ دیا۔ اس نے بھاگنے سے انکار کیا، اور جواب دیا کہ آجتک تیموری نسل کا کوئی شخص لڑے بغیر میدان سے نہیں ہٹا ہے۔ اس پر خان دوران نے لال کنور اور

کوکلتاش خاں کے جعلی خطوط پیش کئے جنمیں لکھا تھا کہ "بادشاہ مرچکا ہے، اگر شاہزادہ اعز الدین فوراً پہنچ جائے تو تخت اسکو مل جائیگا"۔ اس کا وہی اثر ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ آدھی رات کو اعز الدین اور اسکے دونوں اتالیق گنتی کے چند آدمیوں کو ساتھ لیکر میدان جنگ سے بھاگ گئے، اور شہزادہ فوج، خزانہ، سازوسامان سب کچھ دشمن کے رحم پر چھوڑ گئے۔

مقابلہ کیلئے جہاندار شاہ کی طیاری جہاندار شاہ کو اس غداری کا حال معلوم ہوا تو وہ خواب غفلت سے چونکا اور اس نے خود غنیم کے مقابلہ پر جانے کا ارادہ کیا۔ غداروں نے مشورہ دیا کہ دور جانے کی ضرورت نہیں، تغلق آباد پر (جو دھلی سے ۸ میل جانب جنوب واقع ہے) مقابلہ کرنا چاہئے۔ مگر اس نے آگرہ جانیکا فیصلہ کرلیا، اور فوج کی طیاری کا حکم دیا۔ فوج کا حال یہ تھا کہ گیارہ مہینہ سے اسکو تنخواہ نہیں ملی تھی، سامان جنگ اور ضروری آلات و اسباب کی سخت قلت تھی۔ خزانہ میں جسقدر دولت جمع تھی سب بادشاہ کے مشاغل کی نذر ہو چکی تھی، زمینداروں اور عاملوں نے انقلاب کے آثار نمایاں، اور مرکزی حکومت کی کمزوری آشکار دیکھ کر محاصل ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا، اور تقریباً ایک سال سے سلطنت کے خزانہ میں ہندوستان کے مختلف اقطاع سے کوئی آمدنی داخل نہ ہو سکی تھی۔ لیکن اب فوج فراہم کرنی ضروری تھی، اسلئے خزانہ کی بچی کھچی رقم خرچ کرنے کے بعد سونے چاندی کے آلات و ظروف، جواہر کے زیورات اور سامان، حتیٰ کہ چھتوں اور دیواروں کے سنہری نقوش تک اکھیڑ اکھیڑ کر فروخت کر ڈالے گئے، اور جب انسے بھی کام نہ چلا تو شاہی گوداموں کے دروازے کھول دئے گئے اور روپے کے بدلے سپاہیوں کو سامان تقسیم کر دیا گیا۔

ان طریقوں سے ۸۰ ہزار فوج مہیا کی گئی۔ ان طیاریوں کے دوران میں ضرورت محسوس ہوئی کہ کسی تجربہ کار شخص کو فوراً آگرہ کی حفاظت پر مامور کر دیا جائے تاکہ بادشاہ کے پہنچنے سے پہلے فرخ سیر اس پر قابض نہ ہو جائے۔ اس کام کے لئے شاہی امرا پر نظر دوڑائی گئی تو چین قلیچ خاں سے بہتر کوئی شخص نظر نہ آیا۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، چین قلیچ خاں شاہی دربار کا رنگ دیکھ کر بہادر شاہ کے عہد سے گوشہ نشین ہو چکے تھے، اور اس دوران میں صرف ایک مرتبہ انھوں نے سیاسیات میں حصہ لینے کی کوشش کی تھی یعنی بہادر شاہ کی وفات کے بعد وہ عظیم الشان کی حمایت کے لئے (جو فی الواقع بہادر شاہ کے بیٹوں میں سب سے بہتر تھا) ایک مختصر سی فوج لیکر دھلی سے ایک دو منزل تک گئے تھے، لیکن جب انکو جہاندار شاہ کی کامیابی کا حال معلوم ہوا تو فوراً دھلی واپس ہو گئے، اور پھر اسی گوشہ عزلت میں جا بیٹھے۔ پھر جب شاہزادہ اعزالدین کو فرخ سیر کے مقابلہ کے لئے بھیجا گیا تھا اور وہ آگرہ جا کر بیٹھ رہا تھا، تو اسوقت اسد خاں کی وساطت سے ذوالفقار خاں نے چین قلیچ خاں سے صفائی کر لی اور انکے سابق خطابات و مناصب بحال کر کے انہیں آگرہ بھیجا، مگر اتنے بڑے نامور جنرل کو اعزالدین جیسے ایک ناتجربہ کار لڑکے، اور خواجہ حسین اور لطف اللہ خاں صادق جیسے جاہل محض آدمیوں کے ماتحت کر کے یہ امید کرنا کہ وہ جنگ میں کوئی حصہ لیگا، ایک صریح احمقانہ فعل تھا، چنانچہ یہی ہوا کہ وہ خاموشی کے ساتھ آگرہ جا کر بیٹھ گئے اونھوں نے عملاً کچھ نہ کیا۔ اب دوبارہ انکو احکام بھیجے گئے کہ وہ آگرہ کی حفاظت کا ذمہ لیں۔ دوسری طرف محمد امین خاں چین بہادر کو بھی، جو تورانی امرا میں

حسین قلیچ خاں کے بعد سب سے زیادہ ممتاز تھا، سرہند سے واپس بلایا گیا اور شاہی فوج میں میمنہ کی قیادت پر مامور کیا گیا۔

جہاندار شاہ کی شکست ذی القعدہ ۱۱۲۴ھ (دسمبر ۱۷۱۲ء) کے وسط میں دارالسلطنت کا انتظام اسد خاں کے سپرد کرکے جہاندار شاہ ۸۰ ہزار فوج کے ساتھ آگرہ کی طرف روانہ ہوا، اور ذی الحجہ کی ابتدا میں آگرہ کے قریب سموگڈھ کے میدان میں خیمہ زن ہوا جہاں عالمگیر نے دارا شکوہ کو شکست دی تھی۔ دوسری طرف فرخ سیر بھی اس زمانہ میں اعتماد پور پہنچکر ٹھہر گیا جو سموگڈھ سے شمال مشرق میں پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ دونوں لشکروں کے درمیان جمنا حائل تھی۔ تقریباً ایک ہفتہ تک دونوں ایک دوسرے کے مقابل پڑے رہے اور کسی نے حرکت نہ کی۔ فرخ سیر نے اسلئے کہ اس کے پاس فوج کم تھی اور ساز و سامان نہ ہونے کے برابر تھا۔ اور جہاندار شاہ نے اسلئے کہ وہ خود کوئی رائے نہ رکھتا تھا اور اسکی فوج کے امرا میں باہم شدید عداوتیں تھیں۔ ذوالفقار خاں اور کوکلتاش خاں ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے، اور ایک جو رائے دیتا تھا دوسرا اسکی مخالفت کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ تیسری جماعت تورانی امرا کی تھی جسے یہ دونوں ابھرنے نہیں دیتے تھے اور انکی کوشش یہ تھی کہ یہ لوگ جنگ میں کار نمایاں نہ دکھا سکیں۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ محمد امین خاں اور حسین قلیچ خاں کے دلوں میں جہاندار شاہ کی حمایت کا جو تھوڑا بہت جذبہ پیدا ہوا تھا وہ پھر فنا ہو گیا، اور فرخ سیر کے دوست عبید اللہ خاں (شریعت اللہ خاں) نے خفیہ طور پر مراسلت کرکے ان دونوں کو اسکی حمایت و تائید پر راضی کر لیا۔ دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ ذوالفقار خاں اور کوکلتاش خاں کی مخالفت کے باعث دوسرے سے کوئی نقشہ جنگ ہی نہ بنایا

جا سکا، اور ایک ہفتہ تک شاہی فوج بے حرکت پڑی رہی۔ آخرکار سید عبداللہ خاں اور سید حسین علی خاں، بغیر اسکے کہ جانب مخالف کو انکی نقل و حرکت کی کوئی خبر ہوتی، اپنی تمام فوج لیکر جمنا پار کر آئے، اور ۱۳ ذی الحجہ (۱۷ جنوری ۱۷۱۳ء) کو جنگ ہوئی۔ ابتداءً جہاندار شاہ کا پلہ بھاری رہا اور فرخ سیر کی شکست یقینی نظر آنے لگی، مگر عین موقع پر سید عبداللہ خاں نے ایک طاقتور دستہ کے ساتھ خاص اس مقام پر حملہ کر دیا جہاں جہاندار شاہ موجود تھا، اور یہ چال ایسی کامیاب ہوئی کہ تھوڑے مقابلہ کے بعد جہاندار شاہ کی ہمت ٹوٹ گئی اور وہ لال کنور کو ساتھ لیکر میدان جنگ سے سیدھا دھلی کی طرف بھاگ نکلا۔ ذوالفقار خاں نے یہ نقشہ سوچا تھا کہ خود جنگ کے ہنگامہ سے الگ کھڑا تماشا دیکھتا رہے، اور جب کوکلتاش خاں اور اسکی جماعت لڑ کر ختم ہو جائے تو عین وقت پر مداخلت کر کے فتح کا سہرا اپنے سر باندھ لے۔ مگر جہاندار شاہ کے فرار سے اسکی یہ خود غرضانہ تدبیر ناکام ہوئی، اور وہ میدان جنگ میں اکیلا کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اسکے دوستوں نے مشورہ دیا کہ آپ خود فرخ سیر سے جنگ کریں اور اسے شکست دیکر سلطنت ہندوستان کے مالک بن جائیں۔ کیونکہ بادشاہی کسی کی میراث نہیں ہے۔ مگر اس نے کہا کہ "اس حرکت سے ہمیشہ کے لئے مجھ پر اور میرے خاندان پر نمک حرامی کا داغ لگ جائیگا"۔ بعض لوگوں نے رائے دی کہ دکن کی طرف بھاگ جائے اور داؤد خاں کی مدد سے از سر نو جد و جہد کرے، مگر بھاجند نے کہا کہ بوڑھے باپ کو دشمن کے ہاتھ میں چھوڑ کر خود بچ نکلنا جوانمردی کے خلاف ہے۔ آخر کو مجبور ہو کر بھی راتوں رات دھلی کی طرف فرار ہو گیا، اور اسطرح فرخ سیر کی فتح مکمل ہو گئی۔

۵ - فرخ سیر کا دورِ حکومت

۱۴ر ذی الحجہ (۱۱ر جنوری ۱۷۱۳ء) کو فرخ سیر نے باقاعدہ اپنی شہنشاہی کا اعلان کیا۔ چین قلیچ خاں، محمد امین خاں اور دوسرے امرا کو، جنھوں نے جہاندار شاہ کی حمایت سے عملاً احتراز کیا تھا، معاف کر کے اپنی ملازمت میں لیا۔ جزیہ کی معافی کا اعلان کیا اور سید عبداللہ خاں کو دھلی پر قبضہ کرنے کے لیے بعجلت روانہ کیا۔ چنانچہ وہ ۱۷ر کو آگرہ سے چل کر ۲۵ر کو دھلی کے قریب پہنچ گیا۔ دھلی میں اسد خاں اسوقت گورنر کی حیثیت رکھتا تھا۔ ذوالفقار خاں میدان جنگ سے بھاگ کر سیدھا اسکے پاس پہنچا اور اسکے بعد جہاندار شاہ بھی اسکی پناہ لینے کے لیے آ گیا۔ ذوالفقار خاں کی رائے یہ تھی کہ جہاندار شاہ کو لیکر ملتان یا کابل یا دکن بھاگ جائے، اور پھر ایک مرتبہ قسمت آزمائی کرے لیکن اسد خاں نے اسے ناپسند کیا، اور یہ شرمناک روش اختیار کی کہ جہاندار شاہ کو قید کر دیا اور سید عبداللہ خاں کو اپنی اور ذوالفقار خاں کی جانب سے اطاعت نامہ لکھ بھیجا۔ اسطرح بغیر کسی مشقت کے عبداللہ خاں کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ سابق بادشاہ اور اسکے حامی اسکے قابو میں آ گئے اور دار السلطنت پر اسکا قبضہ ہو گیا۔

اسد خاں اور ذوالفقار خاں کا حشر اسکے بعد خود فرخ سیر آگرہ سے روانہ ہوا اور ۱۵ر محرم کو دھلی کے قریب بارہ پلہ پر جا کر ٹھہرا۔ یہاں ذوالفقار خاں اور اسد خاں دست بستہ اسکے پاس معافی طلب کرنے کے لئے حاضر ہوئے۔ ان دونوں باپ بیٹوں سے سید عبداللہ خاں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اسکے توسط سے پیش ہوں گے تو وہ ان کو ضرور بچا لیگا۔ لیکن شریعت اللہ خاں

جو ایک سازشی فطرت کا تنگ دل اور پست خیال آدمی تھا، یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ قدیم امرا کے خاندانوں کو تباہ کرا دے، کیونکہ انکی موجودگی میں اس جیسے ادنیٰ درجہ کے آدمیوں کا چراغ جلنا مشکل تھا۔ اسلیے اس نے ایک طرف بادشاہ کو اسکے باپ عظیم الشان اور بھائی محمد کریم کا انتقام لینے پر اکسایا اور دوسری طرف ذوالفقار خاں اور اسد خاں کو قرآن کی قسمیں کھا کر یقین دلایا کہ اسکی سفارش سے وہ نہ صرف معاف کیے جائینگے، بلکہ ان کے مراتب و مناصب بھی بحال رہینگے۔ چنانچہ یہ دونوں باپ بیٹے اس دھوکہ میں آکر شریعت اللہ خاں کے توسط سے بادشاہ کے پاس حاضر ہو گئے، اور بادشاہ نے انکے ساتھ یہ سلوک کیا کہ ذوالفقار خاں کو قتل کرا دیا اور اسد خاں کو تمام جائداد اور اموال کی ضبطی کے بعد بوڑھاپے کے دن رو رو کر کاٹنے کے لئے جیتا چھوڑ دیا۔

دھلی میں فرخ سیر کا داخلہ دوسرے دن دھلی سے جہاندار شاہ کا سر بھی آ گیا، اور ۱۷ر محرم کو نیا بادشاہ اپنے دارالسلطنت میں اس شان کے ساتھ داخل ہوا کہ آگے آگے وہ تھا اور اسکے پیچھے پیچھے ایک ہاتھی پر اس شخص کا سر جا رہا تھا جو مہینہ بھر پہلے تک اس ملک کا بادشاہ تھا، دوسرے ہاتھی پر سابق بادشاہ کی لاش رکھی تھی اور اسکی دُم سے سابق وزیر ذوالفقار خاں کی لاش بندھی ہوئی لٹک رہی تھی، اور سب کے پیچھے ایک پالکی میں ۹۰ برس کا بوڑھا اسد خان جو ۳۰ برس تک عالمگیر بادشاہ کا وزیر اعظم رہا تھا اور جس نے شاہجہاں کی آنکھیں دیکھی تھیں بحالِ تباہ و خراب جا رہا تھا۔[1] یہ عبرتناک جلوس تمام دھلی کی اشک بار

---

[1] یہ خاندان جو اسطرح تباہ ہوا امرائے سلطنت میں معزز ترین خاندان تھا۔ اسد خاں، یمین الدولہ آصف خان کا داماد، شاہجہاں کا ہم زلف، اور عالمگیر بادشاہ کا حقیقی خالو تھا۔ ذوالفقار خاں عالمگیر بادشاہ کا سگا خانہ زاد بھائی ہوتا تھا اور امیرالامرا شائستہ خاں کی بیٹی اس سے بیاہی ہوئی تھی جو عالمگیر کی ماموں زاد بہن ہوتی تھی۔

آنکھوں کے سامنے سے گذرا اور لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ اب انکی حکومت کسی انسان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اسکے بعد فرخ سیر نے ان سب اشخاص کو جنھوں نے گذشتہ انقلاب میں حصہ لیا تھا، یا جن پر اس کا شبہ تھا، قید، قتل، اور اندھا کرانا شروع کردیا، اور اسکے مظالم سے لوگوں پر ایسی ہیبت طاری ہوگئی کہ عالمگیر اور بہادر شاہ کے امرا میں سے جب کوئی شخص اسکے دربار میں جانے لگتا تو اہل و عیال سے رخصت ہوکر جاتا، اور اگر زندہ واپس آجاتا تو صدقے اور نذریں دیتا۔

فرخ سیر کے امراء فرخ سیر نے سلطنت پانے کے بعد ان سب لوگوں کو اعلیٰ درجہ کا صلہ دیا جن کی مدد سے اس نے یہ کامیابی حاصل کی تھی۔ سید عبداللہ خاں کو قطب الملک یمین الدولہ، ظفر جنگ، سپہ سالار، یار وفادار کے خطابات دے اور اپنا وزیر اعظم بنایا سید حسین علی خاں کو عمدۃ الملک امیر الامرا، فیروز جنگ، سپہ سردار کے خطابات عطا کئے اور میر بخشی کا عہدہ دیا۔ خواجہ عاصم کو صمصام الدولہ خاں دوراں بہادر منصور جنگ کا خطاب اور بخشی والا شاہیان کا عہدہ عطا کیا۔ قاضی عبداللہ (شریعت اللہ خاں) کو معتمد الملک میر جملہ معظم خاں خانخاناں بہادر مظفر جنگ کا خطاب اور داروغگی دیوان خاص و داروغگی غسلخانہ و ڈاک چوکی کا عہدہ دیا۔ ان لوگوں کے ساتھ تورانی امرا پر بھی نوازش کی گئی، کیونکہ وہ سابق بادشاہ کے عہد میں معتوب رہے تھے، اور انکی خفیہ امداد فرخ سیر کے شامل حال تھی، انمیں محمد امین خاں کو چین بہادر اعتماد الدولہ نصرت جنگ کا خطاب اور بخشی دوم کا عہدہ ملا انکے بیٹے قمر الدین خاں کو بخشی احدیان کا عہدہ دیا گیا اور چین قلیچ خاں گوشہ عزلت سے ہمیشہ کے لئے نکالے گئے اور

انہیں ہفت ہزاری منصب اور نظام الملک بہادر فتح جنگ کا خطاب دیکر شش صوبہ دکن کی صوبہ داری پر مقرر کیا گیا۔ انکے علاوہ سلطنت کے دوسرے اہم عہدے، ایسے اشخاص کو دے گئے جو بادشاہ کے ہوا خواہ تھے، اور صوبوں کی حکومتوں پر بھی اسی قسم کے لوگوں کو مامور کیا گیا۔ اِنمیں سے بجز چند آدمیوں کے، اکثر وہ تھے جو عالمگیر اور بہادر شاہ کے زمانہ میں ذمہ دار عہدوں پر رہ چکے تھے، اسلئے بظاہر سلطنت کا انتظام درست نہ ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ لیکن بادشاہ کی اپنی ناقابلیت، اسکے جلیسوں اور مشیروں کی نااہلی، اور عہدوں کے لئے آدمیوں کا صحیح انتخاب نہ کرنے کی غلطی، ان تین چیزوں نے مل جل کر ایسے حالات پیدا کردے جنکے تباہ کن نتائج اول دن سے ظاہر ہونے شروع ہوگئے

فرخ سیر اور اسکے ارکان دولت کی سیرت

فرخ سیر عقل، تدبر، سیاست فہمی اور کارفرمائی کے جوہر سے عاری، اور رائے صائب سے بے بہرہ تھا۔ مزاج میں استقامت نہ تھی۔ کانوں کا کچّا تھا۔ دوسروں کے کہے سُننے پر چلتا تھا۔ اسکے ساتھ ہی پست حوصلہ اور بزدل بھی تھا۔ مردم شناسی جو ایک بادشاہ کے لئے بہت ضروری چیز ہے اسمیں مطلق نہ تھی۔ اس نے اپنے گرد کمینے، خوشامدی، اور سازشی لوگوں کو جمع کرلیا تھا، اور وہ جس طرف اسے موڑتے تھے اسی طرف مڑ جاتا تھا۔ اس کے جلیسوں اور مشیروں میں میر جملہ کی شخصیت سب سے زیادہ نمایاں تھی جس کے ہاتھ میں وہ دو سال تک موم کی ناک بنا رہا۔ اور اس شخص کا حال یہ تھا کہ سخت حاسد منافق اور سازش پیشہ تھا۔ اگرچہ اپنے واقف کاروں اور عام حاجتمندوں کو فائدہ پہنچانے میں وہ بہت فراخ حوصلہ تھا اور

بکثرت لوگ اس سے فیض یاب ہوتے تھے، لیکن اسکی فطرت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی تھی کہ اپنے سے بلند تر عمارتوں کو گرا کر تہ خاک کر دینا چاہتا تھا اور نیچی عمارتوں کو اٹھا کر بس اتنا اونچا کرتا تھا کہ وہ خود اس سے فروتر اور اپنے قیام وبقا کے لئے اُس کی رہین منت رہیں۔ اس نے اپنی ذاتی اغراض کی خاطر جوڑ توڑ کئے اور سازشوں کے ایسے جال بچھائے جنمیں الجھ کر وہ خود اور اسکے مخالفین، اور بادشاہ سب تباہ ہو گئے۔ فرخ سیر نے اپنے وزیر اعظم اور سپہ سالار کے انتخاب میں بھی غلطی کی اور اس کا انجام بھی اسکے اور سلطنت کے حق میں برا نکلا۔ اس میں شک نہیں کہ سید عبد اللہ خان اور سید حسین علی خاں شجاعت، فیاضی، عالی حوصلگی، اور دوسرے تمام شریفانہ خصائل سے متصف تھے، لیکن ان میں دل ودماغ کی وہ قابلیتیں ہرگز نہ تھیں، جو ایک عظیم الشان سلطنت کے کاروبار چلانے کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ ان کا سارا خاندان تلوار کا دھنی تھا، اور وہ خود بھی اس صفت میں کسی سے پیچھے نہ تھے، مگر ان کو تلوار چلانے کے سوا اور کچھ نہیں آتا تھا۔ اکبر اعظم کے زمانہ سے بہادر شاہ کے زمانہ تک انسے یہی کام لیا جاتا رہا۔ اس سے بڑھ کر سلطنت کے سیاسی اور انتظامی معاملات میں دخل دینے کے قابل نہ انہیں کبھی سمجھا گیا اور نہ اس کا موقع دیا گیا۔ سادات بارھہ کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ ان میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوا جو سیاسیات و فرمانروائی اور تدبیر امور جہانبانی سے کسی قسم کا لگاؤ رکھتا ہو۔ اس کلیہ سے یہ دونوں بھائی بھی مستثنیٰ نہ تھے۔ ان کے متعلق عالمگیر کے زمانہ میں ایک مرتبہ ذوالفقار خاں نے سفارش کی تھی کہ بڑے بھائی کو ہشت صدی سے ترقی دیکر ہزاری اور چھوٹے بھائی کو ہفت صدی سے

ہشت صدی منصب عطا کیا جائے۔ اس پر عالمگیر نے جو بڑا مردم شناس شخص تھا، یہ توقع کی تھی کہ سادات کی محبت میرا اور ہر مسلمان کا جزو ایمان ہے مگر ان لوگوں کو ایسی ترقی دینا جس سے یہ فتنہ میں مبتلا ہو جائیں اپنی دنیا اور عاقبت دونوں خراب کرنا ہے۔ بارھہ کے سید کو جب غیر معمولی ترقی دی جاتی ہے تو وہ انا ولا غیری کا دم بھرنے لگتا ہے اور اپنے مقام کو بھول کر اونچے اونچے خواب دیکھنا اور فساد برپا کرنا شروع کر دیتا ہے اپنی آخری وصیت میں بھی عالمگیر نے سادات بارھہ کے خطرہ کو محسوس کر کے، انکے متعلق یہ الفاظ لکھے تھے:۔

> "باسادات لازم السعادات بارھہ بموجب آیۂ " وآتِ ذای القربیٰ حقہ " عمل باید نمود۔ در احترام و رعایت فروگذاشت نباید کرد۔ ازیں راہ کہ بموجب آیۂ کریمہ " قل لا اسئلکم علیہ اجراً الا المودۃ فی القربیٰ " محبت ایں جماعہ اجر نبوت است ہرگز مقصر نباید بود۔ کہ ثمر خیر دنیا و آخرت است۔ لیکن باسادات بارھہ کمال احتیاط باید نمود۔ در محبت باطنی قصور نباید کرد۔ و بحسب ظاہر مرتبہ اینہا نباید افزود کہ شریک غالب بلکہ طالب ملک اند۔ اگر اندک استرخائے عنان شود، ندامت خواہ شد"

عالمگیر کی یہ پیش گوئی ان دونوں بھائیوں کے حق میں حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ ان کو جب سپاہیوں کی صف سے نکالکر وزارت اور امیر الامرائی کی مسند پر بٹھا دیا گیا تو انمیں استبداد، تجبّر، اور تکبر پیدا ہو گیا۔ اور یہ اپنے آپ کو سلطنت کا مالک و مختار، اور بادشاہ کو اپنی شطرنج کا ایک

مہرہ سمجھنے لگے۔ مخالفین میں کھلم کھلا انکے مقابلہ کی قوت نہ تھی اسلئے انھوں نے خفیہ سازشوں اور جوڑ توڑ سے کام لیا۔ چھ سات برس تک مسلسل داؤں پیچ اور اکھیڑ پچھاڑ کا سلسلہ جاری رہا، اور اس کشمکش نے سلطنت کو ایسا جھنجوڑا کہ اسکی بنیادیں ہل گئیں۔

فرخ سیر اور سادات بارہہ کی مخالفت چونکہ فرخ سیر کی بادشاہی کا قوام ہی ان مختلف عناصر کی ترکیب سے ہوا تھا، اسلئے جس روز اسکی تعمیر پوری ہوئی، اسی روز سے خرابی شروع ہوگئی۔ آگرہ کی جنگ کے بعد سید عبداللہ خاں دھلی کی تسخیر کے لئے بھیج دیا گیا تھا، اور حسین علی خاں جنگ میں سخت مجروح ہونے کے سبب دربار کی شرکت اور سیاسیات میں حصہ لینے کے قابل نہ تھا، میر جملہ نے اس فرصت کے زمانہ سے خوب فائدہ اُٹھایا، اور بادشاہ کے پرانے دوست خاں دوراں (خواجہ عاصم) کے ساتھ ملکر ایک پارٹی بنائی جس کا مقصد سادات کے زور کو توڑنا تھا۔ اس پارٹی نے بادشاہ کے دل میں دونوں بھائیوں کی طرف سے یہ شبہ پیدا کرنا شروع کردیا کہ یہ اپنے آپ کو سلطنت کا اصلی مالک سمجھتے ہیں، اور انکا خیال ہے کہ انہی نے سلطنت آپ کو دلوائی ہے، اسلئے یہ آپ کو برائے نام بادشاہ رکھ کر خود حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ فرخ سیر کے وہمی اور کمزور دل میں یہ بیج بہت جلدی جڑ پکڑ گیا۔ دوسری طرف حسین علیخاں کو بھی اس کے حامیوں نے یہ خبریں پہنچادیں، اور اس نے اپنے بھائی کو لکھ بھیجا کہ "بادشاہ کی باتوں اور اسکے طرز عمل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسکی نگاہ میں خدمات اور جان نثاریوں کی کوئی قدر نہیں ہے، وہ

وفا، احسان شناسی اور پاس عہد سے عاری ہے، اور شرم و غیرت تک نہیں رکھتا، لہذا ہم کو اب خود اپنی بہتری کی فکر کرنی چاہیئے۔" ان باتوں نے دونوں جانب مخالفت کے جذبات پیدا کر دیے اور مہینہ بھر بعد جب بادشاہ دہلی گیا تو اسکے اور دونوں سیدوں کے درمیان غبار کدورت نمایاں نظر آنے لگا۔ انتظام سلطنت شروع ہوا تو عہدوں کی تقسیم میں سخت اختلافات پیدا ہوئے۔ جسکو بادشاہ مقرر کرتا اسے وزیر اور امیر الامرا نامنظور کرتے، اور جس کو وزیر اور امیر الامرا مقرر کرتے اسے بادشاہ نامنظور کرتا۔ دونوں بھائی چاہتے تھے کہ سلطنت کا کوئی کام انکی رائے کے خلاف نہ ہو، اور بادشاہ کی کوشش تھی کہ وہ ہر معاملہ میں اپنے شاہانہ اختیارات کو استعمال کرے۔ بیچ والوں نے اس اختلاف کی آگ کو اور زیادہ بھڑکایا۔ اُدھر بادشاہ پر میر جملہ اور خان دوراں حاوی تھے، اور خصوصیت کے ساتھ میر جملہ کو بادشاہ نے اپنے دستخط خاص کا مختار بنا دیا تھا، حتیٰ کہ وہ بادشاہ کے علم و اجازت کے بغیر کاغذات پر اسکی جانب سے دستخط کر دیتا تھا، اور جس معاملہ میں اسے وزیر یا امیر الامرا کی مخالفت کرنی منظور ہوتی تھی اسمیں شاہی دستخط کرنے سے انکار کر دیتا تھا۔ اِدھر سید عبداللہ خاں نے جانسٹھ کے ایک بنئے رتن چند نامی کو جو سخت حریص، تنگ نظر، خود غرض اور جاہل مطلق تھا اپنا دیوان بنا کر سلطنت کا سارا کاروبار اسکے سپرد کر دیا، اور خود اسقدر عیاشی میں منہمک ہوا کہ بسا اوقات تین تین چار چار مہینہ سلطنت کے معاملات کی طرف توجہ نہ کرتا تھا۔ رتن چند کا یہ حال تھا کہ وہ کوئی کام رشوت لئے بغیر نہ کرتا، جن لوگوں کو میر جملہ شاہی دستخط سے کوئی سند دیکر بھیجتا انکی سندیں جاری نہ ہوتیں اور جن سے رتن چند کو رشوت پہنچ جاتی

انہیں وہ جاری کر دیتا تھا۔ اس نے اپنے استبداد سے دیوانِ تن اور دیوان خالصہ دونوں کو معطل اور تمام متصدیوں اور عاملوں کو بیکار کر دیا تھا، مالی اور ملکی محکموں پر اسکی مطلق العنان حکومت تھی، اور وہ محالات خالصہ اجاروں پر دے کر لاکھوں روپے وصول کر لیتا تھا۔ آخر زمانہ میں اس نے دیوانی سے گذر کر شرعی معاملات میں بھی دخل دینا شروع کر دیا تھا اور قاضی تک اسکی تجویز سے مقرر ہوتے تھے۔ بادشاہ اور وزیر کے ان دونوں پٹھوؤں کا وجود فتنہ کا ایک مستقل سرچشمہ تھا جسکی بدولت ایک طرف سلطنت کا سارا انتظام خراب سے خراب تر ہوتا جا رہا تھا، اور دوسری طرف باہمی عداوتوں اور مخالفتوں کا رخنہ وسیع سے وسیع تر ہو کر ایک زبردست فساد کے لئے طیار ہو رہا تھا۔

سازشوں اور دورخی چالوں کی ابتدا

بہادر شاہ کی وفات کے بعد سے مرکزی سلطنت کا اقتدار جس قدر ضعیف ہو گیا تھا اسکی بدولت باج گذار رئیسوں اور راجاؤں میں انحراف کی جرأت پیدا ہو گئی تھی اور انمیں سے اکثر نے خراج دینا اور احکام کی اطاعت کرنا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن جودھپور کے راجہ اجیت سنگھ نے اس سے بھی آگے قدم بڑھایا اور اپنے حدود مملکت میں گائے کی قربانی اور اذاں بند کر دی، متعدد مسجدوں کو مسمار کیا، اور شاہی ملازموں کو جو اسکی ریاست میں مقرر تھے، نکال باہر کیا۔ اس حد تک اسکی تمام زیادتیاں برداشت کی گئیں، مگر جب اس نے شاہی حدود میں داخل ہو کر شہر اجمیر پر قبضہ کر لیا تو اس کو دفع کرنے کی ضرورت زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کی گئی، اور فرخ سیر نے خود اسکے مقابلہ پر جانے کا ارادہ کیا۔

لیکن میر جملہ اور اسکے ساتھیوں نے اسے روک کر یہ رائے دی کہ حسین علیخاں کو اسکے مقابلہ پر بھیجے اور خفیہ طور پر اجیت سنگھ کو ہدایت کرے کہ وہ اس سے لڑکر اس کا خاتمہ کر دے۔ چنانچہ اس سازش کے ساتھ ذی الحجہ ۱۱۲۵ھ (جنوری ۱۷۱۴ء) میں ایک طرف حسین علی خاں کو راجہ کے مقابلہ پر روانہ کیا گیا۔ اور دوسری طرف اجیت سنگھ کو لکھا گیا کہ اگر اس نے حسین علی کو ہلاک کر دیا تو نہ صرف اس کا تمام مال و اسباب اسے عطا کر دیا جائے گا، بلکہ مزید براں اور بھی الطاف و عنایات سے مالا مال کیا جائیگا۔ مگر یہ شرمناک سازش جس مقصد کے لئے کی گئی تھی اس میں ناکامی ہوئی۔ اجیت سنگھ حسین علیخان جیسے بہادر سپہ سالار کے سامنے آنیکی جرأت نہ کر سکا۔ اسے بھاگ کر بیکانیر کے ریگستان میں پناہ لینی پڑی، اور آخر کار اس نے نہ صرف شاہی اطاعت قبول کی، بلکہ اپنی بیٹی کا ڈولہ فرخ سیر کے لئے بھیجنے کا عہد کر کے صلح کر لی۔

سیدوں اور بادشاہ کے درمیان کشمکش

رجب ۱۱۲۶ھ (جولائی ۱۷۱۴ء) میں حسین علی خاں راجپوتانہ کی مہم سے واپس ہوا، اور مہم کے دوران میں یا دہلی واپس ہو کر وہ اصل خطوط اس کے ہاتھ آگئے جو اسکے خلاف اجیت سنگھ کو بھیجے گئے تھے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ اور ان دونوں بھائیوں کے درمیان عداوت اور زیادہ شدید ہو گئی، اور بارہا یہاں تک نوبت پہنچی کہ دونوں بھائیوں نے دربار میں جانا بند کر دیا، اپنی محلسراؤں کے گرد مورچہ بندی کر لی فوجیں جمع کر کے مدافعت کے لئے طیار ہو گئے۔ بادشاہ کی ماں نے کئی مرتبہ مداخلت کی اور خود وزیر اور امیر الامرا کے ہاں جا کر صفائی

کرانے کی کوششیں کیں، مگر فتنہ کا سرچشمہ کھلا ہوا تھا اور سیلاب بڑھتا جارہا تھا، اسلئے اس کا کوئی انسداد نہ ہوسکا۔ آخری تدبیر یہ نکالی گئی کہ دونوں بھائیوں کے مقابلہ میں اتنی طاقت فراہم کیجائے کہ بآسانی ان کا سر کچل دیا جاسکے۔ چنانچہ میر جملہ اور خان دوراں دونوں کو منصب ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار پر ترقی دی گئی، میر جملہ کے ماتحت ۵ ہزار والا شاہیوں کو اور خان دوران کے ماتحت ۵ ہزار مغل سپاہیوں کو مقرر کیا گیا، اور انکے علاوہ میر جملہ کو خاص طور پر ہندوستان زا مغلوں کی ایک فوج بھرتی کرنے کا حکم دیا گیا جسکی تعداد ۶ ہزار تھی۔ لیکن اتنی فوجیں فراہم کرنے کے باوجود دونوں میں سے ایک میں بھی نہ اتنی جرأت تھی، اور نہ قیادت و جنگ آزمائی کی اس قدر قابلیت کہ حسین علی خاں اور عبداللہ خاں جیسے بہادروں کے مقابلہ پر آسکتے۔ اسکے بعد اعتماد الدولہ محمد امین خاں پر نظر دوڑائی گئی، اور اس سے کہا گیا کہ وہ شاہی فوجوں کی قیادت اپنے ہاتھ میں لیکر سیدوں کا خاتمہ کردے۔ لیکن وہ اس حقیقت سے واقف تھا کہ سیدوں کا قلع قمع ہوتے ہی، قبل اسکے کہ میں سنبھل سکوں، یہ خود میرا قلع قمع کرنے کی فکر کرینگے، اسلئے اس نے اس سازش میں دخل دینے سے صاف انکار کردیا۔ اب فرخ سیر بالکل بے بس تھا۔ اس نے چند بااثر آدمیوں کو بیچ میں ڈالا جنھوں نے دونوں بھائیوں سے اسکی صلح کرانے کی کوشش کی، اور ان کے توسط سے اس بات پر تصفیہ ہوا کہ میر جملہ کو بہار کی صوبہ داری پر بھیج دیا جائے اور حسین علی خاں دکن کی صوبہ داری پر چلا جائے۔ چنانچہ اس تصفیہ کے مطابق ذی الحجہ ۱۱۲۶ھ

(دسمبر ۱۷۱۴ء) میں میر جملہ پٹنہ کی طرف بھیج دیا گیا، اور اسکے چند مہینہ بعد ربیع الاول ۱۱۲۷ھ (اپریل ۱۷۱۵ء) میں امیر الامرا بھی دکن کی طرف روانہ ہو گیا۔ اگرچہ امیر الامرا کو اس سے بہت پہلے دکن کی صوبہ داری کا پروانہ رمضان ۱۱۲۶ھ (ستمبر ۱۷۱۴ء) میں مل چکا تھا، مگر وہ خود وہاں نہ جانا چاہتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ ذوالفقار خاں کی طرح داؤد خاں کو پھر اپنے نائب کی حیثیت سے وہاں مقرر کر دے۔ لیکن اب اسے تصفیہ کے مطابق مجبوراً وہاں جانا پڑا، اور اس نے اس شرط پر جانا قبول کیا کہ شش صوبہ دکن میں چھوٹے سے لیکر بڑے تک تمام عہدہ داروں کا عزل و نصب اسکے ہاتھ میں ہو، حتیٰ کہ اسے قلعہ داروں کے تغیر و تبدل تک کا اختیار حاصل رہے، حالانکہ قلعہ دار کا عہدہ سلطنت مغلیہ میں اسقدر اہم تھا کہ وہ بادشاہ کے سوا کسی کا تابع فرمان نہ ہوتا تھا۔ ان شرائط کے ساتھ حسین علی خاں دکن کی جانب روانہ ہوا اور چلتے وقت بادشاہ سے کہ گیا کہ اگر میرے بھائی پر کسی قسم کی دست درازی کی گئی تو ۲۰ دن کے اندر میں دھلی کے سامنے موجود ہونگا۔

حسین علی خاں کا قدم دلی سے نکلنا تھا کہ فرخ سیر پھر اپنے سازشی دوستوں کے اثر میں آگیا اور اس نے انہی دورخی چالوں سے کام نکالنا چاہا جو اجیت سنگھ کی مہم کے موقع پر آزمائی جا چکی تھیں۔ چنانچہ اس نے داؤد خاں صوبہ دار گجرات کو برہانپور کی صوبہ داری پر مقرر کیا، اور اسے خفیہ طور پر خط لکھا کہ وہ جس طرح ہو سکے حسین علی خاں کو روکے اور اگر ممکن ہو تو اسے قتل کر دے اس خدمت کے صلہ میں اسے امید دلائی کہ وہ بالاستقلال دکن کا

صوبہ دار بنا دیا جائے گا۔[۱] ان ہدایات کے مطابق برھانپور پر داؤد خاں نے حسین علی خاں کا راستہ روکا، ۸ رمضان ۱۱۲۷ھ (۶ ستمبر ۱۷۱۵ء) کو دونوں میں جنگ ہوئی جسمیں داؤد خاں مارا گیا، اور حسین علی خاں کے لئے دکن کی صوبہ داری پر مخاصم و مزاحم کے وجود سے پاک ہو گئی۔

اب ہم صوبہ دکن کے حالات اسوقت سے بیان کرنا چاہتے ہیں جبکہ نظام الملک اسکی حکومت پر مقرر کئے گئے تھے۔ ہم نے سیلسلہ بیان کو قائم رکھنے کے لئے ان حالات کو ابتدا میں بیان کرنے سے پرہیز کیا تھا۔

دکن میں مرہٹوں سے نظام الملک کے معاملات

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ۱۱۲۵ھ (۱۷۱۳ء) کی ابتدا میں نظام الملک دکن کی صوبہ داری پر بھیجے گئے تھے اور داؤد خاں گجرات کی صوبہ داری پر بدل دیا گیا تھا۔ داؤد خاں نے مرہٹوں سے چوتھ کے متعلق جو سمجھوتہ کر رکھا تھا، اسکی تائید میں کوئی شاہی سند موجود نہ تھی، اسلئے اسکے ہٹتے ہی وہ سمجھوتہ ٹوٹ گیا اور نظام الملک نے انکو چوتھ یا شاہی محصولات میں سے کسی اور قسم کا حصہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اسکے ساتھ ہی انھوں نے ان تمام ناجائز محاصل کو جو داؤد خاں کے عمال ضلعداری، فوجداری، اور راہ داری وغیرہ کے نام سے وصول کیا کرتے تھے یک قلم موقوف کر دیا اور اپنے متصدیوں، فوجداروں اور عاملوں کو شدید

---

[۱] یہ خطوط داؤد خاں کے قتل کے بعد حسین علی خاں کے ہاتھ آ گئے اور اس نے انہیں سید عبداللہ خاں کے پاس بھیج دیا۔

احکام دیے کہ قانون کی رو سے رعایا پر جو محصل مقرر ہیں انکے سوا ایک پیسہ کسی سے ظلماً نہ وصول کریں۔ فوجی انتظامات کے سلسلہ میں انھوں نے اورنگ آباد پہنچنے کے بعد پہلا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ مرہٹوں سے متصل علاقوں میں فوجیں پھیلا دیں، اور امن کی حفاظت کا شدید انتظام کیا جس سے مرہٹوں کی غارتگری میں بہت کچھ کمی واقع ہوگئی۔ راجہ ساہو نے اس نقصان کا تدارک فوجی حملہ سے کرنا چاہا اور چندرسین اپنے سیناپتی (سپہ سالار) کو ستارا سے ایک زبردست فوج دیکر شاہی علاقہ کی طرف بھیجا تاکہ چوتھ، سردیسمکھی اور گھانس دانہ وصول کرے۔ اس مہم میں ساہو نے بالاجی وشواناتھ کو جو اسوقت تک ایک کارکن کی حیثیت رکھتا تھا (اور چندرسین کے باپ کا ملازم رہ چکا تھا) حسابات کی نگرانی کے لئے چندرسین کے ساتھ مقرر کردیا۔ چندرسین کو یہ نگرانی سخت ناگوار ہوئی، اور شاہی علاقہ میں پیش قدمی سے پہلے اسمیں اور بالاجی میں لڑائی ہوگئی۔ بالاجی جان بچاکر بھاگا، اور ساہو کے حکم سے پنڈو گڑھ کے قلعہ دار نے اسکو اپنی پناہ میں لے لیا۔ مگر چندرسین نے ساہو کی حمایت کی بھی پروا نہ کی اور پنڈو گڑھ کا محاصرہ کرلیا۔ ساہو نے اسکے مقابلہ کے لئے ہیبت راؤ نبالکر کو بھیجا جو مرہٹہ فوج میں سرلشکر کا عہدہ رکھتا تھا۔ دونوں میں جنگ ہوئی جسمیں چندرسین نے شکست کھائی۔ اس پر چندرسین سیدھا نظام الملک کے پاس اورنگ آباد چلا گیا اور انھوں نے بڑے اعزاز کے ساتھ اسے اپنی ملازمت میں لے لیا، بیدر سے ۲۵ میل کے فاصلہ پر بھالکی اور اسکے نواح کا ایک

وسیع علاقہ اسے جاگیر میں دیا، اور اسکے ساتھیوں میں سے شرزہ راؤ گھٹگے اور رنبھاجی[1] نبالکر کو بھی جاگیریں دیں۔ اب مرہٹوں نے محسوس کیا کہ نظام الملک نے انکی طاقت کو کتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ چنانچہ انھوں نے طرح طرح سے چندرسین کو رام کرنے کی کوشش کی مگر نظام الملک کو آدمی کی دلجوئی اور استمالت کے ایسے ڈھنگ آتے تھے کہ ان کے لطف و نوازش کا گرویدہ ہونے کے بعد پھر کوئی چیز چندرسین کو راجہ ستارہ کے پاس واپس جانے پر آمادہ نہ کر سکی۔ اس واقعہ کو نظام الملک نے خود اپنی ایک عرضداشت میں جو فرخ سیر کے نام لکھی تھی اس طرح بیان کیا ہے:۔

"زوجہ رانائے جہنمی (یعنی تارا بائی) و ساھوی شقاوت خوی، ہر کدام مردم معتبر نزد او فرستادہ بوعدۂ مدار المہامی ساختن و اختیار جمیع کارہا باد دادن، طلب داشتہ اند۔ لہذا مردم فہمیدہ و دانا را واسطۂ استمالتِ او قرار دادہ بتمہیدات و وعدہ ہا نقوش وہم و وسواس را از صفحۂ باطنش ستردہ رام و مطمئن نمودہ شد۔ .... چنانچہ ۲۱ر ذی الحجہ سنہ ۳ راجہ چندرسین با جمعے کہ اسامی آنہا ضمن تحریمہ یافت بصدق اعتقاد قدم برجا، انقیاد گذاشتہ آمدہ ملاقات نمود۔ استماع ایں مراتب جمع دیگر را نیز از نا سرداران مایل بصراط مستقیم اطاعت ساختہ... اغلب

---

[1] رنبھاجی کو بعد میں راؤ رنبھا کا خطاب عطا ہوا اور یہ خطاب ابتک اسکی اولاد میں باقی ہے۔

کہ عنقریب یہ تبعیتِ راجہ اینہا نیز بگردند“

چندر سین بدلہ لینا چاہتا تھا، اور نظام الملک غارتگری کو روکنے کی فکر میں تھے۔ اسلیئے دونوں نے متفقہ طور پر ایک فوج سرلشکر کے مقابلہ پر بھیجی۔ ادھر سے ساہو نے بالاجی وشواناتھ کو سرلشکر کی امداد کے لیئے ایک فوج کے ساتھ بھیجا۔ پورندھر کے قریب جنگ ہوئی جسمیں ساہو کی فوج شکست کھاکر سایسی گھاٹ کی طرف پسپا ہوگئی، رنبھاجی نبالکر نے بڑھ کر پونا کے علاقہ پر قبضہ کرلیا اور نظام الملک نے اسی کے نواحی میں اسی کو جاگیر عطا کردی۔ یہ حال دیکھکر ساہو خوف زدہ ہوگیا اور اس نے نظام الملک سے چند شرائط پر صلح کرلی۔ یہ شرائط کسی تاریخ میں مجھے نہیں ملیں، مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یقیناً حکومت کے لیئے مفید ہونگی، اور ان کا مآل یہ ہوگا کہ ساہو کی جانب سے آیندہ شاہی علاقہ میں غارتگری نہ ہونے پائیگی۔ لیکن یا تو ساہو نے خود اس عہد کی پابندی نہ کی، یا وہ اپنے آدمیوں پر اتنا قابو نہ رکھتا تھا کہ انہیں پابندی پر مجبور کرسکتا۔ بہرحال اس صلح کے بعد بھی مرہٹوں کی جانب سے متعدد مرتبہ غارت گری کے واقعات پیش آئے۔ اب نظام الملک نے انکا زور توڑنے کے لیئے ایک اور تدبیر اختیار کی جو پہلی تدبیر سے زیادہ موثر تھی۔ یہ ساہو کے مقابلہ میں اسکے کولھاپور والے حریف کو قوت پہنچانے کی تدبیر تھی۔

نظام الملک کی آمد سے قبل، داؤد خاں کی نائب صوبہ داری کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ ۱۷۱۲ء میں راجہ رام کا بیٹا شواجی جو تارابائی کے بطن سے تھا مرگیا اور اسکے ساتھ ہی تارابائی کا اقتدار بھی ختم ہوگیا۔ ریاست کے عمائد نے راجہ رام کے دوسرے بیٹے سنبھاجی کو گدی پر بٹھادیا

اور تارا بائی کو قید کر دیا۔ اس انقلاب سے کولھاپور کی ریاست نسبتہً کمزور ہو گئی تھی، کیونکہ اسے تارا بائی جیسی فرزانہ اور بہادر رانی کی رہنمائی حاصل نہ رہی تھی۔ ساہو کو داؤد خاں کی حمایت پہلے ہی سے حاصل تھی۔ تارا بائی کے ہٹ جانے سے اسکو اور زیادہ فائدہ حاصل ہوا اور مرہٹہ قوم میں اس کا اقتدار بہت مضبوط ہو گیا۔ نظام الملک نے اورنگ آباد پہنچتے ہی اپنے پیش رو کی اس غلطی کو محسوس کر لیا تھا، اور وہ ابتدا سے اس فکر میں تھے کہ ساہو کے مقابلہ میں سنبھاجی کو قوت پہنچائیں، مگر بعد میں ساہو کی روش اور اسکی عہد شکنی سے انکو اس حکمت عملی کی ضرورت اور زیادہ شدت کے ساتھ محسوس ہونے لگی، اور انھوں نے اپنے اثر سے کام لیکر بڑے بڑے مرہٹہ سرداروں کو سنبھاجی کی حمایت پر آمادہ کر دیا۔ چنانچہ مشہور مرہٹہ لیڈر سنتاجی گھورپڑے کا بھتیجا سیدوجی گھورپڑے سنبھا سے مل گیا اور اسکے ساتھ گھورپڑے خاندان کے بہت سے سردار کولھاپوری فوج میں شامل ہو گئے۔ سیدوجی کا دوست اور نظام الملک کا ماتحت رئیس نواب ساوانور بھی سنبھا کا مددگار ہو گیا۔ ایک اور طاقتور مرہٹہ سردار اوداجی چوہان نے ساہو کو اسقدر پریشان کیا کہ اسے اپنے چند تعلقوں کی چوتھ دیکر اس سے صلح کرنی پڑی۔ ان کے علاوہ بہت سے اور چھوٹے بڑے سرداروں نے بھی اپنا وزن سنبھا کے پلڑے میں ڈال دیا، جن میں سب سے زیادہ خوفناک کہنوجی انگریا تھا۔ یہ ساونت واڑی سے لیکر بمبئی تک کے ساحل پر قابض تھا اور اس کا اثر کوکن کے سواحل پر تیزی کے ساتھ پھیل رہا تھا۔ ان حالات نے چند مہینوں کے اندر ساہو کا زور آدھے سے زیادہ توڑ دیا۔ مگر نظام الملک یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ اسکو بالکل

مٹاکر سنبھا کو اسکی جگہ دیدیں، اسلئے انھوں نے توازن قائم رکھنے اور تالیف قلب کرنے کے لئے اسکو بھی برقرار رکھنے کی کوشش کی، اور فرخ سیر سے سفارش کرکے اسے منصب دہ ہزاری ذات وسوار دلوایا، اور اس سلسلہ میں ساہو سے پھر ایک مرتبہ یہ تسلیم کرالیا کہ وہ خواہ اپنے زعم میں ہندوؤں کا بادشاہ ہو، لیکن مغل شہنشاہی میں اسکی حیثیت ایک زمیندار یا دیسمکھ سے زیادہ نہیں ہے۔

نظام الملک کے عزل کا اثر دکن کی سیاست پر

نظام الملک نے اپنی اس پالیسی سے مرہٹہ طاقت کو قابو میں لانے اور دکن کے فتنہ کو فرد کردینے کا پورا بندوبست کرلیا تھا۔ لیکن ابھی اس پالیسی کی ابتدا ہی تھی کہ دو واقعات ایسے پیش آئے جنھوں نے سارا نقشہ بدل دیا۔ ۱۱۲۶ھ/۱۷۱۴ء کے اواخر میں ایک طرف شاہی فرمان کے مطابق نظام الملک دکن کی صوبہ داری سے معزول کرکے دہلی طلب کرلئے گئے اور انکی جگہ امیرالامرا سید حسین علی خاں کو دکن بھیجا گیا، جو اس صوبہ کے سیاسی معاملات سے بالکل ناواقف، نفس سیاست سے بے بہرہ، اور ایک نرا سپاہی آدمی تھا۔ دوسری طرف اسی سال راجہ ساہو نے اپنا پیشوا یا مکھ پردھان (وزیر اعظم) بالاجی وشواناتھ کو بنایا اور خود اپنی حویلی میں محو عیش ونشاط ہوکر ریاست کے تمام اختیارات اسکے سپرد کردئے[لہ]۔ یہ شخص سپاہیت کے اعتبار سے تو

[لہ] یہ مرہٹہ ریاست میں پیشوا کے اقتدار کی ابتدا تھی۔ اسوقت سے ستارا کا راجہ ایک برائے نام راجہ رہ گیا اور حکومت کلیتہً بالاجی وشواناتھ کے خاندان میں آگئی جو پیشواؤں کا خاندان کہلاتا ہے۔

حسین علی خاں کے ساتھ کوئی نسبت نہ رکھتا تھا، مگر سیاسی تدابیر میں حسین علی خاں اسکی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس نے آتے ہی مرہٹہ راج کے تن مردہ میں جان ڈال دی۔ بدنظمی و طوائف الملوکی کو دور کیا، سرکش سرداروں کو دبایا، اور ایک قلیل مدت میں از سر نو ایک مضبوط و مستحکم حکومت قائم کرلی۔ دوسری طرف دکن کے مورکھ صوبہ دار کو اس نے سیاست کے میدان میں شکست فاش دی، اور محض اپنی فرزانگی و فطانت کے بل پر اس سے ایک ایسا معاہدہ کرلیا جسکی بدولت مرہٹے نہ صرف شش صوبہ دکن کے شاہی محاصل میں ۳۵ فی صدی کے حصہ دار ہوگئے، بلکہ آئندہ کے لئے انکو پوری سلطنت کے معاملات میں مداخلت کرنے اور پورے ملک پر چھا جانے کے مواقع مل گئے۔ اسکی ان کامیابیوں کو دیکھ کر اکثر مورخین نے اسکو سیواجی کے بعد مرہٹہ سلطنت کا بانی دوم قرار دیا ہے، اور یہ بالکل صحیح ہے سیواجی کے بعد اسکے خاندان میں کوئی اس قابلیت کا شخص نہ ہوا تھا جو سلطنت مغلیہ کے مقابلہ میں مرہٹہ راج کا علم بلند رکھ سکتا۔ سنبھا کی نالائقی مسلّم تھی۔ رام راجہ نرا جنگجو تھا۔ تعمیری قابلیت کا اس نے کوئی ثبوت نہیں دیا۔ تارا بائی کی فرزانگی و شجاعت دونوں مسلّم ہیں مگر عالمگیر کے مقابلہ میں خراب شدہ مرہٹہ ریاست کی باز تعمیر وہ بھی نہ کرسکی۔ ساہو فطرۃً کمزور اور عیش پسند طبیعت کا آدمی تھا[1] اور پندرہ بیس سال تک مغل دربار میں

---

[1] لچھمی نراین شفیق اپنی کتاب بساط الغنائم میں لکھتا ہے:- "ساہو سخت زانی و حرامکار بود۔ ہر جا کہ زن جمیلہ از رعایا و سپاہی می شنید، بزور زر طلبیدہ و مباشرت نمودہ سر میداد۔ اکثر اوقات بخانہ کسانیکہ زن شکیل می یافت خود رفتہ و از زنانش بالعنف و غدر بد کردہ شبہا می ماند" (صفحہ ۶۴) ساہو کی وفات کے سبب میں بھی اس مصنف نے ایک نہایت شرمناک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔

رہ کر اسکے اندر بھی وہ خصائل پیدا ہو گئے تھے جو اس زمانہ کے مغل امرا میں عام تھے۔ اِن انتہا کو پہنچے ہوئے شہری خصائل کو لیکر وہ ایک ایسی بدوی قوم کی رہنمائی نہیں کر سکتا تھا جو ابھی ترقی کی ابتدائی منزلوں میں تھی اور جسے مغلوں کے مقابلہ میں جگہ حاصل کرنے کے لئے بہت کچھ جد و جہد کرنی تھی۔ اُس کی نا اہلی کے ساتھ خانہ جنگی کے تباہ کن اثرات نے مل جل کر ایسے حالات پیدا کر دیے تھے جنسے مرہٹہ راج فنا کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ان حالات کو جس شخص نے آکر دفعتہً بدل دیا وہ بالاجی وشواناتھ ہی تھا، اور یہ اسکی اعلیٰ قابلیت تھی جس نے مرہٹہ راج کو پھر زندہ کر کے اسمیں ایسی روح پھونکی کہ وہ سیواجی کے عہد کی نسبت سے بدرجہا زیادہ طاقتور ہو گیا، اس لئے اسے مرہٹہ راج کا بانی دوم کہنا کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بالاجی کی کامیابیوں میں اسکی قابلیت اور ہوشیاری کے ساتھ مغل شہنشاہ اور اسکے مشیروں اور مدبروں کی ناقابلیت اور حماقت بھی برابر کی شریک تھی۔ اگر وہ اس نازک موقع پر نظام الملک جیسے لائق صوبہ دار کو نہ ہٹاتے تو بالاجی ہرگز وہ کامیابی حاصل نہ کر سکتا تھا جو حسین علی خان کی صوبہ داری میں اس نے حاصل کی۔ ہر شخص جس نے نظام الملک اور بالاجی کا موازنہ کیا ہے، اس امر کا اعتراف کریگا کہ قیادت و سپہ سالاری اور سیاسی تدبر، دونوں کے اعتبار سے نظام الملک کا درجہ بالاجی سے بہت بڑھا ہوا تھا۔ اور جیسا کہ گرانٹ ڈف نے بتصریح کہا ہے۔ انکی پالیسی اور انکی طاقت ایسی تھی جو بڑی حد تک مرہٹوں کو قابو میں رکھنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اگر انہیں اس پالیسی کو جاری رکھنے کا موقع

دیا جاتا، اور بالاجی کے دورِ حکومت کی ابتدا ہی میں وہ اسکی چالوں اور تدبیروں کا رد کرنے کے لئے موجود ہوتے تو کون کہہ سکتا ہے کہ بالاجی مرہٹہ راج کو اس درجہ تک پہنچانے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ جسمیں حسین علیخاں کی بدولت کامیاب ہوا۔

مرہٹوں کے مقابلہ میں حسین علی کی ناکامی

اب ہمیں واقعات کی طرف عود کرنا چاہیے۔ نظام الملک کی دکن سے واپسی اور حسین علی خاں کی آمد کے درمیان جو وقفہ گذرا اسمیں مرہٹوں نے پھر شاہی علاقوں میں غارتگری شروع کر دی۔ کھنڈو راؤ دبھاڑے[1] جو کئی سال سے گجرات اور کاٹھیاواڑ کے علاقوں میں لوٹ مار کرتا پھرتا تھا، خاندیس کے علاقہ میں آن بسا اور یہاں اپنے مٹی کی گڑھیاں بنا کر جگہ جگہ تھانے قائم کر لئے۔ بندرگاہ سورت سے جسقدر تجارتی قافلے دکن اور وسط ہند کی طرف جاتے تھے، ان کے گذرنے کا رستہ یہی تھا۔ کھنڈو نے ان قافلوں کو روک روک کر ان سے چوتھ وصول کرنی شروع کر دی، اور اسی طرح نواحی خاندیس کے دیہات میں بھی اس کے آدمی پھیل گئے اور چوتھ کی تحصیل کا بازار گرم ہوگیا۔ حسین علی خاں داؤد خاں کو شکست دینے کے بعد جب اورنگ آباد پہنچا تو اس نے اپنے بخشی ذوالفقار بیگ کو اسکی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ اورنگ آباد سے ستر کوس کے فاصلہ پر، پرگنہ بھانیر میں (جو بگلانہ اور

---

[1] اس شخص کا نام فارسی تاریخوں میں بہت غلط چھپا ہے۔ کسی میں دبھاریہ ہے کسی میں دبھاڑیہ اور کسی میں پبھاڑیہ۔ مگر میرا خیال ہے کہ یہ اصل مصنفین کی غلطی نہیں ہے بلکہ بعد کے مصححوں اور کاتبوں نے صحیح نام سے واقف نہ ہونے کے سبب یہ غلطیاں کی ہیں۔

کالنہ کی سرحد پر واقع ہے) مقابلہ ہوا۔ تھوڑی سی زد و خورد کے بعد مرہٹے اپنے مخصوص طریق جنگ کے مطابق خدع کے طور پر فرار ہوئے اور ذوالفقار بیگ اس فرار کو شکست کا فرار سمجھ کر تعاقب میں چلا۔ جب بہت دور جنگلوں میں جاکر بخشی کی فوج پراگندہ ہوگئی تو کھنڈو راؤ نے پلٹ کر حملہ کیا اور اسکی فوج کو بالکل تباہ کر دیا۔ خود بخشی بھی اس جنگ میں مارا گیا۔ اس کے بعد حسین علی خاں نے اپنے بھائی سیف الدین علی خاں اور اپنے دیوان محکم سنگھ کو بھیجا اور چندر سین جادو کو انکی کمک پر مقرر کیا۔ لیکن یہ لوگ کھنڈو راؤ کی قوت توڑنے اور اسکے تھانوں کو اٹھانے اور قافلوں کو اسکی ایذا رسانی سے بچانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ جب شاہی فوج کسی تھانے کے قریب پہنچتی تو مرہٹے اسے چھوڑ کر بھاگ جاتے، اور جب وہ وہاں سے ہٹ جاتی تو وہ پھر آکر وہیں قائم ہوجاتے۔ کھلے مقابلوں میں شاہی فوجوں نے مرہٹوں کو متعدد شکستیں دیں اور صاحب مآثر الامرا کے قول کے مطابق انکو دباتی ہوئی سورت اور ستارہ تک پہنچ گئیں، لیکن اپنے اصلی مقصد، قیام امن میں ان کو کامیابی نہ ہوسکی۔ آخر کار حسین علی خاں نے اپنی فوج کو اورنگ آباد واپس بلا لیا، اور ساہو نے کھنڈو راؤ کو اسکی کامیابی کے صلہ میں سیناپتی (سپہ سالار) بنا دیا۔

مرہٹوں سے حسین علی کی صلح اس زمانہ میں فرخ سیر کے سر پر سیدوں کی مخالفت کا ایسا جنون سوار تھا کہ وہ ان کو تباہ کرنے کی خاطر بری سے بری تدبیر کرنے کے لئے طیار تھا، خواہ وہ خود اسکی اپنی سلطنت اور اپنے ملک ہی کو تباہ کرنے والی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس نے پھر اپنی

خفیہ سازشوں سے کام لینے کی کوشش کی جو اجیت سنگھ اور داؤد خاں کے معاملہ میں ناکام ہو چکی تھیں۔ بادشاہ کی طرف سے صوبہ دار کے خلاف دکن کے ایک ایک دیوان، زمیندار، فوجدار اور عامل کو خفیہ فرامین بھیجے گئے جنمیں تاکید کی گئی تھی کہ صوبہ دار کے احکام کی اطاعت نہ کریں، اور حتی الامکان اس کی اتنی مزاحمت کریں کہ وہ حکومت کا کام نہ چلا سکے۔ حد یہ ہے کہ خود راجہ ساہو کو بھی جو علانیہ سلطنت سے برسرپیکار تھا، حسین علی خاں کے خلاف خطوط لکھے گئے، اور بادشاہ نے خود اپنے صوبہ دار کے مقابلہ میں اپنے اور اپنی سلطنت کے دشمن کی ہمت افزائی کی۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کرناٹک، بیجاپور اور حیدر آباد کے صوبوں میں شاہی حکام نے علانیہ صوبہ دار کی اطاعت سے سرتابی کی، اور جو صوبے دارالحکومت (اورنگ آباد) سے قریب واقع تھے انمیں بھی چھوٹے سے لیکر بڑے تک تمام سرکاری ملازموں میں سرکشی و نافرمانی کی روح دوڑ گئی، حکومت کے انتظام میں خلل عظیم برپا ہو گیا، اور مرہٹوں نے یہ دیکھ کر کہ صوبہ دار کی حکومت اندرونی اضطراب میں مبتلا ہے اور اسے شاہی حکومت کی تائید بھی حاصل نہیں ہے، اتنا زور پکڑا کہ انکے غارتگر دستے چوتھ اور سردیسمکھی وصول کرتے ہوئے اورنگ آباد کے قریب تک پہنچنے لگے۔

حسین علی خاں کو معلوم تھا کہ یہ سب بادشاہ کے اشارہ سے ہو رہا ہے، اور اسی دوران میں اسکو دھلی سے بھی پیہم خبریں پہنچ رہی تھیں کہ بادشاہ اور اسکے درباریوں کی سازشیں سید عبداللہ خان کے خلاف برابر جاری ہیں، اسلئے اس نے بھی سلطنت اور ملک کے

مفاد کو نظر انداز کر کے ایسی تدبیر اختیار کرنے کا عزم کر لیا جو خود اسکے اپنے مفاد کے لئے مناسب ہو۔ اس موقع سے ایک پرانے مرہٹہ برہمن نے فائدہ اٹھایا جس کا نام شنکراجی ملہار تھا۔ یہ شخص سیواجی اور سنبھاجی کا کارکن رہ چکا تھا، اور سنبھا کے بعد رام راجہ نے اسے اپنا سچیو (سرنویس یا چیف سکرٹری) بنا لیا تھا۔ جب جنجی کا قلعہ فتح ہوا اور رام راجہ وہاں سے بھاگا، تو اس نے دنیا ترک کر دی، اور بنارس جا بیٹھا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد پھر شاہی ملازمت اختیار کر لی اور جب حسین علیخان دکن جانے لگا تو یہ اسکے ہمراہی ملازموں میں شامل ہو گیا۔ یہاں ان سے ستارہ کے مرہٹہ کارپردازوں سے خفیہ مراسلت شروع کر دی، اور آہستہ آہستہ حسین علی خاں پر بھی اپنا اعتماد قائم کرتا رہا۔ جب اس نے دیکھا کہ حسین علی بادشاہ، اپنے ماتحت عمال، اور مرہٹہ، تین تین مخالفوں سے گھر کر پریشان ہو گیا ہے تو اس نے ہمدردی و خیر خواہی کے انداز میں اسے مشورہ دیا کہ اگر مرہٹوں کے مطالبات منظور کر لئے جائیں تو ایک طرف ملک کے امن و امان کی طرف سے اطمینان ہو جائیگا، اور دوسری طرف مخالفوں کے مقابلہ کے لئے مرہٹوں سے فوجی امداد بھی حاصل ہو گی۔ محمد انور خاں برہانپوری نے بھی، جس پر حسین علی خاں کو کافی اعتماد تھا، اس رائے کی تائید کی اور بعض دوسرے امرا بھی اسکے ہم نوا ہو گئے۔ حسین علی خاں اس پر راضی ہو گیا اور اس نے خود شنکراجی کو اپنا سفیر بنا کر ستارا بھیجا تاکہ وہ اسکی طرف سے مرہٹوں کے ساتھ صلح اور اتحاد کی گفت و شنید کرے۔ چنانچہ یہ گرگ باراں دیدہ ستارا گیا اور وہاں ساہو کے چالاک وزیر بالاجی وشواناتھ کے ساتھ ملکر اس نے ۱۱۳۰ھ (۱۷۱۸ء) میں[1] ایک معاہدہ طے کیا جسکی دفعات حسب ذیل تھیں:۔

---

[1] آزاد بلگرامی نے معاہدہ کی تاریخ ۱۱۲۹ھ لکھی ہے۔

معاہدہ کی تفصیلات (۱) ساہو کو دکن کے چھ صوبوں میں (جن کے اندر کرناٹک بیجاپور اور کرناٹک حیدر آباد کی فوجداریاں، اور میسور، ترچناپلی اور تنجاور کی باجگذار۔ ریاستیں بھی شامل تھیں) تمام محالات خالصہ و جاگیرات کے محصولات سے ۲۵ فی صدی بطریق چوتھ اور دس فی صدی بصیغہ سر دیسمکھی وصول کرنے کا حق دیا گیا۔

(۲) اسے اختیار دیا گیا کہ ہر محال (پرگنہ) میں اپنا ایک گمایش دار یا مکاسہ دار¹ چوتھ وصول کرنے کے لئے، ایک گماشتہ یا نائب سر دیسمکھی وصول کرنے کے لئے اور ایک شریک "راہدار" چنگی کے محاصل وصول کرنے کے لئے مقرر کرے۔

(۳) صوبہ دار دکن نے اقرار کیا کہ اگر کسی محال میں زمینداروں، مقدموں، یا سرکاری حکام کی سرکشی کے باعث ساہو کے گماشتے چوتھ یا سر دیسمکھی وصول نہ کر سکینگے، تو صوبہ دار کی جانب سے اسکی تحصیل میں اعانت کی جائے گی۔

(۴) ان تمام علاقوں میں جو سیواجی کی وفات کے وقت اس کے قبضہ میں تھے، ساہو کو سوراج عطا کیا گیا۔ خاندیس کے کچھ علاقے، ترمبک کا قلعہ مع نواحی، اور دریائے وردھا، اور دریائے تنگبھدرا کے جنوب کے علاقے سوراج سے مستثنیٰ کر لئے گئے اور انکے عوض ٹوڈا سے مچھندر گڈھ اور پنڈر پور تک کا علاقہ اسمیں شامل کیا گیا، اور وہ علاقہ بھی جو ساہو کی شادی کرتے وقت عالمگیر نے اسے دینے کا وعدہ کیا تھا۔

---

[1] مقاسہ دار بھی تلفظ ہے۔

(۵) ساہو کی ماں اور اسکے خاندان کے دوسرے افراد کو جو ابتک شاہی قید میں تھے رہا کر دینے کا وعدہ کیا گیا۔

ان رعایات کے معاوضہ میں ساہو نے حسب ذیل باتوں کا وعدہ کیا:۔

(۶) یہ کہ وہ سوراج کے علاقہ کا پیشکش دس لاکھ روپیہ سالانہ ادا کریگا۔

(۷) یہ کہ سردیسکھی کے معاوضہ میں وہ صوبجات دکن میں امن قائم کرنے کا ذمہ دار ہوگا، اور غارتگری کو روکنا، بد امنی کرنے والوں کو گرفتار کرنا، اور سرقہ اور ڈاکہ کے نقصانات کی تلافی کرنا اس کا فرض ہوگا۔

(۸) یہ کہ چوتھ کے عوض وہ شاہی اغراض کے لئے ۱۵ ہزار فوج ہمیشہ مستعد رکھیگا تاکہ صوبہ دار یا فوجدار یا کسی اور شاہی ملازم کے زیر حکم خدمت انجام دے۔

معاہدہ پر تبصرہ اس معاہدہ کی رو سے فریقین کی سیاسی پوزیشن پر جو اثر پڑا اس کی توضیح کے لئے ضروری ہے کہ یہاں اسکے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے۔

اولاً، اس معاہدہ نے اُس ناتمام غلطی کی تکمیل کر دی جو بہادر شاہ کے عہد میں ذوالفقار خاں نے کی تھی، اور جس کا ارتکاب بے ضابطہ طریقہ سے داؤد خاں اپنی نائب صوبہ داری کے زمانہ میں کرتا رہا تھا۔ ابتک، مرہٹے چوتھ اور سردیسکھی وصول کرنے کے لئے جتنی بھی غارتگری کرتے تھے، اسکی حیثیت محض لوٹ مار کی تھی، کیونکہ ان کو ایسا کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ مگر اب خود شاہی حکومت کی طرف سے ان کا حق تسلیم کیا گیا اور ان کی غارتگری نے قانون کی حیثیت اختیار کر لی۔

ثانیاً، اس سے مرہٹوں کے حوصلے اور بڑھ گئے، اور انہوں نے

سمجھ لیا کہ مزید غارتگری کرنے سے مالوہ، گجرات اور دوسرے شاہی صوبوں میں بھی چوتھ وصول کرنے کا حق حاصل ہو سکتا ہے، چنانچہ چند سال بعد انہی ترکیبوں سے یہ حق بھی انہیں حاصل ہو گیا۔

ثالثاً، اس معاہدہ کی رو سے ہر ہر پرگنہ میں شاہی عاملوں کے ساتھ تین تین مرہٹہ تحصیلدار اپنے سواروں اور سپاہیوں سمیت متعین ہو گئے، انکی کچہریاں قائم ہوئیں، جگہ جگہ چونگی کے ناکوں پر شاہی چبوتروں کے ساتھ انکے چبوترے بنے، طومارِ واصلات پر شاہی عمال کے ساتھ انکے بھی دستخط ہونے لگے، اور ہر صوبہ میں شاہی صوبہ دار کے برابر مرہٹہ راجہ کی طرف سے بھی ایک صوبہ دار مقرر ہو گیا۔ اس دو عملی سے رعایا سخت تکلیف اور پریشانی میں مبتلا ہو گئی، حکومت کے انتظام میں عام برہمی پھیل گئی، اور سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ حکومت میں مرہٹہ راجہ مغل بادشاہ کے ساتھ برابر کا شریک بن گیا۔

رابعاً، اس معاہدہ سے مرہٹوں کی مالی حالت بہت مضبوط ہو گئی۔ دکن کے چھ عظیم الشان صوبوں کی آمدنی میں سے انکو ۳۵ فی صدی حصہ ملگیا، بغیر اسکے کہ حکومت کے مصارف کا کوئی حصہ ان کے ذمہ عائد کیا جاتا۔ اس سے انکو جو فائدہ حاصل ہوا اس کا اندازہ ذیل کے اعداد سے ہو سکتا ہے مرہٹوں کے سرکاری رجسٹروں کے مطابق اس زمانہ میں دکن کے صوبوں کی جو آمدنی گرانٹ ڈف نے[1] بیان کی ہے وہ حسب ذیل ہے:۔

صوبہ اورنگ آباد	۱,۲۳ ، ۷۶ ، ۰۴۲
〃 برار	۱,۱۵ ، ۲۳ ، ۵۰۸
〃 بیدر	۷۴ ، ۹۱ ، ۸۷۹
〃 بیجاپور	۷،۸۵۱۰۸ ، ۵۶۰
〃 حیدرآباد	۶,۴۸ ، ۶۷ ، ۴۸۳
〃 خاندیس	۵۷ ، ۴۹ ، ۹۱۸
کل	۱۸,۰۵ ، ۱۷ ، ۳۹۱

---

[1] یہاں گرانٹ ڈف کے بیان کو اسلئے ترجیح دی گئی ہے کہ وہ مرہٹہ مآخذ پر مبنی ہے، اور ظاہر ہے کہ چوتھ اور سردیش مکھی کی تحصیل آمدنی پر ہوتی تھی۔

اس آمدنی میں سے جملہ مصارف وغیرہ منہا کرنے کے بعد ڈیڑھ کروڑ روپیہ سالانہ مرہٹوں کے حصہ میں آیا اور اس کے موازی ان پر کوئی ایسا نیا خرچ عائد نہیں ہوا جو وہ اس سے قبل برداشت نہ کرتے ہوں۔ بلکہ ان کے سابق خرچ میں اور کمی ہوگئی۔ چوتھ وصول کرنے والا عملہ پہلے بھی موجود تھا اور اب بھی موجود رہا۔ اس عملہ کو مدد دینے کے لئے جو غارتگر دستے متعین کئے جاتے تھے، انکی اب ضرورت نہ رہی کیونکہ تحصیل میں مدد دینے کی ذمہ داری صوبہ دار نے اپنے سر لے لی۔ دکن کے صوبوں میں امن قائم کرنے کی ذمہ داری قبول کرنے کے معنی اس سے زیادہ کچھ نہ تھے کہ خود مرہٹے اپنے غارتگر دستوں کو ہٹائیں، چنانچہ انھوں نے اسے ہٹا لیا۔ رہی وہ ۱۵ ہزار فوج جو شاہی خدمت کے لئے رکھنے کا وعدہ کیا گیا تھا، سو وہ بھی انہیں کوئی علیحدہ بھرتی کرنی نہیں پڑی، بلکہ جو فوج انکے پاس موجود تھی، وہی بوقت ضرورت انھوں نے بھیجدی اور بعد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ معاہدہ میں اس امر کی بھی تصریح کر دی گئی تھی کہ جب اس فوج سے خدمت لی جائیگی تو اس کا خرچ شاہی حکومت کے ذمہ ہوگا۔ اسطرح بغیر کسی خرچ کے یا (اگر کچھ خرچ تھا بھی تو) بہت تھوڑے خرچ پر مرہٹہ راجہ کی آمدنی میں ۶ کروڑ روپیہ سے زیادہ کا اضافہ ہوگیا۔ جو لوگ پیٹ بھرنے کے لئے لوٹ مار کرنے پر مجبور تھے، وہ دفعتہً اتنے مالدار ہوئے کہ ان کی حویلیاں مغل امرا کے محلات کی ہمسری کرنے لگیں، اور انھوں نے بہت قلیل عرصہ میں کثیر التعداد فوج اور سامان حرب بہم پہنچا کر اپنے اندر سلطنت مغلیہ کو الٹ دینے کی قوت بہم پہنچالی۔

خامساً، دکن کے صوبوں کی آمدنی میں خود بادشاہ کا حصہ مرہٹہ

راجہ سے کم رہ گیا، کیونکہ بقیہ ۶۵ فی صدی میں سے ۲۵ فی صدی نظم ونسق کے مصارف کے لئے فوجدار کے سپرد کر دیا جاتا تھا، اور باقی ماندہ ۴۰ فی صدی کا ایک بڑا حصہ ان جاگیرداروں کے حصہ میں آتا تھا جو شاہی خدمت کے لئے فوجیں رکھتے تھے۔[1]

سادساً، مرہٹوں کو ایک وسیع رقبہ میں سوراج مل گیا۔ جو مہاراشٹر کے حسب ذیل ۱۶ اضلاع پر مشتمل تھا: (۱) پونا (۲) سوپہ (۳) اندا پور (۴) وائی (۵) ماول (۶) ستارا (۷) کراڑ (۸) کٹنو (۹) مان۔ (۱۰) پھولتن (۱۱) ملکاپور (۱۲) تارلہ (۱۳) پنہلہ (۱۴) ازیرہ (۱۵) جنیر، اور (۱۶) کولھاپور۔ اسکے علاوہ تنگبھدرا کے شمال میں کپل، گدک، ہلیل وغیرہ اور کوکن کے ساحلی علاقہ میں جیول، دابل، راجپوری وغیرہ بھی مرہٹہ سوراج میں شامل کئے گئے۔ اسطرح شاہی

---

[1] لچھمی نرائن نے حقیقتہائے ہندوستان میں محمد شاہ کے عہد کا جو حساب آمد وخرچ دیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں دکن کی آمدنی اس تناسب سے صرف ہوتی تھی:-

آمدنی:- ۱۷۹۸۰۱۲۹۳

خرچ:-

منہائی بابت اسلام گڈھ (دیوگڈھ)	۱۱۳۳۲۸۳
منہائی بابت تصرف مرہٹہ	۱۷۵۰۰۰۰۰
منہائی بابت جاگیر زمینداران وغیرہ	۱۱۰۲۵۶۵۸
غیر وصول شدہ رقمیں	۲۵۲۷۲۴۶۰
تتمہ سہ بندی	۹۹۸۶۹۵۰۲
جملہ	۱۵۴۸۰۰۹۰۰
باقی	۲۵۰۰۰۳۶۰

اس ڈھائی کرور کی بچت میں سے ایک کرور روپیہ خزانۂ شاہی میں داخل ہوتا تھا اور ڈیڑھ کرور روپیہ مرہٹوں کے حصہ میں آتا تھا۔

حکومت نے پہلی مرتبہ دکن کے شمالی مغربی علاقہ پر مرہٹوں کا قبضہ تسلیم کرلیا، اور بیجاپور اور اورنگ آباد کے صوبوں کا ایک بڑا حصہ ہمیشہ کے لیے مغل حکومت سے الگ ہوگیا۔ لچھمی نرائن شفیق کے بیان کے مطابق، اُس زمانہ میں مرہٹوں کی اس آزاد ریاست کی آمدنی پونے دو کرور روپیہ تھی۔

یہ تو وہ فوائد تھے جو اس معاہدہ سے مرہٹوں کو حاصل ہوئے۔ اب ان فوائد پر بھی نظر ڈالیے جو بظاہر شاہی حکومت کے حصہ میں آئے۔

اولاً، عہد کیا گیا تھا کہ سوراج کے علاقہ کا پیش کش دس لاکھ سالانہ ادا کیا جائیگا، مگر جہاں تک ہم کو معلوم ہے اس کے ادا کرنے کی کبھی نوبت نہیں آئی۔

ثانیاً، امن قائم کرنے اور غارتگری کو روکنے کے متعلق جو دفعہ تھی اس کا مقصود اس سے زیادہ کچھ نہ تھا کہ مرہٹے آیندہ غارتگری نہ کرینگے، کیونکہ اب جنھوں نے قیام امن کا ذمہ لیا تھا وہی دراصل بدامنی پھیلانے والے تھے اور انکا یہ کہنا کہ ہم بدامنی کو روکینگے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا تھا کہ اب ہم بدامنی نہ پھیلائینگے۔ اس دفعہ کی رو سے گویا شاہی حکومت نے تسلیم کرلیا کہ دکن میں اسکے مقبوضات کا امن مرہٹوں کے رحم و کرم پر منحصر ہے۔

ثالثاً، ۱۵ ہزار فوج شاہی خدمت کے لیے مستعد رکھنے کی دفعہ دراصل اس غرض کے لیے نہیں تھی کہ وہ شاہی اغراض کے لیے مفید ہو، بلکہ یہ صرف حسین علی خاں نے اپنے فائدہ کے لیے رکھی تھی، تاکہ جب وہ بادشاہ کے مقابلہ کے لیے دہلی جائے تو مرہٹے اسکو فوجی امداد دیں۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ حسین علی خاں کے ساتھ جانے کے بعد پھر دکن کے صوبہ دار یا کسی علاقہ کے فوجدار کو مرہٹوں سے کوئی خاص فوجی امداد نہیں ملی۔

شاہی اجازت کے بغیر معاہدہ کی تصدیق

اس تفصیل سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ معاہدہ از الف تا یاء مرہٹوں کے مفید مطلب تھا اور اسمیں شاہی حکومت کے لئے بجز نقصان کے اور کچھ نہ تھا۔ مگر حسین علی خاں نے محض اپنے ذاتی نفع "اور نفع بھی حقیر نفع" کی خاطر اسے منظور کرلیا اور شاہی سند و اجازت کے بغیر اسکی تصدیق کرکے ساہو کے گماشتوں کو تحصیل چوتھ و سردیسمکھی و راہ داری کے لئے تمام محالات میں دخل دیدیا۔ بعد میں بادشاہ کو اس کارروائی کی اطلاع پہنچی، اور اس نے ایسے نقصان دہ معاہدہ کو قبول کرنے سے صاف انکار کردیا، لیکن بادشاہ کی رضا و عدم رضا حسین علی خاں کے نزدیک کوئی چیز نہ تھی۔

اب وہ زمانہ آتا ہے جبکہ دھلی سے بادشاہ اور عبد اللہ خاں کے اختلافات کی پیہم خبریں حسین علی خاں کو پہنچتی ہیں اور وہ اورنگ آباد سے دھلی واپس جاتا ہے، لہذا اب سلسلہ کو قائم کرنے کے لئے ہمیں اسوقت سے دار السلطنت کے معاملات کو بیان کرنا چاہیے جب حسین علی خاں نے دھلی چھوڑی تھی۔

نظام الملک فوجداری مرادآباد

پہلے ذکر ہوچکا ہے کہ حسین علی خاں نے دکن جانے سے قبل میر جملہ کو پٹنہ کی جانب رخصت کرادیا تھا۔ اور اس کے چلے جانے سے ان سازشوں کا سب سے بڑا رکن ساقط ہوگیا تھا جو محلسرائے شاہی میں دونوں سیدوں کے خلاف ہوتی تھیں۔ حسین علی کی روانگی کے تین مہینہ بعد جمادی الاخری ۱۱۲۷ھ (جون ۱۷۱۵ء) میں نظام الملک دھلی پہنچے۔ اب تک دونوں

سیدوں سے نظام الملک کے تعلقات نہایت شگفتہ تھے۔ حتیٰ کہ وہ دونوں نظام الملک کو اپنا بڑا بھائی کہتے تھے۔ لیکن اب جو سیدوں نے سلطنت میں من مانی کارروائیاں کرنی شروع کیں، اور نظام الملک کو بلا وجہ دکن سے معزول کر کے انکے بنے بنائے کام کو بگاڑ دیا، تو وہ ان سے کبیدہ خاطر ہو گئے۔ اور اس کبیدگی کا پہلا اظہار اسطرح ہوا کہ دکن سے آتے وقت وہ حسین علی کے قریب چند میل کے فاصلہ سے گذرے، اور قصداً اس سے ملنے نہیں گئے۔ حسین علی خاں نے اسکو اپنی توہین قرار دیا کیونکہ وہ میر بخشی تھا اور مرتبہ میں اسسے زیادہ تھا۔ مگر عبداللہ خان صرف اتنی سی بات پر نظام الملک جیسے شخص سے بگاڑنا نہ چاہتا تھا۔ اسلئے اس نے دہلی سے باہر بارہ پلہ تک نکلکر ان کا استقبال کیا اور مبالغہ کے ساتھ عذر و معذرت کرتے ہوئے کہا کہ "تمام وزارت از شما است تا بصوبہ دارہا چہ رسد۔ محض برای رفع مجہلہ ہار خلق امیر الامرا ضرور شد۔ حالا ہر صوبہ بخواہند حاضر است"۔ ان چکنی چپڑی باتوں کی تہ میں جو کچھ پنہاں تھا، وہ نظام الملک کی نظر سے مخفی نہ تھا۔ انھوں نے عبداللہ خاں کا پیش کیا ہوا کوئی عہدہ قبول نہ کیا، اور پھر وہی گوشۂ تنہائی اختیار کر لیا جو بہادر شاہ اور جہاندار شاہ کے زمانہ میں انھوں نے اختیار کیا تھا۔ بادشاہ کے لئے اس سے بہتر کوئی موقع نہ ہو سکتا تھا کہ وہ نظام الملک جیسے طاقتور اور باتدبیر امیر کو اپنے مشیروں میں شامل کرتا اور انہیں اس جماعت کا لیڈر بناتا جو دونوں سیدوں کے اقتدار کو الٹ دینے کے لئے جد و جہد کر رہی تھی۔ ایسی حالت میں کہ ایک بھائی ہزار میل دور دکن میں بیٹھا تھا، اور دوسرا بھائی تمام امور سلطنت رتن چند کے ہاتھ میں چھوڑ کر

غرق عیش و نشاط تھا، اگر بادشاہ اپنے معاملات نظام الملک کے سپرد کر دیتا، تو وہ بڑی آسانی سے دونوں سیدوں کی مطلق العنانی کا خاتمہ کر سکتے تھے، کیونکہ فوجی قابلیت میں وہ ان دونوں سے کم نہ تھے، سیاسی قابلیت میں ان کو ان سے کوئی نسبت نہ تھی، اور ان کی حمایت پر اگر سادات بارہ تھے، تو انکی حمایت پر پوری مغل اور شاہی پارٹی تھی لیکن بادشاہ میں خود سوچنے اور سمجھنے کی قابلیت نہ تھی، اور اسکے گرد ایسے لوگ جمع تھے جو بجا طور پر یہ اندیشہ رکھتے تھے کہ بادشاہ پر کسی لائق شخص کے حاوی ہو جانے کے بعد محلسرا کی سیاست میں خود انکے لئے کوئی مرتبہ و مقام باقی نہ رہیگا۔ یہ لوگ عموماً ادنیٰ طبقوں سے تعلق رکھتے تھے، اور انکی ذہنیت، خیالات، بات چیت، طور طریقے، آداب معاشرت، غرض ہر چیز میں اسقدر رذالت تھی کہ عالمگیر کے تربیت کردہ نظام الملک کے لئے انکے ساتھ نباہ کرنا ناممکن تھا۔ اس وجہ سے دو سال تک وہ سیاسی معاملات سے بالکل بے تعلق رہے، اور ۲۹ جمادی الاولی ۱۱۲۹ھ (اپریل ۱۷۱۷ء) میں جب بادشاہ نے انکو مراد آباد کی فوجداری پر[1] مقرر کیا تو انھوں نے اپنی جانب سے کسی نائب کو بھیجنے کے بجائے خود وہاں جانے کو ترجیح دی، کیونکہ وہ اس سازشوں کے گھر سے دور ہی رہنا زیادہ پسند کرتے تھے۔

فرخ سیر اور سید عبداللہ خاں کے اختلافات

دو سال تک فرخ سیر اپنے ان مشیروں کے اشاروں پر چلتا رہا اور اس زمانہ میں

---

[1] منسا رام لکھتا ہے کہ نظام الملک کی فوجداری میں سنبھل مراد آباد کے علاوہ بعض اور معاملات بھی شامل کئے گئے تھے جو پہلے اس فوجداری کے ماتحت نہ تھے۔

سید عبداللہ خاں سے حسبِ معمول کشمکش جاری رہی۔ اس پوری مدت میں اس سے اگر کوئی عقلمندی کا کام سرزد ہوا تو وہ یہ تھا کہ اس نے عنایت اللہ خاں[1] کشمیری کو، جو عالمگیر کے عہد میں دیوان خالصہ تھا، پھر بلا کر دیوان خالصہ اور دیوان تن مقرر کر دیا (١١٢٩ھ/١٧١٧ء)۔ لیکن رتن چند اور عبداللہ خاں نے اسکی سخت مخالفت کی، اور یہ بادشاہ اور وزیر کے درمیان اختلاف کا ایک اور وسیلہ بن گیا۔ عبداللہ خاں تین تین چار چار مہینہ دفتر وزارت کی صورت تک نہ دیکھتا تھا۔ عنایت اللہ نے اس پر اعتراض کیا۔ عنایت اللہ نے غیر مسلموں پر پھر جزیہ عائد کر دیا۔ اس پر رتن چند نے اعتراض کیا۔ عنایت اللہ نے جاگیرات کی جانچ کی تو معلوم ہوا کہ بکثرت لوگوں نے رشوتوں اور جعلسازیوں کے ذریعہ سے اعلیٰ اعلیٰ درجہ کی زمینیں بلا کسی استحقاق کے جاگیر کے طور پر حاصل کر لی ہیں۔ اس نے چاہا کہ ایسی تمام جاگیروں کی سندیں منسوخ کر دی جائیں اور آئندہ کے لیے اسکی روک تھام کی جائے۔ مگر رتن چند نے اسکی مخالفت کی کیونکہ یہی اسکی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ اراضی کے بندوبست پر عنایت اللہ نے نظر ڈالی تو دیکھا کہ رتن چند امانی کا طریقہ[2] موقوف کر کے اجارہ کے طریق کو رائج کر رہا ہے۔ اجارہ میں اس کا یہ فائدہ تھا کہ جو مستاجر زیادہ سے زیادہ رقم پیش کرتا تھا، وہ اس کو اجارہ دے دیتا تھا۔ مگر حکومت کا یہ نقصان تھا کہ مستاجر اپنی پیش کردہ رقم سے کئی گنی زیادہ رقم رعایا سے وصول کرتا تھا اور اس سے رعایا مفلس ہوتے ہوتے حکومت کو مالگذاری

---

[1] یہ وہی عنایت اللہ خاں ہے جس کا بیٹا ہدایت اللہ خاں بہادر شاہ کے عہد میں وزارت خاں کے خطاب کے ساتھ نائب وزیر مقرر ہوا تھا۔

[2] تنخواہ دار ملازموں کے ذریعہ سے براہ راست انتظام کرنے کا طریقہ۔

ادا کرنے کے قابل نہ رہتی تھی۔ اسطرح حکومت کی آمدنی روز بروز گھٹتی چلی جارہی تھی۔ عنایت اللہ نے اس طریقہ کی اصلاح کرنی چاہی، اور رتن چند نے اسکی بھی مخالفت کی۔ عنایت اللہ نے رتن چند کے متوسلین سے حساب فہمی کی، تو انکے ذمہ حکومت کی بڑی بڑی رقمیں واجب الادا نکلیں، مگر جب یہ رقمیں انسے وصول کرنے کی کوشش کی گئی تو رتن چند نے انکی حمایت کی اور شاہی احکام تک کو ٹھکرا دیا۔ ان معاملات میں بنار مخاصمت زیادہ تر رتن چند کی ذات اور اسکی اغراض تھیں، لیکن عبداللہ خاں اسکی حمایت کرتا تھا، اور اس وجہ سے اسکے اور بادشاہ کے درمیان عداوت بڑھتی چلی جاتی تھی۔

محمد مراد کشمیری کا ظہور اور اسکی سازشیں

اس زمانہ میں بادشاہ کو خوف پیدا ہوا کہ ان اختلافات کی خبر سنکر کہیں حسین علیخان دکن سے نہ آجائے۔ اس لئے اس نے محمد امین خاں چین بہادر کو مالوہ کی صوبہ داری پر مقرر کیا تاکہ وہ حسین علی خاں کا راستہ روک دے۔ مگر محمد امین خاں نے اپنے مستقر کی جانب روانہ ہونے میں بہت تساہل کیا، اور جتنا وہ تساہل کرتا گیا اتنی ہی بادشاہ کی بے چینی بڑھتی گئی۔ ایک کشمیری الاصل محمد مراد نامی نے جو میر توزک سوم کے عہدے پر تھا، محمد امین خاں کو کوچ کرنے پر راضی کر دینے کا ذمہ لیا، اور وہ اپنی ایک چال سے اس مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ فرخ سیر کی چھوٹی سی نظر میں یہ کام اتنا بڑا تھا کہ اسی روز سے اس نے محمد مراد کو اپنا مشیر خاص اور ہمدم و ہمراز بنا لیا، اور وہ جگہ جو میر جملہ کے جانے سے خالی ہو گئی تھی، اسطرح پُر ہو گئی۔۔ یہ ایک ۶۲ برس کا بڈھا،

علت المشائخ میں بدنام، اور اپنے برے افعال کے لیے مشہورِ انام تھا۔[1] قابلیت بجز اسکے اور کچھ نہ تھی کہ باتیں بنانی خوب جانتا تھا اور سبز باغ دکھانے کے فن میں طاق تھا۔ اسکے سوا کوئی علمی قابلیت اسمیں نہ تھی۔ عالمگیر کے زمانہ میں اسے منصب پانصدی حاصل تھا۔ بہادر شاہ کے عہد میں ہزاری ہوگیا اور وکالت خاں کا خطاب ملا۔ جہاندار شاہ کے زمانہ میں اس نے کوکلتاش خاں (علی مراد) کی مصاحبت اختیار کی، اور پنج ہزاری منصب تک ترقی کر گیا۔ جب فرخ سیر آگرہ کی فتح کے بعد دہلی پہنچا تو اس کا نام ان لوگوں کی فہرست میں تھا جو گردن زدنی قرار دئے گئے تھے۔ مگر سید عبد اللہ خاں اور حسین علی خاں سے اس کی پرانی ملاقات تھی، اس لئے انکی سفارش پر اسے معاف کر دیا گیا اور دوہزاری منصب پر بحال کیا گیا۔ بعد میں حسین علی خاں کی مہربانی سے محمد مراد خاں کا خطاب، دوہزار و پانصدی منصب اور میر توزک سوم کا عہدہ پایا۔ اس لحاظ سے اسکی زندگی اور اسکی ترقی سب دونوں سیدوں کے احسان کا نتیجہ تھی۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ بادشاہ کے پاس تقرب حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ان دونوں کی

---

[1] ابوالفیض نے اس شخص کی سیرت اسطرح بیان کی ہے:۔

محمد مرادِ کہ آں ناتمام — بُد از علت بنہ رسوائے عام
شدہ رہبر آں شہ بے خبر — باغوای او دارد ایں شور و شر

ایک اور جگہ لکھتا ہے:۔

کہ بودہ است کشمیر اندر نژاد — اگرچہ بمرداں بدادے مراد

مخالفت ہے تو اس نے ان کے احسانات کو یک قلم فراموش کر دیا، اور اپنی پوری قوت انکی برائیاں کرنے، ان کے استیصال کے لئے نئی نئی تدبیریں سمجھانے، اور انکے خلاف سازشیں کرنے میں صرف کر دیں۔ اس نے رفتہ رفتہ بادشاہ کے دل سے صمصام الدولہ خان دوراں (خواجہ عاصم) کے اثر کو بھی دور کر دیا، اور اس کے دل میں یہ بات بٹھا دی کہ خان دوراں پوشیدہ طور پر سیدوں سے ملا ہوا ہے اور اسی وجہ سے ان کے مقابلہ میں کوئی تدبیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ان تدبیروں سے وہ بادشاہ پر اتنا حاوی ہو گیا کہ وہ اسے اپنا سب سے بڑا دوست اور اپنی سلطنت کا سب سے زیادہ قابل آدمی سمجھنے لگا، اسے رکن الدولہ اعتقاد خاں بہادر فرخ شاہی کا خطاب، ہفت ہزاری دہ ہزار سوار منصب، داروغگی ہرکارہ[1]، داروغگی خواص اور داروغگی گرزبرداراں کا عہدہ دیا، اور گجرات دھلی اور آگرہ کے صوبوں میں جو بہترین زمین تھیں وہ اسے جاگیر میں عطا کیں۔

مگر محمد مراد بڑا باتوں کا آدمی تھا۔ سیدوں سے علانیہ مقابلہ کرنے کی نہ اسمیں جرأت تھی نہ قابلیت۔ اسلئے اس نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ سربلند خاں صوبہ دار بہار کو بلا کر اسکی قوت سے

---

[1] سلطنت مغلیہ میں داروغہ ہرکارہ کا عہدہ وہی اہمیت رکھتا تھا جو سلطنت عباسیہ میں صاحب البرید کو حاصل تھی۔ یہ عہدہ دار براہ راست بادشاہ کے ماتحت ہوتا تھا، سلطنت کے وزیر اعظم کو بھی اسپر کوئی اقتدار حاصل نہ تھا، اور اس کا کام یہ تھا کہ بادشاہ کو ملک، رعایا اور اسکے چھوٹے بڑے ملازموں کے تمام حالات سے باخبر رکھے۔

ان دونوں کا استیصال کرے۔ چنانچہ وہ حسب طلب شعبان ۱۱۳۰ھ (جولائی ۱۷۱۸ء) میں دہلی پہنچا۔ محمد مراد نے اسے منصب ہفت ہزاری شش ہزار سوار، اور خطاب مبارز الملک سربلند خاں نامور جنگ دلوایا۔ اور امید دلائی کہ اگر اس نے دونوں سیدوں کا استیصال کر دیا تو اسے وزارت دی جائے گی۔ لیکن دوسرے ذرائع سے اسکو معلوم ہوا کہ یہ محض دھوکہ ہے، اور وزارت کسی اور کے لئے مخصوص کر دی گئی ہے، اسلئے اس نے اپنے آپ کو ہلکہ میں ڈالنے سے پہلے خود بادشاہ سے اسکی تحقیق کرنی ضروری سمجھی، اور ایک روز دریافت کیا کہ دونوں سیدوں کو الگ کرنے کے بعد وہ کس کو وزارت دینا چاہتا ہے؟ بادشاہ نے بے تکلف جواب دیا کہ "میری نگاہ میں اس جگہ کے لئے اعتقاد خاں سے بہتر کوئی اور آدمی نہیں ہے!" اس جواب نے سربلند خاں کی تمام سرگرمیوں کو سرد مہری سے بدل دیا، اس نے دونوں سیدوں کی مخالفت سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور سید عبداللہ خاں نے اسکی مالی امداد کرکے اسے اپنے حامیوں میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد اجیت سنگھ راجہ جودھپور پر نظر ڈالی گئی جو بادشاہ کا خسر بھی تھا۔ اور اسے لانے کے لئے ایک شخص ناصر خاں کو بھیجا گیا جس کے متعلق یقین کیا جاتا تھا کہ بادشاہ کا ہوا خواہ ہے۔ لیکن ناصر خاں در اصل سیدوں کا دوست تھا، وہ اجیت سنگھ کو لایا تو ضرور، مگر بادشاہ کے بجائے سیدوں کا دوست بنا کر۔ اس طرف سے مایوس ہو کر نظام الملک پر نظر ڈالی گئی، اور شوال ۱۱۳۰ھ (ستمبر ۱۷۱۸ء) میں وہ مراد آباد سے طلب کر لئے گئے۔ انھوں نے آکر بادشاہ سے عرض کیا کہ آپ مجھے

وزارت پر سرفراز کردیں اور خرچ سپاہ کے لئے چالیس لاکھ روپیہ نقد دیں۔ پھر عبداللہ خاں سے میں خود سمجھ لونگا۔ مگر بادشاہ نے انکی یہ درخواست قبول نہ کی، اور اسنے یہ خواہش کی کہ کسی بات کا اظہار کئے بغیر وہ اپنے کسی وفادار آدمی کو بھیج کر سید عبداللہ خاں کو خفیہ طریقہ سے قتل کرادیں۔ نظام الملک نے ایسے طریقوں سے کام کرنا پسند نہ کیا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ نے انکو فوجداری مرادآباد سے معزول کردیا اور مرادآباد کو رکن آباد نام دیکر ایک مستقل صوبہ کی حیثیت سے محمد مراد خاں کے حوالہ کردیا۔ اسطرح نظام الملک بھی بادشاہ کے دوستوں کی فہرست سے خارج ہوگئے۔ اب میر جملہ پر قرعہ فال پڑا، اور اسے لاہور سے طلب کیا گیا۔[1] اسپر سید عبداللہ خاں نے دھمکی دی کہ میر جملہ کے بلانے سے وہ معاہدہ ٹوٹ جاتا ہے جسکی رو سے حسین علی خاں دکن بھیجا گیا تھا۔ فرخ سیر یہ سنکر اتنا خوف زدہ ہوا کہ اس نے میر جملہ کا فرمان طلب منسوخ کردیا، اور اسے راستے سے واپس کردینے کے لئے قاصد بھیج دئے۔ مگر باوجود اسکے میر جملہ ذی قعدہ سنہ ۱۱۳۰ھ (ستمبر ۱۷۱۸ء) میں دھلی پہنچ گیا اور وہاں یہ دیکھ کر کہ اب وزیر کا پلہ بادشاہ سے بھاری ہے، اس نے سید عبداللہ خاں سے معافی مانگ لی اور اسکے ہواخواہوں میں داخل ہوگیا۔ فرخ سیر اس غداری پر اتنا غضبناک ہوا کہ اس نے میر جملہ کے خطابات و مناصب ضبط کر لئے اور

---

[1] یہ پٹنہ کی صوبہ داری میں ناکام ہوکر دھلی بھاگ آیا تھا، اور بعد میں اس کو پنجاب کی صوبہ داری پر مقرر کردیا گیا تھا۔

اسے عبداللہ خاں کے ہاں سے نکالنے کے لئے آدمی بھیجے۔ یہ گویا وزیر کے خلاف اعلان جنگ تھا۔ اس نے بادشاہ کے اس فعل کو اپنی صریح توہین قرار دیا اور اسی دن (۵ ر ذی القعدہ مطابق ۲۹ ر ستمبر کو) حسین علی خاں کے نام پیغام بھیج دیا کہ وہ فوراً دکن سے آجائے۔

دکن سے حسین علی خاں کی واپسی حسین علی خاں جو اس زمانہ میں مرہٹوں سے صلح کر کے دہلی جانے کے لئے مستعد بیٹھا تھا، عبداللہ خاں کا پیغام پہنچتے ہی یکم محرم ۱۱۳۱ھ (۲۳ ر نومبر ۱۷۱۸ء) کو اورنگ آباد سے روانہ ہوگیا۔ اس نے دکن میں اپنے بھتیجے اور منہ بولے بیٹے عالم علی خاں کو جو ایک بیس برس کا نوجوان تھا نائب صوبہ دار کی حیثیت سے اپنے پیچھے چھوڑا، اپنے ساتھ ۱۵ ہزار سوار اور دس ہزار پیادہ فوج لی جس میں ۱۲ ہزار مرہٹے[1] بھی بالاجی وشوا ناتھ اور کھنڈو راؤ دبھاڑے کی سرکردگی میں شامل تھے، اور فرخ سیر کو خوف زدہ کرنے کے لئے سب سے بڑی چال یہ کھیلی کہ تیموری خاندان کے ایک فرضی شاہزادے کو ساتھ لے لیا، تاکہ بوقت ضرورت اسے تخت کا مدعی بنا کر فرخ سیر کے مقابلہ میں استعمال کر سکے۔ یہ دکن کے ایک قاضی کا لڑکا تھا جو اپنی ظاہری وجاہت کے لحاظ سے فی الواقع شاہزادہ معلوم ہوتا تھا۔ حسین علی خاں نے مشہور کیا کہ یہ عالمگیر کے باغی بیٹے اکبر کا لڑکا معین الدین ہے جسے راجہ ساہو نے اس شرط پر میرے حوالہ کیا ہے کہ میں اسکے معاوضہ میں بادشاہ سے

---

[1] اس مرہٹہ فوج کو حسین علی خاں نے نربدا پار کرنے کے بعد سے واپسی تک ۸ ر یومیہ فی کس کے حساب سے معاوضہ دیا تھا۔

اسکی ماں اور بہن وغیرہ کو رہا کرا دوں۔ اس دعوے کو نباہنے کے لئے حسین علی نے نام نہاد شاہزادے کے لئے خیمہ و خرگاہ، سواری اور علم وغیرہ کا ویسا ہی انتظام کیا جیسا تیموری شاہزادوں کے لئے کیا جاتا تھا، اور روزانہ وہ خود اسکے حضور میں جا کر شاہی آداب کے مطابق مجرا بجا لاتا تھا۔

بادشاہ کی بے کسی اور خوشامد ان خوفناک اطلاعات سے فرخ سیر کانپ اٹھا۔ اور اس نے ایک شخص اخلاص خاں کو جس سے حسین علی خاں کے گہرے تعلقات تھے، روانہ کیا تاکہ وہ اسے ٹھنڈا کر کے دکن واپس کر دے۔ یہ شخص مانڈو کے قریب حسین علی سے ملا اور اس نے بادشاہ کی سفارت کا حق ادا کرنے کے بجائے سپہ سالار کو الٹا یقین دلایا کہ دہلی میں فی الواقع اس کے بھائی کی زندگی خطرے میں ہے، اور اسکا وہاں پہنچنا نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ حسین علی خاں نے اپنی رفتار اور زیادہ تیز کر دی۔ اجین میں محمد امین خاں صوبہ دار مالوہ موجود تھا۔ بادشاہ نے اسے احکام بھیجے کہ حسین علی خاں کا راستہ روکے دیگر محمد امین خاں نے ان احکام کی تعمیل کے بجائے سیدھا دہلی راستہ لیا۔ اس کی اس حرکت پر بادشاہ نے غضبناک ہو کر اسکے خطابات و مناسب ضبط کر لئے، اور سید عبداللہ خاں نے اس سے فائدہ اٹھا کر محمد امین خاں کو بھی اپنے دوستوں میں شامل کر لیا۔ اسکے ساتھ ہی عبداللہ خاں نے نظام الملک کو بھی دوست بنانے کی کوشش کی، کیونکہ آئندہ جو کارروائی یہ دونوں بھائی کرنا چاہتے تھے، اسمیں اگر انہیں کسی کی مخالفت کا خطرہ تھا تو وہ نظام الملک ہی کی ذات تھی۔ چنانچہ ۱۸؍ ربیع الاول ۱۱۳۱ھ (۷؍ فروری ۱۷۱۹ء) کو عبداللہ خاں خود نظام الملک

سے ملنے گیا۔ اسکے تین چار دن بعد اپنے ہاں انکی دعوت کی اور بیش قیمت تحفے دیے۔ اور اسکے دوسرے دن بادشاہ سے انکے لئے بہار کی صوبہ داری کا فرمان حاصل کیا۔ اس طرح حسین علی خاں کے آنے سے پہلے عبداللہ خاں نے سربلند خاں، اجیت سنگھ، نظام الملک، محمد امین خاں اور دوسرے تمام طاقتور امرا کو فرخ سیر سے الگ کر کے کم از کم اس حد تک اپنا حامی بنالیا کہ ان لوگوں سے اسے کسی مخالفت کا خطرہ باقی نہ رہا۔ اب امراء میں راجہ جے سنگھ والی جے پور کے سوا اور کوئی شخص فرخ سیر کا حامی نہ تھا۔

ربیع الاول کے آخر میں حسین علی خاں دھلی کے قریب پہنچ گیا، بادشاہ کا یہ حال تھا کہ خوشامد کے مارے ہر ہر منزل پر اسے میوے، پان، عطریات اور خوش آمدید کے پیغام بھیجتا تھا، اور حسین علی خان کی کیفیت یہ تھی کہ علانیہ کہتا تھا کہ میں اب بادشاہ کا ملازم نہیں ہوں۔ حد یہ ہے کہ دھلی کے باہر فیروزشاہ کے کوٹلہ پر جب اس نے پڑاؤ ڈالا تو آداب شاہی کے خلاف اپنے سامنے نوبت بجوائی۔ یہ گویا اسکی جانب سے بغاوت کا کھلا اعلان تھا۔ مگر باوجود اسکے خوف زدہ بادشاہ یہ سمجھتا رہا کہ وہ خوشامد کر کے اس کو راضی کرلیگا۔ چنانچہ اس نے اشتیاق ملاقات ظاہر کر کے اسے قلعہ میں آنے کی دعوت دی۔ اس نے جواب دیا کہ جب تک قلعہ کی حفاظت، توپخانہ کی داروغگی، اور بادشاہ کی ذاتی خدمات پر میرے آدمی مقرر نہ ہونگے، میں حاضر نہیں ہوسکتا۔ بے وقوف بادشاہ نے ان باتوں کو بھی قبول کرلیا۔ قلعہ سے صمصام الدولہ پانچ چھ ہزار والا شاہی فوج سمیت رخصت کردیا گیا، حسین علی خاں کے آدمیوں کو قلعہ کے اندر تمام وہ عہدے سپرد کردے

گئے جو اسوقت بادشاہ کے آدمیوں کے ہاتھ میں تھے، اور اسطرح بادشاہ خود بخود اپنے دشمن کی ہاتھ میں قید ہو گیا۔ راجہ جے سنگھ جو اسوقت ۲۰ ہزار فوج لیئے ہوئے دھلی کے باہر پڑا تھا، آخر وقت تک اس کو روکتا رہا۔ اس نے کہا کہ ہمت کر کے جنگ کا اعلان کر دیجئے۔ جب تک میں زندہ ہوں آپ پر آنچ نہ آنے دونگا، اور مجھے امید ہے کہ ایک مرتبہ جب آپ اُٹھ کھڑے ہونگے تو بہت سے امرا جو اسوقت خاموش تماشا دیکھ رہے ہیں، آپ کے علم کے نیچے آجائینگے۔ مگر فرخ سیر نے صرف یہی نہیں کہ اسکی بات نہ مانی، بلکہ سیدوں کو خوش کرنے کے لیئے اسے حکم دیا کہ دھلی سے اپنے وطن آنبیر واپس چلا جائے۔

جب بادشاہ کے پاس اسکے حامیوں میں سے محمد مراد خاں، امتیاز خان مشرف دیوان خاص، اور ظفر خاں (جو بعد میں روشن الدولہ اور محمد شاہ کا یار غار ہوا) کے سوا کوئی باقی نہ رہا، تو حسین علی خاں اور عبداللہ خاں اس سے ملنے گئے اور شان یہ تھی کہ دھلی دروازے سے لیکر لال قلعہ کے دروازے تک مرہٹہ سواروں کی صفیں بندھی ہوئی تھیں۔ فرخ سیر سے حسین علی خاں نے پہلا سوال جو کیا وہ یہ تھا کہ "تمھارا قیدی شاہزادہ اکبر کا بیٹا کہاں ہے؟" حسین علیخان نے جواب دیا کہ وہ میرے ساتھ ہے، مگر مرہٹوں نے یہ عہد لیکر اسی کو میرے حوالہ کیا ہے کہ میں اسے آپ کے سپرد کرنے سے قبل راجہ ساہو کی ماں اور اسکے بھائی وغیرہ کو رہا کرالوں۔ بادشاہ نے اسی وقت ان قیدیوں کی رہائی کا حکم دیدیا۔ مگر حسین علیخاں نے فرضی شاہزادے کو اسکے حوالہ نہ کیا۔

شہر میں ہنگامہ اور مرہٹوں کا قتل عام

اس کے بعد ۸ ربیع الثانی (۲۷ فروری) کو عبد اللہ خان اور اجیت سنگھ نے قلعہ میں جاکر پوری طرح اپنا فوجی قبضہ قائم کر لیا۔ بادشاہ کے تمام حامیوں کو حتی کہ محمد مراد خاں کو بھی نکال باہر کیا، اور اسی روز حسین علی خان اپنی پوری فوج کے ساتھ دھلی میں داخل ہوکر شائستہ خاں کی بارہ دری میں ٹھیرا۔ رات عبد اللہ خاں نے قلعہ میں گذاری۔ دوسرے دن شہر میں خبر اڑ گئی کہ عبد اللہ خاں قلعہ میں قتل کر دیا گیا۔ اس پر بادشاہ کے حامیوں نے جن کے سردار محمد مراد خاں، سادات خاں (خسر بادشاہ) اور چند اور لوگ تھے، حسین علی خاں کے آدمیوں پر حملہ کر دیا۔ اور اسی دوران میں مرہٹہ سپاہیوں سے مغل سپاہیوں کی مڈبھیڑ ہو گئی، جسمیں چند چوٹیں کھانے کے بعد مرہٹے اسقدر بدحواس ہوکر بھاگے کہ انہیں تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ خافی خاں اس موقع پر دھلی میں موجود تھا، وہ مرہٹوں کی اس حالت کا نقشہ اسطرح کھینچتا ہے۔

"لچہای بازار و تماشائیان بیکار و مغلان بے روزگار خبر دار گشتہ تیغا آختہ از ہر طرف دست و بازو بکشتن و تاراج نمودن آں جماعہ بد فرجام کشادند و دستار از سر و سراز بدن و نیزہ از دست و شمشیر از کمر می ربودند۔۔۔۔۔ حتی قصابان و گاذران و خاک روبان و دیگر کاسبان بازار بضرب شمشیر و چوب و دشنہ زبان و نگاہ زہر چشم ہر چہ می توانستند آناں دل باختگان تبہ کار مردم آزار کشیدہ می گرفتند۔۔۔ و بسیارے ازاں ڈبراں بے عارہ پایا

برہنہ و عریاں گشتہ مشت مشت خس و خاشاک بازار و کاہ نجاست آلودۂ خاک روباں در دہاں گرفتہ باظہار عجز و امانِ جاں موافق رویۂ دکنیاں در فرار بر یکدیگر سبقت می نمودند ... و از سر رشتۂ چوک سعد اللہ خاں کہ نزدیک دروازۂ قلعہ ارک واقع شدہ تا بنگاہ آں گروہ کہ از سہ چہار گروہ زیادہ مسافت داشت ہمہ جا ازاں قوم ضال کشتہ و زخمی گشتہ قطار در قطار در رستہ و بازار افتادہ بودند"

دوسرے مورخین نے بھی قریب قریب ایسا ہی بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ سینکڑوں ہزاروں مرہٹے ارے باپ رے! ارے باپ رے! کہتے ہوئے بھاگے جا رہے تھے، راستے میں کہیں کوئی دوکاندار انہیں دیکھکر اپنی جگہ سے اٹھتا تو یہ اپنی تلوار اور ڈھال پھینک دیتے اور ایک ٹانگ پر کھڑے ہوکر "نکو! نکو!" کہتے ہوئے رحم کی درخواست کرنے لگتے۔ اس دار و گیر میں تقریباً ڈیڑھ دو ہزار مرہٹے مارے گئے جنمیں سنتاجی بھونسلے اور دو تین دوسرے نامور سردار بھی تھے، اور مرہٹوں کا جسقدر مال لوٹا گیا، اس کا کوئی شمار نہیں ہے۔[1]

---

[1] دھلی میں مرہٹوں کی اسطرح گت بننے پر قافی خاں اسطرح اظہار مسرت کرتا ہے :- ایں ہمہ محض از افضال الٰہی رو داد۔ و الا فرزنداں آں مدبران تہ نہالی بیشمار سرمایہ ہدف و گذاف می نمودند کہ بپای دھلی رفتیم و بجد و دبار زوی رہنما بادشاہ ہند مقید گشتہ دیگرے اسیر بآرائی دھلی گردانیدیم (۸۰۹-۱۱)

فرخ سیر کا عزل مرہٹوں کی اس شکست سے بادشاہ کے حامیوں کی ہمتیں اور بڑھیں اور انھوں نے خاص حسین علی خاں کے مستقر پر حملہ کر دیا۔

حسین علی خاں نے یہ حال دیکھ کر سید عبداللہ خاں کو کہلا بھیجا کہ اب توقف کا موقع نہیں ہے۔ چنانچہ عبداللہ خاں کے حکم سے افغان سپاہی اور چیلے فرخ سیر کو پکڑنے کے لئے محلسرا میں گھس گئے، عورتوں کو مار پیٹ کر انسے اس مقام کا پتہ معلوم کیا جہاں بادشاہ چھپا ہوا تھا، وہاں پہنچکر اسے زبردستی کھینچتے ہوئے باہر لائے، بادشاہ کی ماں، بیوی، بیٹی اور دوسری محل کی بیگمات حائل ہوئیں، مگر وحشی سپاہیوں نے انہیں دھکے دے دے کر ہٹا دیا اور بادشاہ کو سخت ذلت کے ساتھ کشاں کشاں سید عبداللہ خاں کے پاس لے گئے، جس نے اسکی آنکھوں میں تیل کی سلائی پھیر کر اسکو اندھا کر دیا، اور ترپولیہ کے اوپر ایک تنگ و تاریک حجرے میں قید کرا دیا۔ اس ہنگامہ کے وقت شاہجہان اور عالمگیر کے محلات میں خواتین حرم پر جو کچھ گذری، جس طرح ان کی بے حرمتیاں ہوئیں، انکے زیورات لٹے، اس کا اندازہ کرنے کے لئے صرف اس بات کا تصور کر لینا کافی ہے کہ ان لوگوں کو پہلی مرتبہ اُس جگہ بار ملا تھا جہاں اس سے پہلے ان کے تخیل کو بھی رسائی حاصل نہ ہو سکتی تھی، اور جہاں کے حسن اور دولت کے فسانے یہ لوگ اور انکے بڑے بوڑھے بچپن سے اپنے گہواروں میں سنتے چلے آئے تھے۔ ایک مشہور روایت یہ بھی ہے کہ خود سید عبداللہ خاں نے بھی اس نادر موقع سے فائدہ اُٹھا کر حرم شاہی کی دو تین مہ جبینوں پر قبضہ کر لیا۔

۶ - رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ

بادشاہ وقت کو اسطرح معزول کرنے کے بعد دونوں سید سلطنت کے مالک تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اسوقت ایک تجویز یہ بھی پیش کی گئی تھی کہ تیموری خاندان کا خاتمہ کر کے ہندوستان پر خاندان سادات کی حکومت قائم کر دی جائے، اور حالات یقیناً ایسے تھے کہ اس قسم کا خیال دلوں میں آنا غیر فطری نہ تھا۔ لیکن اغلب خیال یہ ہے کہ اس تجویز کو دو وجوہ سے رد کر دینا پڑا ہوگا۔ ایک یہ کہ ملک کے تمام طاقتور سیاسی گروہ مثلاً تورانی، ایرانی، افغانی، اور راجپوت جو تیموری خاندان کی وفاداری پر متفق تھے، سادات کی بادشاہی کو کسی حال میں قبول کرنے کے لئے طیار نہ ہوتے، اور سادات کے پاس ہرگز اتنی قوت نہ تھی کہ وہ ان سب گروہوں کو بجبر اپنی اطاعت پر راضی کر سکتے یا انکی طاقت کو بزور شمشیر مٹا سکتے۔ دوسرے یہ کہ خود دونوں بھائیوں میں نفسانیت اسقدر بڑھی ہوئی تھی کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کی اطاعت قبول کرنے پر طیار نہ تھا۔ عباسیوں میں منصور اور سفاح کے درمیان جو اتحاد تھا وہ ان بھائیوں میں نہ تھا۔ یہاں تو اگر ایک اپنی بادشاہی کا اعلان کرتا تو دوسرا غیروں سے پہلے اس کے مقابلہ میں تلوار کھینچ کر کھڑا ہو جاتا۔ ان وجوہ سے سلطنت ہند میں ایک نہایت اہم انقلاب ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اب خود تیموری خاندان میں سے ایک شخص کو بادشاہ بنانا ضروری تھا، مگر وہ ایسا ہونا چاہیے تھا کہ تخت پر بیٹھے اور حکومت دونوں سید کریں۔ چنانچہ ایسے ایک مورکھ شاہزادے کو لانے کے لئے

ایک جماعت محلات میں گھسی اور رفیع الشان بن شاہ عالم بہادر شاہ کے سب سے چھوٹے بیٹے رفیع الدرجات کو پکڑ لائی جو ایک ۲۰ برس کا دق زدہ لڑکا تھا۔ عبداللہ خاں اور اجیت سنگھ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسی لباس میں جو وہ پہنے ہوئے تھا اسے تخت طاؤس پر لا بٹھایا (۹ ربیع الآخر ۱۱۳۱ھ) اور نقارخانہ شاہی کے شادیانوں نے شہر میں نئے بادشاہ کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ اس آواز نے فرخ سیر کے حامیوں کی ہمتیں پست کر دیں، حسین علی خاں کے مقابلہ میں جو ہنگامہ برپا تھا، آن کی آن میں سرد ہو گیا، اور گروہ مخالف کے سردار محمد مراد خاں سادات خاں اور دوسرے لوگ گرفتار کر لئے گئے۔

ابوالبرکات سلطان شمس الدین محمد رفیع الدرجات کی تخت نشینی کے بعد سب سے پہلے جو انتظامات کئے گئے وہ یہ تھے:۔

راجہ اجیت سنگھ والی جودھ پور، اور راجہ رتن چند دیوان کی درخواست پر جزیہ ہمیشہ کے لئے موقوف کر دیا گیا۔

مختلف جماعتوں کے سرداروں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی، اور اس سلسلہ میں محمد امین خاں کو بخشی دوم اور ظفر خاں کو بخشی سوم کا عہدہ دیا گیا۔

نظام الملک صوبہ داری مالوہ پر نظام الملک کو فرخ سیر کے آخر عہد میں بہار کی صوبہ داری دی گئی تھی، مگر وہ اپنے مستقر پر جانے کے بجائے دھلی میں بیٹھے ہوئے تھے، اور اس زمانہ میں جو کچھ ہو رہا تھا اسے خاموشی کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ انکی یہ خاموشی دونوں سیدوں کے لئے سخت پریشان کن تھی، اور وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ انکے لئے اگر کسی طرف سے

خطرہ ہے تو وہ نظام الملک ہی کی ذات ہے۔ حسین علی خاں کی قطعی رائے یہ تھی کہ اُن کو قتل کر دیا جائے، مگر سید عبداللہ خاں اس کا مخالف تھا، کیونکہ نظام الملک پر ہاتھ ڈالتے ہی تورانی پارٹی کے تمام لیڈر مقابلہ پر کھڑے ہو جاتے اور ایک فتنۂ عظیم برپا ہو جاتا۔ آخر یہ رائے قرار پائی کہ ان کو دار السلطنت سے دور بھیج دیا جائے، اور جب وہ اپنے حامیوں سے جدا ہو کر کمزور ہو جائیں تو انکا استیصال کر دیا جائے۔

چنانچہ ان کو مالوہ کی صوبہ داری پیش کی گئی جسے انھوں نے بہت انکار و تامل کے بعد قبول کر لیا، اور ۲۴ ربیع الآخر ۱۱۳۱ھ (۱۵ مارچ ۱۷۱۹ء) کو دھلی سے روانہ ہو گئے۔ مگر آئندہ جو کچھ ہونے والا تھا، اس کا نقشہ انھوں نے اسی وقت اپنے ذہن جما لیا تھا۔ اسلئے وہ اپنے تمام اہل خاندان، اپنے مال و اسباب، اور ان سب مغل سرداروں کو جو ان کے خاندان کے متوسل تھے اپنے ساتھ لے گئے اور سید بھائیوں کے اصرار کے باوجود دربار میں اپنی نیابت کے لئے اپنے کسی بیٹے کو بھی نہ چھوڑا۔

مرہٹوں کو چوتھ اور سردیسمکھی کی اسناد راجہ ساہو کے پیشوا بالاجی وشواناتھ کو چوتھ اور سردیسمکھی کی باضابطہ سندیں عطا کی گئیں اور اسطرح حسین علی خاں اور ساہو کے اس معاہدہ کی تصدیق بادشاہ کی طرف سے بھی ہو گئی جسے فرخ سیر نے رد کر دیا تھا۔ ان اسناد میں پہلی سند کی تاریخ تحریر ۲ ربیع الآخر ۱۱۳۱ھ ہے اور دوسری کی تاریخ ۴ جمادی الاولی ۱۱۳۱ھ۔

فرخ سیر کا قتل - فرخ سیر ابھی تک زندہ تھا اور اطراف ملک میں اسکے بہت سے حامی موجود تھے جن میں راجہ جے سنگھ سب سے زیادہ

طاقتور تھا۔ اس سے سیدوں کو رجعت کا خطرہ ہوا اور انھوں نے ۸ - ۹ جمادی الاولیٰ کی درمیانی شب میں فرخ سیر کو سخت عذاب کے ساتھ قتل کرا دیا[1] اس حرکت سے تمام شہر میں ایک طوفان برپا ہو گیا۔ معزول و مقتول بادشاہ کا جنازہ جب قلعہ سے ہمایون کے مقبرے کی جانب روانہ ہوا تو پندرہ بیس ہزار آدمیوں کا مجمع روتا پیٹتا ساتھ ہو گیا۔ دہلی دروازے تک سڑک، گلی کوچوں، اور دو رویہ عمارتوں پر لوگوں کے ٹھٹھ لگ گئے جنکی آہ و فغاں سے ہنگامہ محشر بپا ہو گیا۔ جنازے کے ساتھ حفاظت کے لئے سیدوں نے ایک فوجی دستہ کر دیا تھا جسکے سرگردہ دلاور علی خاں اور سید علی خاں (دونوں سیدوں کی فوج کے بخشی) تھے۔ غضبناک مجمع نے ان لوگوں پر اینٹ پتھر برسائے اور ہر طرف سے لعنت ملامت کی بوچھاڑ کر دی۔ فقیروں کو خیرات کے طور پر پیسے اور روٹیاں دی گئیں تو انھوں نے نفرت کے ساتھ انہیں پھینک دیا، اور بھک منگوں نے اس کے بعد بھی ایک مدت تک ان امرا کی خیرات قبول نہیں کی جو فرخ سیر کے قتل میں شریک تھے۔ یہی نہیں بلکہ جب کبھی یہ امرا بازاروں سے گذرتے تھے تو عوام انکو برملا گالیاں دیتے اور انکے پیچھے آوازے کستے ہوئے دوڑتے تھے۔ خاص کر مہاراجہ اجیت سنگھ کے خلاف (کیونکہ وہ فرخ سیر کا خسر تا) اس نفرت کا اظہار اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ ہوتا

---

[1] قتل کے وقت فرخ سیر کی عمر ۳۶ یا ۳۵ سال کی تھی کہا جاتا ہے کہ مغل بادشاہوں میں سب سے زیادہ حسین اور تنومند شخص تھا۔

تھا حتیٰ کہ اس نے شرم کے مارے عام شاہراہوں سے گذرنا چھوڑ دیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد جب وہ گجرات کی صوبہ داری پر جانے کے لئے شہر سے گذرا تو لوگوں نے اس پر گالیوں کی اتنی بوچھاڑ کی کہ وہ کھسیانا ہو گیا اور اس نے دو تین آدمیوں کو پکڑوا کر قتل کرا دیا۔ یہ تو خیر عوام تھے، خواص کا بھی یہ حال تھا کہ ایک قلیل جماعت کے سوا (جن کا بیشتر حصہ شیعہ تھا) اہل الرائے لوگوں نے اس فعل کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھا، اور اس کا ارتکاب کرنے والوں پر ملامت کی۔ بیدل جیسے سنجیدہ اور گوشہ نشین شخص کی اس معاملہ میں جو رائے تھی وہ اس نے اپنی اس رباعی میں ظاہر کی ہے:۔

دیدی کہ چہ باشاہ گرامی کردند
صد جور و جفا زراہ خامی کردند
تاریخ چو از خرد جُستم فرمود
سادات بوے نمک حرامی کردند

رائے عام کا یہ ہیجان، جو بادشاہ اور شاہی خاندان کی اسطرح تذلیل و توہین ہوتے دیکھ کر فطری طور پر امنڈ آیا تھا، اس بنا پر اور بڑھ گیا کہ دونوں سیدوں نے فرخ سیر کو معزول کر کے جس بادشاہ کو تخت پر بٹھایا، وہ برائے نام بادشاہ تھا اور سیدوں کا یہ ارادہ صریح ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ رفتہ رفتہ تیموری خاندان کی بادشاہی کا خاتمہ کر کے خود مالک الملک بننا چاہتے ہیں۔ انھوں نے نئے بادشاہ کو بالکل اپنے قیدی کی حیثیت سے رکھ چھوڑا تھا قلعہ کے دروازے سے لیکر محلات تک ہر جگہ سیدوں کے آدمی متعین تھے ایک شخص ہمت خاں بادشاہ کا اتالیق مقرر کیا گیا تھا جس کی اجازت کے بغیر بادشاہ کھانا تک نہیں کھا سکتا تھا۔ محلسرا سے باہر نکلنے کا تو

اس کو موقع ہی نہ دیا جاتا تھا۔ اس قید سے زیادہ وہ ذلت کا برتاؤ تھا جو دونوں سید اس بادشاہ کے ساتھ کرتے تھے۔ بڑے بھائی عورتوں کے شوقین تھے، انھوں نے خاص بادشاہ بیگم (عنایت بانو) کو محبت کا پیغام بھیجا۔ چھوٹے بھائی کو کبریائی کا شوق تھا، وہ ایک مرتبہ تسبیح خانہ میں بادشاہ کے برابر جا بیٹھے۔ تکبر کے جوش میں کبھی کبھی یہ صاحب یہاں تک کہہ جاتے تھے کہ جس کے سر پر ہم اپنی جوتی رکھ دینگے وہ عالمگیر بادشاہ کا جانشین ہو جائیگا۔ لوگ ان واقعات کو سنتے تھے اور غم و غصہ سے بیتاب ہو جاتے تھے۔ ۱۲ برس قبل عالمگیر کے عہد میں جن آنکھوں نے مقام شاہی کی حرمت و عزت کے وہ سماں دیکھے تھے انکو یہ مناظر اگر کانٹوں کی طرح نہ کھٹکتے تو اور کیا ہوتا۔

آگرہ میں نیکوسیر کا دعوئ بادشاہی

ان حالات میں سیدوں کی طاقت کے خلاف سازشیں شروع ہو گئیں جو آخر کار اُن کے لئے مہلک ثابت ہوئیں۔ اس سلسلہ کی پہلی سازش وہ تھی جو آگرہ میں ہوئی۔ قلعہ آگرہ میں تیموری خاندان کے متعدد شاہزادے قید تھے جنمیں سے ایک عالمگیر کے باغی شاہزادے اکبر کا بڑا بیٹا نیکوسیر بھی تھا۔ گو اب اسکی عمر ۳۲ سال کی تھی، مگر تین سال کی عمر سے یہ قلعہ میں مقید تھا، اور اس دوران میں کبھی اسکو باہر کی دنیا دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اسکی ناواقفیت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ اس نے ایک گائے کو دیکھ کر حیرت سے پوچھا کہ یہ کیا جانور ہے اور اس کو کیا کہتے ہیں۔ اس طفل کہن سال کی خدمت میں ایک چالاک برہمن مترسین نامی شخص متعین تھا جس نے اپنے سودی کاروبار اور کچھ اپنی طبی واقفیت

کی بنا پر قلعہ آگرہ کے فوجی افسروں اور سپاہیوں میں رسوخ پیدا کر لیا تھا۔ جب فرخ سیر کی عزل اور قتل سے ملک میں عام طور پر دونوں سیدوں کے خلاف ناراضی کے جذبات مشتعل ہو گئے، تو اس نے خیال کیا کہ اگر میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر نکوسیر کو بادشاہ بنوا دوں تو ملک کی رائے عام اور سیدوں کے مخالف امرا کی ایک طاقتور جماعت میرا ساتھ دیگی، بادشاہ میری مٹھی میں رہیگا، اور میں سبھا چند اور رتن چند سے بھی بڑھ جاؤں گا۔ چنانچہ اس نے قلعہ کی فوج کے ہزاریوں اور بکسریوں کو ہموار کر کے، ۹ جمادی الآخری ۱۱۳۱ھ (۱۸ مئی ۱۷۱۹ء) کو نیکوسیر کی بادشاہی کا اعلان کر دیا، خود ہفت ہزاری منصب اور راجہ بیربل کا خطاب حاصل کر کے اس کا وزیر بنا، ایک کروڑ ۸۰ لاکھ روپیہ قدیم شاہی خزانہ سے نکالکر فوج میں تقسیم کیا، فرخ سیر کے حامی امرا مثلاً نظام الملک صوبہ دار مالوہ، راجہ جے سنگھ والی آنبیر، اور راجہ چھبیلہ رام ناگر صوبہ دار الہ آباد کو نئے بادشاہ کی حمایت میں آنے کی دعوت دی، اور سیدوں کے بھیجے ہوئے نئے صوبہ دار سید عزت خاں کو قلعہ کا قبضہ دینے سے انکار کر دیا۔

نیکوسیر کی دعوت رد کی جاتی ہے

مگر مترسین نے جو کچھ سوچا تھا اسمیں وہ ناکام رہا۔ بغاوت قلعہ آگرہ کے حدود سے باہر نہ بڑھ سکی۔ راجہ جے سنگھ امداد کے لئے ضرور آمادہ ہوا، لیکن وہ تنہا اپنے اندر دونوں سیدوں کے مقابلہ کی قوت نہ دیکھتا تھا۔ اس نے پہلے معلوم کرنا چاہا کہ نظام الملک اور چھبیلہ رام کیا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان دونوں امیروں میں سے چھبیلہ رام کی شرکت یقینی تھی کیونکہ وہ فرخ سیر

اور اسکے باپ کے سرگرم حامیوں میں سے تھا۔ مگر سید عبداللہ خاں نے اسکو کالپی کے زمیندار جبسن سنگھ کے ساتھ الجھا دیا اسلئے وہ جے سنگھ کے ساتھ اتحاد عمل کرنے سے معذور ہو گیا۔ رہے نظام الملک تو اُن جیسے بالغ النظر مدبر کے لئے ناممکن تھا کہ وہ شخص سیدوں کی مخالفت کے جوش میں اپنے آپ کو ایک ایسی بے بنیاد اور بے زور تحریک میں شامل کر دیتے جس کو بے سوچے سمجھے، بغیر کسی طیاری اور بلا کسی پختہ اور مکمل نقشہ کے نیکو سیر جیسے بے خبر بے عقل شاہزادے کو آلہ کار بناکر، ایک ایسے شخص نے شروع کیا تھا جو چالاک اور منصوبہ باز تو ضرور تھا، مگر نہ عامۂ خلائق یا امرا میں اس کا کوئی اثر تھا، نہ آگرہ کی قلعہ نشین فوج کے سوا کوئی اور فوجی قوت اس کے ہاتھ میں تھی، نہ وہ سیاسی معاملات میں بصیرت اور عملی تجربہ رکھتا تھا، اور نہ اسمیں سالاری و قیادت کی قابلیت تھی۔ انھوں نے اس تحریک کے بانیوں اور حامیوں کو نہ جواب صاف دیا نہ انکی ہمت افزائی کی، اور نہ انکی تائید میں کوئی عملی قدم اٹھایا۔ یہ حال دیکھ کر جے سنگھ کا جوش و خروش بھی ٹھنڈا ہو گیا اور اُس نے بھی نئے بادشاہ اور وزیر کو انکے حال پر چھوڑ دیا۔ اب مترسین نے ایک دوسرا ڈھنگ اختیار کیا۔ اس نے نیکوسیر کیجانب سے دونوں سیدوں کو لکھا کہ "تم نے یہ کس بچے کو ہندوستان کے تخت پر بٹھایا ہے، جب میں بڑا موجود ہوں تو چھوٹے کو بٹھانا کیسے جائز ہو سکتا تھا۔ اگر تم میری اطاعت کرو تو میں تمھارے وہی مراتب و مناصب برقرار رکھونگا جو تم کو ابتک حاصل تھے۔ عبداللہ خاں فطرۃً سہل تر راستہ کو اختیار کرنا پسند کرتا تھا، اسے ایک کاٹھ کے

کی ضرورت تھی جسے تخت پر بٹھا کر وہ خود فرمانروائی کرے۔ یہ پتلی خواہ رفیع الدجات کی صورت کا ہو یا نیکوسیر کی شکل کا، اس سے اس کو کوئی بحث نہ تھی۔ اسلئے وہ نیکوسیر سے معاملہ طے کرنے اور اسے دہلی لے آنے پر آمادہ ہوگیا۔ مگر حسین علی خاں ایک ضدی سپاہی تھا اس نے اصرار کیا کہ آگرہ کے ان مٹھی بھر آدمیوں نے ہمارے ارادے میں مزاحمت کرنے کی جو جرأت بد کی ہے، اس کی انہیں ایسی سزا دینی چاہیے کہ پھر کوئی ہمارے مقابلہ میں سر اٹھانے کی ہمت نہ کر سکے۔ اسپر دونوں بھائیوں کے درمیان ایک عرصہ تک مناظرہ ہوتا رہا، اور اسی وجہ سے حسین علیخاں کو (جو ۷ رجب سے دہلی کے باہر فوجیں لے کر نکل آیا تھا) آگرہ جانے میں دیر بھی لگی، لیکن آخر کار حسین علی کی ضد عبداللہ خاں کی صلح پسندی پر غالب آگئی۔

رفیع الدولہ کی تخت نشینی اس دوران میں رفیع الدرجات کا عارضۂ دق شدت اختیار کر گیا، اور اس نے خواہش کی کہ اسکی زندگی ہی میں اسکے بڑے بھائی رفیع الدولہ کو تخت پر بٹھا دیا جائے۔ چنانچہ ۱۷ رجب ۱۱۳۱ھ (۴ جون ۱۷۱۹ء) کو ۳ مہینہ نو دن کی حکومت کے بعد رفیع الدجات تخت سے اتار دیا گیا[1] اور اور اس کے دو یا تین دن بعد رفیع الدولہ شاہجہاں ثانی[2] کے لقب سے

---

[1] اسکے چند روز بعد ۲۴ رجب کو رفیع الدرجات کا انتقال ہوگیا۔

[2] یہ رفیع الدرجات سے صرف ۱۸ مہینہ بڑا تھا۔ دونوں سیدوں نے اسکو بھی رفیع الدرجات کی طرح قیدیوں کی طرح رکھا۔ اسکا اتالیق ہمت خاں بارہہ ہمزاد کی طرح اس کے ساتھ لگا رہتا تھا، اور جمعہ کی نماز ہو، یا شکار، یا کسی امیر سے ملاقات، غرض ہر موقع پر اس کا یا اس کے کسی آدمی کا بادشاہ کے ساتھ رہنا ضروری تھا۔

تخت نشین کیا گیا۔ اب نیکو سیر کے ساتھ صلح ہونے کا جو تھوڑا بہت امکان تھا وہ بھی باقی نہ رہا۔

قلعہ آگرہ کی فتح شعبان (جولائی ۱۷۱۹ء) میں حسین علی خاں اور اسکے ساتھ محمد امین خان، صمصام الدولہ خاں اور ظفر خاں آگرہ پہنچے اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ نیکو سیر کے حامی ایک مہینہ تک اس امید پر وقت کرتے رہے کہ جے سنگھ، چھبیلہ رام اور نظام الملک انکی مدد کو آئینگے۔ مگر جب وہ بالکل مایوس ہو گئے تو انھوں نے ۲۷ رمضان (۱۲ اگسٹ ۱۷۱۹ء) کو ہتھیار ڈالدیئے اور قلعہ پر دونوں سیدوں کا قبضہ ہو گیا۔ نیکو سیر گرفتار ہو کر آیا تو حسین علی خاں اسکے سامنے ادب کے ساتھ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا اور اسے مسند پر جگہ دی، مگر عالمگیر کا یہ پوتا جس نے ساری عمر محلسرا میں گذاری تھی، عاجزی کے ساتھ میر بخشی کے سامنے جھک گیا اور اس سے خالص بیگمات کی زبان اور زنانہ لہجے اور انداز کلام میں بلک بلک کر اپنی جان بخشی کی التجائیں کرنے لگا۔ بابر و تیمور کی اولاد کو اتنی پستی کی حالت میں دیکھ کر حسین علی خاں کو بھی ترس آگیا، اور اس نے تسلی دلاسا دیکر اسے زندگی کے بقیہ دن گذارنے کے لئے سلیم گڈھ (دہلی) کے شاہی قیدخانہ میں بھیج دیا۔ اسکے بعد قلعہ آگرہ کے قدیم دفائن و خزائن کی تلاش شروع ہوئی جو سکندر لودی اور بابر کے زمانہ سے عالمگیر کے عہد تک جمع ہوتے رہے تھے، اور جن کی شہرت افسانوں کی طرح دور دور پھیلی ہوئی تھی۔ پرانے پرانے خزانچی اور نگہبان ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائے گئے اور ان کو ہر قسم کی دھمکیاں اور لالچ دے کر چھپے ہوئے خزانوں کا پتہ پوچھا گیا۔ اس طرح جسقدر نقد روپیہ اور قیمتی

سامان حاصل ہوا اسکی مجموعی مالیت ایک اندازہ کے مطابق ایک کرور اسی لاکھ اور ایک دوسرے اندازہ کے مطابق دو اور تین کرور روپیہ کے درمیان تھی، اور انہیں ایسی بیش بہا چیزیں بھی دستیاب ہوئی تھیں جیسے نور جہاں کی مرصع بجواہر شال، جہانگیر کی مرصع تلوار اور وہ موتیوں کی چادر جو شاہجہاں نے ممتاز محل کی قبر پر چڑھانے کے لیئے بنوائی تھی۔ اس تمام دولت پر تنہا حسین علی خاں نے قبضہ کرلیا۔ عبداللہ خاں اسوقت بادشاہ کو لیئے ہوئے دھلی سے آگرہ آرہا تھا، اور ابھی راستہ میں تھا۔ اسے یہ خبر پہنچی تو وہ تیزی کے ساتھ کوچ کرتا ہوا آگرہ پہنچا، اور اس نے چھوٹے بھائی سے سختی کے ساتھ اپنے حصہ کا مطالبہ کیا۔ دونوں بھائیوں میں اس پر سخت بدمزگی پیدا ہوگئی۔ رتن چند کو خوف ہوا کہ یہ نااتفاقی کہیں دونوں کو تباہ نہ کردے اُس نے بیچ میں پڑکر تصفیہ کرادیا جسکی رو سے بادشاہ کے حصہ میں صرف جہانگیر کی تلوار اور نور جہاں کی شال آئی، عبداللہ خاں کو ۲۱ لاکھ روپیہ ملا، اور باقی سب مال حسین علی خاں کے قبضہ میں رہا۔ مورخین کا بیان ہے کہ تصفیہ ہوجانے کے باوجود، اس واقعہ کے بعد سے دونوں بھائیوں کے درمیان وہ اتفاق و اتحاد باقی نہیں رہا جو اس سے پہلے تھا۔

۷۔ محمد شاہ کا دور حکومت

اس واقعہ کے چند روز بعد رفیع الدولہ کی صحت نے بھی جواب دیدیا اور ۵ ذوالقعدہ ۱۱۳۱ھ (۱۷ تا ۱۸ ستمبر ۱۷۱۹ء) کو اس نے وفات پائی۔ اسکی بیماری ہی کے زمانہ میں دھلی سے جہاں شاہ

ابن شاہ عالم بہادر شاہ کے بیٹے روشن اختر کو لانے کے لئے آدمی بھیجدیئے گئے تھے۔ یہ شاہزادہ رفیع الدولہ کی وفات کے ایک ہفتہ بعد آگرہ پہنچا اور ۱۵ ذی القعدہ ۱۱۳۱ھ (۲۸ ستمبر ۱۷۱۹ء) کو ۱۸ سال کی عمر میں ابوالفتح ناصر الدین محمد شاہ کے لقب سے تخت سلطنت پر بٹھایا گیا۔

جے سنگھ سے مصالحت ۔ آگرہ کی مہم اور نئے بادشاہ کی تخت نشینی سے فارغ ہونے کے بعد دونوں سیدوں نے اپنے مخالف امرا کی طرف توجہ کی جنسے انہیں خطرہ لگا ہوا تھا۔ انمیں سب سے زیادہ سرگرم جے سنگھ تھا، جو راجپوت رسم کے مطابق اپنا دارالریاست آنبیر برہمنوں کو دان دے، زعفرانی لباس پہن، مرنے مارنے کا عہد کرکے فرخ سیر کا بدلہ لینے کے لئے نکل آیا تھا۔ حسین علی خاں نے چاہا کہ اس کے مقابلہ پر فوج لے جائے۔ مگر اجیت سنگھ والی جودھپور نے بیچ میں پڑکر صلح کرادینے کا ذمہ لیا، اور جے سنگھ سے مل کر اس نے اسطرح صلح کرائی کہ اپنی بیٹی اس سے بیاہ دی، شاہی خزانہ سے لڑکی کے جہیز کے طور پر ۲۰ لاکھ روپیہ دیا گیا، اور جے سنگھ کو سرکار سورت کی حکومت دی گئی۔ اس سے پہلے اجیت سنگھ کو اجمیر اور گجرات کی صوبہ داری پر مقرر کیا جا چکا تھا۔ اب اسکے داماد جے سنگھ کو سورت کی حکومت دیکر دونوں نے ملک کا اتنا بڑا علاقہ ان طاقتور راجپوت سرداروں کے حوالہ کر دیا جو دارالسلطنت کے جنوب میں ۶۰ میل کے فاصلہ سے شروع ہوکر ساحل سمندر تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ ان بادشاہ گر سیدوں کی ریاست دانی کا حال تھا۔

گردھر بہادر سے مصالحت ۔ جے سنگھ کے بعد دوسرا دشمن چھبیلہ رام ناگر

تھا۔ یہ فرخ سیر کے باپ عظیم الشان کا بنایا ہوا آدمی تھا، فرخ سیر نے تخت شاہی پر بیٹھتے ہی اسے دیوانی کا عہدہ دینا چاہا تھا، مگر عبداللہ خاں کی شدید مخالفت سے مجبور ہو کر اکبر آباد کا صوبہ دار مقرر کر دیا تھا۔ اس وقت سے اسکے دل میں عبداللہ خاں کی طرف سے گرہ بیٹھ گئی تھی۔

بعد میں وہ الہ آباد کے صوبہ پر منتقل کر دیا گیا، اور وہاں فرخ سیر کے عزل و قتل کی خبر سنتے ہی اس نے علی الاعلان بغاوت کر دی۔ اسکی بغاوت کا ایک بڑا نقصان یہ تھا کہ بنگال اور بہار کے صوبوں سے دار السلطنت کا تعلق منقطع ہو گیا تھا، اور ادھر سے مال خراج نہیں آسکتا تھا۔ سیدوں نے اس کو قابو میں لانے کے لئے اسکے بھتیجے گردھر بہادر کو پکڑ کر قید کر لیا اور اسکے مقابلہ میں کالپی کے زمیندار جسن سنگھ کو کھڑا کر دیا۔ مگر انکی یہ چال کامیاب نہ ہو سکی۔ گردھر بہادر قید سے نکلکر اپنے چچا سے جا ملا اور دونوں نے ملکر جسن سنگھ کو زیر کر لیا۔ اسکے کچھ عرصہ بعد چھبیلہ رام ناگر مر گیا (ذی الحجہ ۱۱۳۱ھ، نومبر ۱۷۱۹ء) اور گردھر بہادر نے اسکی جگہ سنبھال کر فتنہ کو پہلے سے بھی زیادہ تیز کر دیا۔ اسپر محرم ۱۱۳۲ھ (نومبر ۱۷۱۹ء) میں حیدر قلی خاں اسفراینی الہ آباد کی تسخیر کے لئے بھیجا گیا جس نے گردھر بہادر کو محصور کر کے بہت پریشان کیا، مگر گردھر کے پاس فوج اور سامان رسد کی کمی نہ تھی اور الہ آباد کا مضبوط قلعہ اسکے قبضہ میں تھا، اسلئے حیدر قلی خاں اسکو زیر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ حسین علی خاں نے چاہا کہ خود اس مہم پر جائے، مگر عبداللہ خاں نے اسکی سخت مخالفت کی۔ اسکے دل پر آگرہ کے خزانوں کا داغ تازہ تھا۔ اس نے کہا کہ

حسین علی نے آگرہ کے خزانے لوٹے تو اب الہ آباد کا مال غنیمت میرے حصہ میں آنا چاہیے۔ قریب تھا کہ دونوں بھائیوں میں لڑائی ہو جائے۔ لیکن رتن چند نے پھر مداخلت کی، اور دونوں کے درمیان تصفیہ اس بات پر ہوا کہ رتن چند کو الہ آباد بھیجا جائے اور وہ گردھر بہادر سے صلح کرے۔ چنانچہ جمادی الاولیٰ میں وہ الہ آباد گیا اور جمادی الآخری ۱۱۳۲ھ (مئی ۱۷۲۰ء) میں گردھر سے صلح کرلی جس کی رو سے وہ اودھ کا صوبہ دار بنایا گیا، تمام ماتحت سرکاروں کے دیوان اور فوجدار مقرر کرنے کا اسے اختیار دے دیا گیا، اور ۳۰ لاکھ روپیہ انعام کے طور پر بھی دیا گیا۔

نظام الملک سے مخالفت کی ابتدا ان دونوں مخالفوں سے دب کر صلح کرنے کی وجہ یہ تھی کہ دونوں سیدوں کو اپنے سب سے زیادہ طاقتور مخالف نظام الملک کے مقابلہ میں اپنی پوری قوت صرف کرنی تھی۔ انھوں نے نظام الملک کو مالوہ کی صوبہ داری پر اس مصلحت سے بھیجا تھا کہ ایک طرف دکن میں ان کا بھتیجا عالم علیخان نائب صوبہ دار کی حیثیت سے موجود تھا، دوسری طرف انکے احسانمند مرہٹے تھے، تیسری طرف آگرہ کے صوبہ میں ان کا بھائی غیرت خاں صوبہ دار تھا، اور چوتھی جانب گجرات کا صوبہ دار ان کا سرگرم حامی اجیت سنگھ تھا۔ ان کو امید تھی کہ ان چار طاقتوں کے درمیان نظام الملک اسطرح گھرے رہینگے کہ ان کو سرتابی کی جرأت نہ ہوسکیگی، اور جے سنگھ، چھبیلہ رام، اور گردھر بہادر کو مطیع کرنے کے بعد ان کا بآسانی خاتمہ کردیا جائیگا۔ چنانچہ اس منصوبہ کے مطابق انھوں نے اپنے دوسرے مخالفین کو صلح و آشتی سے راضی کرکے

نظام الملک سے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ ان کے خلاف الزامات کی ایک فہرست طیار کی گئی جن کا خلاصہ یہ ہے :-

۱۔ مرحمت خاں حاکم مانڈو کو حسین علی خاں نے اس قصور میں معزول کر دیا تھا کہ دکن سے واپسی پر جب حسین علی مانڈو کے قریب سے گذرا تھا تو وہ اس سے ملنے نہیں آیا تھا۔ لیکن نظام الملک نے اسے معزول کرنے کے بجائے اپنی ملازمت میں رکھ لیا اور رام گڈھ کے زمیندار جے بندیلے کے خلاف مہم پر بھیج دیا۔

۲۔ نظام الملک نے اپنے صوبہ کی ضروریات سے زیادہ مقدار میں سامان جنگ اور لشکر فراہم کر لیا۔

۳۔ انھوں نے پرگنہ تالم کے ایک زمیندار کو بلا اجازت الگ کر دیا۔

۴۔ ان کے علاوہ چند اراضی کے متعلق بھی نظام الملک کی کارروائی پر اعتراض تھا۔

حسین علی خاں نے نظام الملک کے وکیل[1] کو بلا کر یہ شکایات نہایت تلخ و درشت لہجہ میں پیش کیں۔ جواب میں نظام الملک نے خود حسین علی خاں کو ایک خط لکھا جسمیں تمام الزامات کی صفائی پیش کی۔ منجملہ ان کے فوج اور سامان جنگ فراہم کرنے کی وجہ یہ بیان کی کہ مالوہ کی جانب مرہٹوں کی غارت گری کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے اور روک تھام کے لئے اس سے زیادہ فوج درکار ہے جسکی مالوہ کے انتظام

---

[1] اس زمانہ میں دار السلطنت کے باہر جو امرا صوبہ داری یا کسی اور خدمت پر متعین ہوتے تھے انکی طرف سے ان کے وکلا دربار میں رہتے تھے اور انہی وکلا کے توسط سے مراسلت ہوتی تھی۔

کے لئے عموماً ضرورت ہوتی ہے۔ آخر میں انھوں نے لکھا کہ اگر میرا ارادہ مخالفت کا ہوتا تو اسکے لیے بہترین موقع وہ تھا جب نیکوسیر نے مجھے آگرہ آنے کی دعوت دی تھی، اور تمھارے مخالفین محض میری شرکت کے منتظر تھے۔

لیکن اس جواب سے حسین علی خاں کی تسکین نہ ہوئی اور اس نے مالوہ سے نظام الملک کی علیحدگی کا فرمان جاری کرا دیا۔ اسکے ساتھ ہی نیم سرکاری طریقہ سے نظام الملک کو لکھا گیا کہ دکن کی انتظامی ضروریات کے لئے یہ مناسب سمجھا گیا ہے کہ مالوہ کو ہم اپنے ہاتھ میں رکھیں۔ آپ اکبر آباد، ملتان، الہ آباد، یا برہان پور کے صوبوں میں سے جو صوبہ چاہیں اپنے لئے پسند کر لیں۔ نظام الملک نے اس تجویز کو دو وجوہ سے رد کر دیا۔ ایک یہ کہ مالوہ کی صوبہ داری پر مقرر کرتے وقت ان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ انھیں پھر اس طرح معزول نہ کیا جائیگا جسطرح اس سے پہلے وہ دکن اور مراد آباد سے معزول کر دئے گئے تھے۔ دوسرے یہ کہ اسوقت تک فصل ربیع کے محاصل وصول نہ ہوئے تھے، اور فوج وغیرہ پر جو کچھ خرچ کیا جا چکا تھا، اسکی تلافی انہی محاصل کے وصول ہونے پر منحصر تھی۔ لیکن دونوں سیدوں نے ان معقول عذرات کو قبول نہ کیا، اور سید دلاور علی خاں کو (جو حسین علی خاں کا بخشی فوج تھا) تسخیر بوندی کے بہانہ سے دو اور طاقتور سرداروں کی معیت میں مالوہ کی مغربی سرحد پر بھیج دیا تاکہ بوقت ضرورت وہ فوراً نظام الملک کے مقابلہ پر جا سکے۔

دونوں سیدوں کے خلاف عام ناراضی

ایک طرف نظام الملک کے استیصال کی یہ کوششیں ہو رہی تھیں، اور دوسری طرف خود سیدوں کے خلاف اندر ہی اندر ایک زبردست مواد پک رہا تھا۔

دونوں بھائیوں کے طرزِ عمل سے عوام، خواص، امرا اور بادشاہ سب نالاں تھے۔ انھوں نے اور انکے دست راست رتن چند نے تمام ملکی اور مالی عہدے اور ہر قسم کے فوائد و منافع سادات بارہہ اور ان کے متوسلین اور رتن چند کے ہم قوم بقالوں کے لئے مخصوص کر رکھے تھے، اور دوسرے لوگوں کے لئے اپنی نوازشات کے دروازے بند کر دیئے تھے۔ اس سے ملک کے اہل سیف و اہل قلم شرفا میں بے کاری اور بے چینی پھیل رہی تھی۔ اس پر مزید یہ کہ رتن چند اور اجیت سنگھ کے اثر سے متاثر ہو کر سیدوں نے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو صدمہ پہنچانا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے فرخ سیر کے قتل کے بعد اسکی بیوہ کو جو اجیت سنگھ کی بیٹی تھی، اجیت سنگھ کے حوالہ کر دیا[1] اور اس نے جودھپور لیجا کر اس لڑکی کو پھر ہندو بنا لیا۔ خاندان مغلیہ کا یہ قاعدہ تھا کہ جو عورت انکے حرم میں داخل ہو جاتی تھی وہ پھر واپس نہیں جاتی تھی۔ اس سے پہلے راجپوت رئیسوں کی بہت سی لڑکیاں انکے ہاں آئیں، اور کبھی انہیں واپس نہیں کیا گیا۔ لیکن سیدوں نے نہ صرف اس رسم کو توڑا، بلکہ قانون اسلام کے خلاف اجیت سنگھ کو اسکی اجازت بھی دیدی کہ وہ اپنی لڑکی کو جو مسلمان ہو چکی تھی، پھر ہندو بنالے۔ اس پر مسلمانوں میں سخت ہیجان برپا ہوا اور قاضی شرع نے فتویٰ دیا کہ یہ فعل اسلامی شریعت کے بالکل خلاف اور شریعت کی توہین ہے۔

---

[1] باوجودیکہ فرخ سیر کی دوسری بیویوں کی املاک ضبط کر لی گئی تھیں، عبداللہ خاں نے اجیت سنگھ کی لڑکی کو بدستور اس مال و متاع اور جائداد پر قابض رہنے دیا جو فرخ سیر کی طرف سے اسکو ملی تھی۔ اس کی مجموعی مالیت ایک کرور روپیہ بتائی جاتی ہے۔

اس کے تھوڑے عرصہ بعد ایک اور واقعہ پیش آیا۔ ایک روز جمعہ کے دن آگرہ کی مسجد میں ایک ہندو عورت مسلمان ہوئی۔ اسکے عزیزوں نے رتن چند سے فریاد کی۔ رتن چند نے اس معاملہ کو عبداللہ خاں کے سامنے برے رنگ میں پیش کیا اور اسکی اجازت سے یا بلا اجازت کوتوال شہر کو حکم دیا کہ اس نو مسلمہ کو ذلت کے ساتھ شہر میں تشہیر کیا جائے اور اس مسلمان کو، جو اس عورت سے نکاح کرنا چاہتا تھا، ذلیل و خوار کر کے لشکر سے نکال باہر کیا جائے۔ یہ اور اس قسم کے متعدد واقعات تھے جنہوں نے عام طور پر مسلمانوں میں دونوں سیدوں کے خلاف شدید ناراضی کے جذبات پیدا کر دئے[ف۱]۔

رعایا کی طرح بادشاہ اور اس کا خاندان بھی دونوں بھائیوں کے استبداد سے بیزار تھا۔ دونوں بھائیوں نے رفیع الدولہ اور رفیع الدرجات کی طرح محمد شاہ کو بھی قیدیوں کی طرح رکھ چھوڑا تھا۔ اسکے گرد و پیش ہر خدمت پر ان کے آدمی مقرر تھے، حتیٰ کہ خواجہ سرا خواص، فیلبان، باورچی، رکاب دار، فراش اور خدمت گار سب ان کے متوسلین میں سے تھے۔ ہمت خاں بارھا اتالیق کی حیثیت سے

ف۱ مذہبی حیثیت سے حسین علی خاں کا طرزِ عمل مسلمانوں کی نگاہ میں اتنا قابل اعتراض نہ تھا جتنا عبداللہ خاں کا تھا۔ اس پر ہندوؤں کا اثر اس قدر زیادہ بڑھا ہوا تھا کہ وہ ہندوؤں کے تہوار منایا کرتا تھا۔ اس کے ہاں بسنت کی رسم اس طرح کی جاتی تھی جسطرح ہندو کرتے تھے۔ اور ہولی کے تہوار میں وہ رنگ کھیلتا اور گلال ملتا تھا۔

سایہ کی طرح لگا رہتا تھا جسکی اجازت کے بغیر نہ وہ کہیں جا سکتا تھا اور نہ کسی سے بات کر سکتا تھا۔ جب وہ نماز جمعہ یا شکار کے لئے باہر نکلتا تو سیدوں کے آدمی اسے اس طرح گھیرے رہتے جیسے وہ کوئی خطرناک قیدی ہے جس کے ہر وقت بھاگ جانے کا خوف ہے۔ امرا میں سب سے زیادہ امرائے تورانی دونوں سیدوں کے مخالف تھے، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ نظام الملک کا استیصال کرنے کے بعد یہ دونوں تورانی گروہ کے کسی شخص کو عزت و منزلت کے مقام پر نہ رہنے دینگے۔ دربار میں محمد امین خاں اعتماد الدولہ اس گروہ کا لیڈر تھا۔ وہ بظاہر سیدوں کے ساتھ ملا ہوا تھا، مگر بباطن ان کا سخت مخالف تھا۔ اس نے محمد شاہ کے ساتھ ترکی زبان میں (جسے سیدوں کے ملازم نہیں سمجھ سکتے تھے) گفت و شنید کا سلسلہ شروع کیا، اور رفتہ رفتہ ان دونوں کے درمیاں سیدوں کے خلاف اتحاد ہو گیا۔

محمد امین خاں نے خود اور اسکی معرفت محمد شاہ اور اسکی ماں نے نظام الملک کو پیہم خطوط لکھے جنمیں انہنے یہ استدعا کی کہ جسطرح ممکن ہو اپنی قوت و قابلیت سے سیدوں کے استبداد کا خاتمہ کریں۔ اور انہیں امید دلائی کہ اگر انکے حسن تدبیر سے یہ کام انجام کو پہنچا تو وزارت انہی کو دیجائیگی۔ ان خطوط کا سلسلہ اُس وقت سے جاری تھا جب آگرہ میں نیکوسیر کے قضیہ کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن نظام الملک اپنی طرف سے پہل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اسوقت کا انتظار کر رہے تھے جب سید خود انہیں چھیڑیں۔ چنانچہ اب سیدوں کی جانب سے ابتدا ہوئی، اور نظام الملک اس کے جواب میں مدافعت

کے لئے طیار ہو گئے۔

نظام الملک دکن پہنچتے ہیں جب دلاور علی خاں ایک طاقتور فوج کے ساتھ مالوہ کی مغربی سرحد پر بھیجا گیا تو نظام الملک کیلئے اسکے سوا چارہ نہ رہا کہ یا تو مالوہ میں رہ کر مقابلہ کریں، یا کسی اور علاقہ کی طرف نکل جائیں۔ پہلی صورت میں یہ خطرہ تھا کہ آگرہ کی طرف سے حسین علی خاں، دکن کی طرف سے عالم علی خاں، اور بوندی کی طرف سے دلاور علی خاں دفعتہً ان پر حملہ آور ہونگے اور ہر جانب سے انہیں گھیر کر ان کا خاتمہ کر دینگے۔ اسلئے انھوں نے مالوہ سے نکل جانے کا فیصلہ کیا۔ ان کی پہلی تجویز یہ تھی کہ جے سنگھ راجہ آنبیر کے ساتھ جا ملیں اور اسکی امداد سے آگرہ یا دہلی کی جانب حملہ آور ہوں۔ لیکن جے سنگھ سیدوں سے صلح کر چکا تھا۔ اسکی طرف سے نظام الملک کو کوئی ہمت افزا جواب نہیں ملا۔ اس دوران میں مبارز خاں صوبہ دار حیدر آباد، چندر سین جادو (جو حسین علی اور راجہ ساہو کی دوستی کے بعد سے دونوں سیدوں کا مخالف ہو گیا تھا)، سعادت اللہ خاں فوجدار ارکاٹ، اور دکن کے دوسرے سرداروں کی جانب سے ان کو خطوط ملے جنمیں لکھا تھا کہ اگر آپ فرخ سیر کے فوجوں کا بدلہ لینے، اور بادشاہ کو سیدوں کے استبداد سے نکالنے کے لئے تلوار اٹھائیں تو ہم آپکا ساتھ دینے کے لئے طیار ہیں۔ مزید برآں دکن میں نظام الملک کے پھوپھا عضد الدولہ عوض خاں برار کے صوبہ دار تھے، اور انور خاں قطب الدولہ صوبہ دار خاندیس ایک کمزور آدمی تھا جس میں مدافعت کی بالکل قوت نہ تھی۔ ان وجوہ سے انھوں نے دکن جانے کا عزم کیا۔ مگر علی الاعلان

ادھر جانا اپنے اوپر خود ہلاکت کو دعوت دینا تھا۔ اسلئے انھوں نے اپنے اصلی ارادہ کو بالکل مخفی رکھا اور جمادی الاولیٰ میں اجین سے دھلی کی جانب روانہ ہو گئے۔ دونوں کو یہ اطلاع ملی تو وہ خوش ہوئے کہ شکار خود انکی طرف آ رہا ہے، اور انھوں نے بادشاہ کی طرف سے فرمان بھیجا کہ تم سیدھے آگرہ آؤ۔ یہاں پہنچتے ہی تمہیں اس صوبہ کی حکومت دے دی جائیگی۔ لیکن نظام الملک نے اجین۔ دھلی کی سڑک سے دفعۃً اپنا رخ بدل دیا، اور تیزی کے ساتھ کوچ کرتے ہوئے دکن کی جانب چلے، یہاں تک کہ یکم رجب ۱۱۳۲ھ (۸ مئی ۱۷۲۰ء) کو نربدا اترنے کے بعد قبل اسکے کہ عالم علی خاں نائب صوبہ دار دکن کو خبر ہوتی، انھوں نے ۱۳ رجب کو آسیر کے مشہور قلعہ پر قبضہ کیا، اور اسکے تیسرے دن ۱۶ رجب کو خاندیس کے دار الحکومت برھانپور کو بھی مسخر کر لیا جہاں انور خاں نے انکی اطاعت قبول کی۔ اسطرح مخالفین کے ہوشیار ہونے سے پہلے نظام الملک اپنی ایک ہی چال میں دکن کے دو صوبوں۔ برار اور خاندیس پر متصرف ہو گئے۔ اب انھوں نے پہلی مرتبہ دونوں سیدوں کی مخالفت کا اعلان کیا، جو دوسرے الفاظ میں تخت شاہی کے تمام وفادار امرا کے نام ان کا دعوت نامہ تھا، کیونکہ اس اعلان کے الفاظ یہ تھے کہ "بذل جہد محض تخلیص خداوند نعمت است کہ بدست صاحب مداراں آں چناں گرفتار اند کہ بے اذن نمی توانند برای ادای نماز جمعہ بروند، تا بدیگر امور چہ رسد"[1] اسکے ساتھ ہی

---

[1] حدیقۃ العالم ج ۲ ص ۹۸

حکم دیا کہ تمام مسجدوں میں جمعہ کے دن محمد شاہ کی رہائی کے لیئے دعا کیجائے، اور خطبہ میں جب بادشاہ کے لیئے دعا کیجائے تو یہ الفاظ کہے جائیں کہ "محمد شاہ دیں پناہ دشمنوں کی قید میں ہے اور جملہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ اسے قید سے چھڑائیں[1]" ان باتوں سے مدعا یہ تھا کہ عوام اور خواص سب میں دونوں سیدوں کے خلاف ایک ہمہ گیر ہیجان پیدا ہو جائے۔

دلاور علی خاں کی شکست نظام الملک کے نربدا پار اترنے اور اسیر و برہانپور پر قبضہ کر لینے کی اطلاعات پے در پے آگرہ پہنچیں تو دونوں سید حیراں رہ گئے۔ حسین علی خاں نے فوراً دکن کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن عبداللہ خاں اور صمصام الدولہ خان دوران نے رائے دی کہ شمال سے دلاور علی خاں اور جنوب سے عالم خاں کو بڑھنے کا حکم دیا جائے۔ یہ دونوں ملکر باغی نواب کا بآسانی استیصال کردینگے۔ چنانچہ اس تجویز کے مطابق دلاور علی خان کو احکام بھیجے گئے کہ راؤ بھیم سنگھ ہاڑا، راجہ گج سنگھ، اور دوست محمد خاں[2] کو لیکر فوراً نظام الملک کے مقابلہ پر جائے۔ دوسری طرف عالم علیخاں کو حکم دیا گیا کہ وہ اورنگ آباد سے نظام الملک کی جانب پیش قدمی کرے۔ لیکن عالم علی خاں کے پاس فوج تیار نہ تھی اسلیئے وہ فوراً اورنگ آباد سے کوچ نہ کرسکا اور اسنے اطراف و نواحی سے فوجیں فراہم کرنے اور مرہٹوں سے امدادی فوج منگانے میں دیر لگادی۔ بخلاف

---

[1] فتوحات آصفی

[2] بانی ریاست بھوپال

اسکے دلاور علی خاں کے پاس فوج مستعد تھی، اسلیئے وہ حکم ملتے ہی برہانپور کی جانب چل پڑا اور رجب کے اواخر میں نربدا پار کر کے سرکار ہانڈیہ[۵۱] میں داخل ہوگیا۔ نظام الملک جیسے آزمودہ کار سپہ سالار کے لیئے مشکل تھا کہ وہ اس سے فائدہ نہ اُٹھائے۔ سیدوں کا نقشہ جنگ یہ تھا کہ دلاور علی اور عالم علی بیک وقت دو جانب سے اُن پر حملہ کریں۔ مگر اب دونوں جنرلوں میں سے ایک پہلے آگیا تھا، اور دوسرے کے آنے میں دیر تھی، اس سے ان کو یہ موقع مل گیا کہ دونوں کے اجتماع سے پہلے ایک ایک سے الگ الگ نمٹ لیں۔ اس موقع سے انھوں نے فائدہ اٹھایا اور ایک لمحہ ضائع کیئے بغیر برہانپور سے روانہ ہوگئے۔ ۱۳ شعبان ۱۱۳۲ھ (۱۹ جون ۱۷۲۰ء) کو برہانپور اور نربدا کے درمیان پندھر کے پہاڑی علاقہ میں دونوں کا مقابلہ ہوا[۵۲]۔ دلاور علی خاں کے ساتھ سادات بارہ، افاغنہ اور راجپوتوں کی بہترین فوج تھی۔ لیکن قائدانہ قابلیت کے اعتبار سے اسکو نظام الملک سے کوئی نسبت نہ تھی۔ اس نے سادہ لوح سپاہیوں کی طرح تلوار سے کام لینا چاہا، مگر نظام الملک نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ اسے تلوار چلانے کا موقع ہی نہیں دیا اور اپنے توپخانہ کو اسطرح استعمال کیا کہ دلاور علی خاں اپنی فوج کے چار پانچ ہزار سپاہیوں

---

[۵۱] نربدا کے جنوبی ساحل پر برہانپور سے ۹۲ میل جانب شمال۔

[۵۲] بعض مصنفین نے اس جنگ کا مقام حسن پور بتایا ہے اور بعض نے رتن پور۔ منعم خاں لکھتا ہے کہ نربدا سے ۱۲ میل جانب جنوب یہ جنگ ہوئی تھی۔

اور اکثر و بیشتر نامور سرداروں سمیت مارا گیا، اور اسکے مقابلہ میں خود نظام الملک کے کل سو آدمی زخمی ہوئے اور ۳۰ مارے گئے۔

نظام الملک کے نام صوبہ داری دکن کا فرمان

شعبان کے آخر میں دلاور علی خان کی شکست اور اسکے قتل کی خبر آگرہ پہنچی تو دونوں سید سخت سراسیمہ ہوئے۔ اب عالم علی خاں، ایک بیس اکیس برس کا لڑکا، جہاندیدہ نظام الملک کے مقابلہ میں تنہا رہ گیا تھا، حسین علی خاں کے بیوی بچے دولت آباد کے قلعہ میں تھے، اور آگرہ سے دکن کا اسقدر فاصلہ تھا کہ فیصلہ کن جنگ ہونے سے پہلے نظام الملک کے سر پر جا پہنچنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اس حالت میں دونوں بھائی حیران تھے کہ کیا کریں۔ کبھی ارادہ کرتے کہ دونوں بادشاہ کو لیکر دکن جائیں، کبھی فیصلہ کرتے کہ حسین علیخان بادشاہ کے ساتھ دکن جائے اور عبداللہ خاں دھلی چلا جائے۔ کبھی یہ رائے قرار پاتی کہ عبداللہ خاں محمد شاہ کو لیکر دھلی چلا جائے اور حسین علی خاں تنہا نظام الملک کے مقابلہ پر جائے۔ اس اضطراب کی حالت میں روز شاہی خیمہ و خرگاہ آگرہ کے باہر نکلتے اور روز واپس منگا لئے جاتے۔ پریشانی کی ایک اور وجہ محمد امین خاں کی ذات تھی۔ یہ شخص ظاہر میں سیدوں کا گہرا دوست بنا ہوا تھا اور نظام الملک کے خلاف انکو مشورے دیتا تھا۔ مگر دونوں سید جانتے تھے کہ وہ دل میں ان کا سخت دشمن ہے، اور نظام الملک کا قریبی رشتہ دار ہونے کی وجہ سے ہرگز اس کا روادار نہیں ہے کہ ہمیں نظام کے مقابلہ میں فتح حاصل ہو۔ وہ اسکی جنگی طاقت، اور سیاسی قابلیت اور

بادشاہ پر اسکے اثرات سے بھی واقف تھے، اسلیئے وہ حیران تھے کہ اس کھلے دوست اور چھپے دشمن کا کیا علاج کریں۔ نہ اسے دکن لیجانا قرین مصلحت معلوم ہوتا تھا اور نہ بادشاہ کے پاس چھوڑ دینا مناسب تھا۔ آخر میں یہ رائے قرار پائی کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ لیکن عقلمند مشیروں نے اسکی مخالفت کی اور انھوں نے کہا کہ محمد امین خاں طاقتور مغل جماعت کا سردار ہے، اس بھڑوں کے چھتے میں پتھر مارنا ٹھیک نہیں ہے۔ ان مشکلات کا جب کوئی حل نظر نہ آیا تو مجبوراً انھوں نے نظام الملک کو صلح سے راضی کرنے کی کوشش کی۔ بادشاہ کی طرف سے نظام الملک کو ایک فرمان لکھا گیا جسمیں اس بات پر اظہار تعجب کیا گیا تھا کہ نواب نے مالوہ کو بلا اجازت چھوڑ دیا۔ "نواب کی کونسی خواہش آجتک رد کی گئی ہے؟ اگر وہ دکن میں سیر و شکار کے لیئے جانا چاہتے تھے تو کیونکر ممکن تھا کہ انکی یہ درخواست رد کر دی جاتی؟ بلکہ اگر وہ دکن کی حکومت طلب کرتے تو وہ بھی انہیں دیدی جاتی۔" اس قسم کی باتوں کے بعد لکھا تھا کہ "دکن سے فتنہ و فساد کی خبریں سنکر ہمارا پہلے ہی یہ ارادہ تھا کہ تمہیں اس ملک کی صوبہ داری پر مقرر کر دیں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ مقصد خود بخود حاصل ہو گیا۔ اب تمہارے نام دکن کی صوبہ داری کا باقاعدہ فرمان بھیجا جا رہا ہے۔ اس کے مطابق تم جائزہ لینے کے بعد عالم علی خاں کو امیر الامرا حسین علیخاں کے اہل و عیال سمیت واپس بھیج دینا۔" اس فرمان کے ساتھ حسین علی خاں نے بڑے دوستانہ انداز میں ایک خط نظام الملک کو لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ دلاور علی خاں کو میں نے اپنے

اہل و عیال کے لانے کے لئے بھیجا تھا۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ میرے منشا کے خلاف آپ سے جنگ آزما ہوا اور الحمد للہ کہ اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ کچھ مفسدہ پردازوں نے بعض معاملات میں آپ کو ایسی باتیں لکھی ہیں جن سے ہمارے اور آپ کے درمیان نااتفاقی پیدا ہو۔ خدا نہ کرے کہ پرانے دوستوں کے درمیان اس قسم کی نوبت آئے۔ بعض لوگوں نے آپ کی نسبت جہاں پناہ سے ایسی باتیں بیان کی تھیں جن سے شاہی عتاب ہونے کا اندیشہ تھا۔ مگر میں نے آپکی وفاداری کا یقین دلا کر خاطر مبارک کو صاف کر دیا ہے، اور اب جہاں پناہ نے آپ کو دکن کی صوبہ داری پر مقرر کیا ہے میری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے اور میرے بیٹے عالم علیخاں اور اہل و عیال کو بحفاظت روانہ کر دیجئے۔"

عالم علیخاں کی شکست

یہ خط اور فرمان پہنچنے سے پہلے نظام الملک اور عالم علی خاں ایک دوسرے سے لڑنے کے لئے اپنی اپنی جگہ سے روانہ ہو چکے تھے۔ رمضان کی ابتدا میں عالم علی کتل فردا پور[1] پر تھا کہ اسے دلاور علی خاں کے قتل کی اطلاع ملی۔ بعض ہمراہیوں نے صلاح دی کہ اب آگے بڑھنا خلاف مصلحت ہے۔ مناسب یہ ہے کہ اورنگ آباد یا احمد نگر چلکر حسین علی خاں کا انتظار کیا جائے اور مرہٹہ فوجوں کو جنگ قزاقی کے لئے چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ غارت گری کر کے نظام الملک کو پریشان کرتی رہیں۔ لیکن جوشیلے نوجوان نے اس مشورہ کو رد کر دیا اور

---

[1] اجنٹہ گھاٹ کے شمالی دامن میں پچھورا اسٹیشن سے ۲۰ میل جانب جنوب۔ قدیم زمانہ میں صوبہ اورنگ آباد سے خاندیس میں داخل ہونے کا یہی رستہ تھا۔ اور یہ ان دونوں صوبوں کی سرحد پر تھا۔

پیش قدمی جاری رکھی، یہاں تک کہ بالاپور[1] پر نظام الملک کے مقابل جا پہنچا۔ یہاں نظام الملک کو حسین علی خاں کا خط اور شاہی فرمان ملا، جس کا بڑی دہوم دہام کے ساتھ انھوں نے استقبال کیا، برسر عام اسکو پڑھا پھر اسکی ایک نقل عالم علی خاں کو بھیجی اور اسے لکھا کہ اب میں دکن کا صوبہ دار مقرر کردیا گیا ہوں، لہذا مجھ سے تمہارا لڑنا فضول ہے۔ اپنی فوج واپس کردو میں تمہیں اور امیر الامرا کے اہل و عیال کو بحفاظت آگرہ پہنچا دینے کا ذمہ لیتا ہوں" عالم علی خاں نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا۔ لیکن نظام الملک کا مقصد اس سیاسی چال سے کچھ اور تھا، اور وہ انہیں حاصل ہو گیا۔ عالم علیخاں کی فوج میں زیادہ تر دکن کے سردار اور فوجدار تھے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ نظام الملک اُن کے صوبہ دار مقرر ہو چکے ہیں تو انہیں خود اپنی فکر لاحق ہوئی۔ معزول نائب صوبہ دار کے ساتھ ملکر نئے صوبہ دار کے خلاف جنگ کرنا انکے حق میں موجب نقصان تھا۔ اسلیئے وہ عالم علی خاں سے الگ ہونے لگے۔ اسطرح حسین علی خاں کے خط اور شاہی فرمان نے دونوں حریفوں کی حیثیت بالکل منقلب کردی۔ پہلے نظام الملک کو ایک باغی امیر قرار دیا جارہا تھا اور عالم علی خاں شاہی حکومت کی طرف سے برسر مدافعت تھا، مگر اب عالم علی خاں باغی کی حیثیت میں ہو گیا، اور نظام الملک کو شاہی حکومت کے نمائندے کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ عالم علی خاں نے یہ رنگ دیکھ کر لڑائی میں جلدی کی اور ۶؍ شوال سنہ ۱۱۳۲ھ (۱۰؍ اگست ۱۷۲۰ء) کو فریقین میں جنگ ہوئی، جسمیں نظام الملک نے نہایت خفیف نقصان

---

[1] اکولہ سے ۱۶ میل جانب مغرب، پورنا ندی سے سولہ سترہ میل جانب جنوب، یہ مقام اورنگ آباد اور برہانپور سے مساوی فاصلہ پر ہے۔

کے ساتھ عالم علی خاں کو شکست دیدی، اور وہ میدان جنگ میں مارا گیا۔

حسین علی خاں خود مقابلہ کے لئے آتا ہے

اس واقعہ کی اطلاع شوال کے آخر میں آگرہ پہنچی تو دونوں سیدوں کے غم و اضطراب کی انتہا نہ رہی۔ انہوں نے جوش غضب میں آکر چاہا کہ فوراً محمد امین خاں کو قتل کر دیں۔ حسین علی خاں نے اس پر حملہ کرنے کے لئے فوج کو طیاری کا حکم دیدیا۔ اور محمد امین خان اپنے محل کے گرد خندق کھود کر مدافعت کے لئے طیار ہو گیا۔ مگر دانشمند لوگوں نے دونوں بھائیوں کو اس حرکت کے نتائج سے آگاہ کر کے انہیں ٹھنڈا کر دیا اور عبداللہ خاں نے اپنے بھائی کو سمجھا بجھا کر محمد امین خاں سے صلح کر لی۔ اس کے بعد دونوں بھائیوں میں یہ صلاح ہوئی کہ حسین علی خاں بادشاہ کے ساتھ اجمیر کے راستہ سے اجیت سنگھ کو لیتا ہوا دکن کی طرف جائے، اور عبداللہ خاں دھلی جا کر ٹھیرے۔ چنانچہ ۹ ذوالقعدہ ۱۱۳۲ھ (۳ ستمبر ۱۷۲۰ء) کو یہ لوگ ۵۰ ہزار فوج کے ساتھ آگرہ سے اجمیر کی طرف روانہ ہوئے اور ایک منزل تک ساتھ جانے کے بعد رتن چند کو بادشاہ کے ساتھ چھوڑ کر عبداللہ خاں دھلی کی طرف چلا گیا۔ محمد امین خاں نے اس جنگ کو روکنے کی بہت کوشش کی۔ اس نے حسین علی خاں سے کہا کہ میں اپنے بیٹے قمر الدین خاں کو دکن بھیجتا ہوں، وہ بحفاظت تمام آپکے اہل و عیال کو لے آئیگا، مگر حسین علیخاں نے اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا پھر محمد امین خاں نے کہا کہ لشکر میں اور خصوصاً میری فوج میں بہت سے مغل ہیں جو نظام الملک سے لڑنے کے لئے طیار نہیں ہیں لہذا مجھے اور اس مغل فوج کو پیچھے چھوڑ دیا جائے۔ مگر حسین علی خاں کا خیال تھا کہ محمد امین خاں کو پیچھے چھوڑ دینا ساتھ

رکھنے سے زیادہ خطرناک ہے اسلئے وہ اسے چھوڑ دینے پر راضی نہ ہوا، اور چچا جان چچا جان کہہ کر اور روپیہ دے دے کر خوش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

حسین علیخاں کا قتل محمد امین خاں کے معاملہ میں حسین علی خاں کا خیال آخر کار غلط نکلا۔ اسمیں شک نہیں کہ اگر وہ اسے چھوڑ جاتا تو یہ چالاک مدبر ایسی تدبیر کرتا کہ پھر یہ دونوں بھائی کبھی نہ مل سکتے لیکن آئندہ کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ اس کا ساتھ رکھنا اس سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ اس نے دوران سفر ہی میں خفیہ طور پر حسین علی خاں کے قتل کے لیے ایک زبردست سازش کی۔ جس میں چند نہایت مخصوص آدمیوں کو شریک کیا اور کسی غیر شخص کو اس کا علم تک نہ ہونے دیا۔ یہ مخصوص لوگ (باستثناء محمد امین خاں) تعداد میں کل پانچ تھے۔ (۱) سید محمد امین سعادت خاں[1] (۲) حیدر قلی خاں اسفرائینی (۳) میر حیدر کاشغری (۴) شاہ عبدالغفور اور (۵) میر جملہ۔ ان میں سے میر جملہ کی ذات تو کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ البتہ بقیہ ارکان سے مختصر تعارف کرانا ضروری ہے۔

(۱) سعادت خاں میر محمد امین نیشاپور کے سادات میں سے تھا، فرخ سیر کی شاہزادگی کے زمانہ میں اسکے والا شاہیوں میں داخل ہوا اور ہزاری منصب پایا۔ اسکی تخت نشینی کے بعد تقرب خان محمد جعفر کے ماتحت نیابت کروڑگیری پر مقرر ہوا، پھر دونوں سیدوں نے اسکو ھنڈون اور بیانہ کی فوجداری پر ترقی دی اور ہزار و پانصدی منصب عطا کیا۔ گردھر بہادر کے خلاف جو مہم الہ آباد بھیجی گئی تھی اسکی

---

[1] بانی ریاست اودھ۔

سرداری کے لئے پہلے اسی کو نامزد کیا گیا، لیکن اسی زمانہ میں اس نے میر جملہ کو صدر الصدور کا عہدہ دینے کے لئے حسین علی خاں سے سفارش کی اور رتن چند نے مخالفت کرکے نہ صرف اسکی سفارش رد کرادی، بلکہ اس مہم کی سرداری بھی اس سے چھین کر حیدر قلی خاں کو دلوادی۔ غالباً اس وقت سے یہ رتن چند اور دونوں سیدوں کا مخالف ہو گیا۔ اور یہی مخالفت اس سازش میں اسکی شرکت کی وجہ ہوئی۔

(۴) حیدر قلی خاں محمد رضا فرخ سیر کے باپ عظیم الشان کی سرکار میں ملازم تھا۔ فرخ سیر کی تخت نشینی کے بعد میر جملہ کے توسل سے اسکو حیدر قلی خاں کا خطاب ملا اور نظام الملک کی صوبہ داری دکن کے زمانہ میں دیوانی دکن کا عہدہ دیا گیا۔ دکن میں نظام الملک سے اسکی نہ بنی اور یہ وہاں سے صوبہ گجرات کی دیوانی اور سورت کی متصدی گری پر مقرر کردیا گیا۔ وہاں اسکی سخت گیری سے تنگ آکر رعایا نے بہم شکایات کیں اور سید عبداللہ خاں نے اسے الگ کردیا۔ دہلی واپس جاکر اس نے رتن چند کے توسل سے عبداللہ خاں کے ساتھ تعلقات پیدا کیے اور تھوڑی مدت میں دونوں کے درمیان گہری دوستی ہوگئی۔ نیکو سیر کے خلاف قلعہ آگرہ کے محاصرہ میں اس نے نمایاں خدمات انجام دیں جس سے حسین علی خاں اس پر مہربان ہوگیا، اور بعد میں اسے گردھر بہادر کے خلاف الہ آباد کی تسخیر کے لئے بھیجا۔ الہ آباد سے واپسی پر حسین علی خاں نے اسکو ۵ ہزار روپیہ انعام دلوایا، پہلے سے بھی زیادہ اس پر مہربانیاں کیں، اور آگرہ سے روانہ ہوتے وقت اسے میر آتش (توپخانہ کا افسر اعلیٰ) مقرر کیا۔ بہ ظاہر دونوں سیدوں کا بڑا ہوا خواہ بنا ہوا تھا۔ حسین علی خاں بھی اسکی قابلیت

اور بہادری کی بڑی تعریفیں کرتا تھا۔ لیکن یہ شخص فطرۃً بے وفا اور خود غرض تھا۔ اس نے بیک وقت محمد امین خاں اور حسین علی خاں دونوں سے تعلقات رکھے۔ محمد امین کے قتل کی سازش میں وہ حسین علی خاں کے ساتھ تھا، اور حسین علی کے قتل کی سازش میں محمد امین خاں کے ساتھ۔ دونوں کو اس نے ایک دوسرے کے راز کی خبر نہ کی، کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ جو فریق بھی غالب ہوگا، اسکی دوستی سے مجھے بہرحال فائدہ ہوگا۔

(۳) میر حیدر کاشغری مغل فوج کا ایک سردار تھا۔ اس کو محمد امین خاں نے صرف اسکی بے دھڑک بہادری کی خاطر راز میں شریک کیا تھا اور حسین علی خاں کے قتل کا کام اسی سے لینا مقصود تھا۔

(۴) شاہ عبدالغفور سندھ کا ایک فقیر تھا۔ مشہور تھا کہ جن اور ارواح اسکی تابع ہیں، اور اسکو غیب کی خبریں دیتے ہیں۔ اسی سبیل سے اس نے شاہی محل سرا کے خدام اور خواجہ سراؤں اور خدمتگار عورتوں پر اپنا اثر قائم کیا، اور رفتہ رفتہ خود محمد شاہ کی ماں نواب قدسیہ اسکی معتقد ہو گئی۔ محمد امین خاں نے اسے آلۂ کار بنا کر نواب قدسیہ اور صدرالنساء کو بھی اپنی سازش میں شریک کیا تاکہ انکے اثر سے محمد شاہ دونوں سیدوں کی مخالفت پر ثابت قدم رہے۔

ان پانچوں آدمیوں نے باہم پخت و پز کرنے کے بعد حسین علی کو جلدی سے جلدی قتل دینے کا عزم کرلیا، اور میر حیدر کاشغری اس کام کے لئے نامزد کیا گیا۔ ۶ ذوالحجہ ۱۱۳۲ھ (۸ اکتوبر ۱۷۲۰ء) کو جبکہ شاہی کیمپ فتح پور سیکری سے ۳۵ کوس کے فاصلہ پر تھا، حسین علیخاں

بادشاہ کے پاس سے اٹھ کر اپنے خیمہ کی طرف روانہ ہوا۔ میر حیدر کاشغری نے راستہ میں اسکی پالکی روک کر ایک درخواست پیش کی۔ حسین علیخاں اسے لیکر پڑھنے لگا اور میر حیدر نے دفعتہً اپنا پیش قبض نکالکر اس کے پیٹ میں بھونک دیا۔ مغل سپاہی ساتھ لگے ہوئے تھے۔ انھوں نے نہایت تیز دستی کے ساتھ حسین علیخاں کا سر کاٹ کر حیدر قلی خاں کی اردو میں پہنچایا اور وہاں سے محمد امین خاں اور حیدر قلی خاں اسے لیکر بادشاہ کے پاس دوڑے۔ بادشاہ ڈر کر محلسرا میں چھپ گیا، مگر سعادت خاں منہ پر کپڑا ڈال کر اندر گھسا اور بادشاہ کو گود میں اٹھا کر باہر لے آیا۔ یہاں قمر الدین خاں کا ہاتھی موجود تھا۔ محمد امین خاں بادشاہ کو لیکر اسپر سوار ہوا، عماری کے پیچھے ایک لمبے بانس پر حسین علی خاں کا سر بندھوا دیا، اور لوگوں کی توجہ دوسری طرف پھیرنے کے لئے فوج میں اعلان عام کر دیا کہ حسین علی خاں کا مال و اسباب اور خزانہ لوٹ لیا جائے۔ دولت کے حریص سپاہی یہ سنتے ہی میر بخشی کے قتل کو بھول کر اسکی دولت پر ٹوٹ پڑے، اور دوسری، طرف حیدر قلی خاں نے اسکے لشکر پر گولہ باری شروع کر دی۔ سادات بارہہ میں سب سے پہلے یہ خبر حسین علی خاں کے بھانجے سید غیرت خاں کو پہنچی۔ وہ اسے سنتے ہی فوراً ہتھیار سنبھال کر اور چالیس پچاس آدمی جو بر وقت موجود تھے، ساتھ لیکر سخت جوش کی حالت میں اس مقام کی طرف لپکا جہاں بادشاہ اور محمد امین خاں وغیرہ کھڑے تھے۔ مگر یہاں اسکی تواضع بندوق سے کی گئی جس نے اس کا کام تمام کر دیا۔ اسی طرح سیدوں کے حامیوں اور عزیزوں میں سے جو جو اس خبر کو سنتا گیا وہ بغیر کسی طیاری کے دوڑ دوڑ کر آتا گیا، اور باسانی ہر

ایک کا خاتمہ کر دیا گیا۔ ان لوگوں نے باہم مل کر فوج کو جمع کرنے اور ایک منظم حملہ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور نرے جوش بہادری میں جسکے اندر عقل و خرد کا شائبہ بھی نہ تھا اپنی جانیں گنوا دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حسین علیخاں کی عظیم الشان فوج جس کا اب کوئی لیڈر باقی نہ رہا تھا، چند گھنٹوں کے اندر منتشر ہو گئی، اس کا ساز و ساماں، خیمہ و خرگاہ اور مال و زر جو بادشاہوں سے ٹکر کھاتا تھا، اس طرح لٹ گیا کہ اس کا نشان تک نہ رہا عامۂ خلائق جن کے دلوں میں حسین علی خاں سے نفرت بیٹھی ہوئی تھی، اس اچانک زوال کو دیکھ کر قابو میں نہ رہے۔ انھوں نے اس کی لاش کی سخت بے حرمتی کی۔ اس کا جنازہ اٹھانے کے لئے آدمی تک نہ ملے۔ محمد امین خاں نے چند آدمیوں کو فراہم کر کے اسے اجمیر کی طرف روانہ کیا، مگر وہ راستے میں اسے پھینک کر چلے آئے اور کچھ عرصہ بعد علاقہ کے فوجدار نے اسے اٹھوا کر اجمیر بھجوایا۔ رتن چند اس سے بھی زیادہ لوگوں کی نفرت کا مرکز تھا، وہ جب گرفتار ہو کر محمد امین خاں کے پاس جا رہا تھا، تو لوگوں نے اسے پالکی میں سے کھینچ لیا اور مار مار کر اس کا برا حال کر دیا، حتیٰ کہ جسم پر کپڑے کا ایک تار تک باقی نہ رہا۔

عبداللہ خاں کی سعی انتقام اور ناکامی

عبداللہ خاں ابھی راستہ میں تھا کہ اسے رتن چند کا دو حرفی پرچہ ملا جس میں حسین علیخاں کے قتل کی اطلاع دی گئی تھی۔ بعض جوشیلے سیدوں نے رائے دی کہ اسی وقت چل کر مقتول سید کا بدلہ لیا جائے۔ مگر اس نے بے سر و سامانی کی حالت میں لڑنا مناسب نہ سمجھا، اور یہ رائے قائم کی کہ فوراً دھلی جا کر تیموری خاندان کے ایک دوسرے شہزادے کو تخت پر بٹھایا جائے اور فوج فراہم کر کے محمد شاہ سے جنگ کی جائے۔ اس نے فوراً اپنے بھائی نجم الدین علیخاں

صوبہ دار دھلی کو حکم بھیجا کہ کسی شاہزادے کو انتخاب کر کے تخت پر بٹھا دو، اور اس حکم کے مطابق ۵ ر ذی الحجہ کو دہلی میں رفیع الشان ابن شاہ عالم بہادر شاہ کا سب سے بڑا بیٹا ابوالفتح ظہیر الدین محمد ابراہیم کے لقب سے تخت نشین کر دیا گیا۔ اسکے دو دن بعد عبداللہ خاں دھلی پہنچا اور اس نے فوج فراہم کرنے کے لئے بے دریغ روپیہ بہانا شروع کر دیا۔ چند روز میں ایک کرور روپیہ کے صرف سے ۹۰ ہزار فوج فراہم کی گئی جسمیں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو صرف روپیہ کمانے کے لئے بھرتی ہو گئے تھے۔ عبداللہ خاں نے ان لوگوں کو تین تین مہینے کی پیشگی تنخواہیں دیدیں جنہیں وصول کرنے کے بعد بہت سے رنگروٹ بھاگ گئے، اور جو پرانے تجربہ کار سپاہی تھے وہ اس بنا پر دل شکستہ ہوے کہ انہیں بھی نئے رنگروٹوں کے برابر تنخواہیں ملی تھیں۔ اس سے زیادہ غلطی اس نے یہ کی کہ توپخانہ فراہم کرنے کی کوئی کوشش نہ کی، حالانکہ اس کا مقابلہ حیدر قلی خاں جیسے ماہر فن میر آتش سے تھا جس کے پاس ۱۶ سو چھوٹی بڑی توپیں تھیں۔ غرض اس غیر دانشمندانہ طیاری کے ساتھ عبداللہ خاں یکم محرم ۱۱۳۳ھ (یکم نومبر ۱۷۲۰ء) کو دھلی سے ابراہیم شاہ کو ساتھ لیکر محمد شاہ کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوا۔ مگر بھائی کے رنج اور اپنے اقتدار کے زوال سے اس کی دماغی حالت اسقدر بگڑی ہوئی تھی کہ کہنا کچھ چاہتا تھا اور زبان سے کچھ نکلتا تھا۔ قریب قریب یہی حالت سادات بارھہ کے اکثر سرداروں کی تھی۔ ایسی حالت میں محمد امین خاں اور حیدر قلی خاں جیسے آزمودہ کار سپہ سالاروں سے جنگ کرنے کا انجام ظاہر تھا۔

ادھر سے محمد شاہ حسین علیخاں کا سر اور مبارکباد کا خط نظام الملک کو

بھیج کر ۹ ر ذی الحجہ کو دھلی کی جانب روانہ ہوا، اور ۱۲ ر محرم ۱۱۳۳ھ کو حسن پور کے قریب (دھلی سے ۳۰ کوس کے فاصلہ پر) عبد اللہ خاں کے سامنے جا پہنچا۔ محمد شاہ کی فوج عبد اللہ خاں کے مقابلہ میں نصف کے قریب تھی مگر اُدھر بہادری کے ساتھ جوش دیوانگی کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ اور ادھر بہادری کے ساتھ ٹھنڈے دماغ اور جنچے تلے فیصلے کام کر رہے تھے۔ ۱۳ ر اور ۱۴ ر محرم کو ان دونوں قوتوں کا مقابلہ ہوا جسمیں حیدر قلی خاں کے توپخانہ نے عبد اللہ خاں کی فوج کو پارہ پارہ کر دیا، اسکے سپاہی جن میں سے اکثر نے پہلی مرتبہ میدان جنگ کی صورت دیکھی تھی اسے چھوڑ کر بھاگ گئے، مٹھی بھر آدمیوں کے ساتھ وہ آخر وقت تک لڑتا رہا، اور زخمی ہونے کے بعد گرفتار کر لیا گیا۔[1] اس طرح سادات بارھہ کی اس زبردست طاقت کا خاتمہ ہو گیا جس کے ہاتھ میں آٹھ برس تک ہندوستان کا تخت بازیچہ بنا ہوا تھا۔ جب تک وہ برسر اقتدار رہے ہزاروں لاکھوں گردنیں انکے سامنے جھکتی رہیں، اور جب ان کا ستارہ غروب ہو گیا تو وہ لوگ بھی جن پر انکے بڑے بڑے احسانات تھے، انہیں "نمک حرام" کہنے لگے۔ اس فعل سے اگر کوئی مستثنیٰ تھا تو وہ وہی نظام الملک تھا جسے انھوں نے تباہ کرنے کی کوشش میں اپنی جان دی اس شخص نے محمد شاہ کے حکم سے

---

[1] عبد اللہ خاں کی بقیہ زندگی قید میں گذری، اور آخر کار محرم ۱۱۳۵ھ (اکتوبر ۱۷۲۲ء) میں اسے زہر دے دیا گیا نظام الملک اس زمانہ میں وزیر تھے۔ انھوں نے اسکی جان بچانے کی پوری کوشش کی، مگر مغلوں میں عام طور پر یہ خیال تھا کہ اگر عبد اللہ خاں زندہ رہا تو پھر کوئی فتنہ ضرور اٹھے گا۔

بھی دونوں سیدوں کو "نمک حرام" کہنا اور ان پر لعنت کرنا قبول نہ کیا۔

محمد شاہ کے نئے ارکان سلطنت

سیدوں کے استبداد سے آزاد ہوتے ہی محمد شاہ نے ان سب لوگوں کو بڑے عہدے، خطابات اور مناصب عطا کئے جو انکے خلاف سازش میں شریک تھے۔ محمد امین خاں کو ہشت ہزاری منصب اور وزیر اعظم کا عہدہ دیا۔ اسکے بیٹے قمر الدین خاں کو ہفت ہزاری منصب اور بخشی دوم کا عہدہ عطا کیا۔ خان دوراں خواجہ عاصم کو حسین علی خاں کی جگہ امیرالامرا کا خطاب اور میر بخشی کا عہدہ عطا کیا۔ ظفر خاں کو روشن الدولہ کا خطاب اور بخشی سوم کا عہدہ دیا۔ حیدر قلی خاں کو معز الدولہ ناصر جنگ کا خطاب اور ہفت ہزاری منصب دیا اور میر آتشی کے ساتھ گجرات کی صوبہ داری پر بھی مقرر کر دیا سعادت خاں کو ہفت ہزاری منصب اور برہان الملک بہادر جنگ کا خطاب عطا کیا اور صوبہ آگرہ کی حکومت دی۔ اسطرح وہ لوگ منظر عام پہ آئے جو محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان کی بساط سیاست کے اصلی مہرے تھے۔

دکن میں مرہٹوں سے نظام الملک کے معاملات

حسین علی خاں کے قتل کے بعد ہی نظام الملک کو دکن سے طلبی کا فرمان بھیج دیا گیا۔ مگر انھوں نے کئی وجوہ سے عذر کر دیا۔ سب سے پہلی وجہ یہ تھی کہ بادشاہ نے محمد امین خاں کو وزارت کا عہدہ دیدیا تھا، حالانکہ سیدوں کا مقابلہ کرنے سے پہلے نظام الملک سے اس کا حتمی وعدہ کیا گیا تھا۔ یہ بدعہدی نظام الملک کے لئے سخت آزردگی کی موجب ہوئی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ محمد امین خاں کی موجودگی میں وہ دہلی جانا پسند نہ کرتے تھے۔ کیونکہ اب دونوں کی شخصیتیں برابر کی ٹکر ہو گئی تھیں اور نظام الملک کو اندیشہ تھا

کہ خاندانی تعلقات اور قدیم روابط محبت بھی اس رقابت کو راہ پانے سے نہ روک سکینگے جو دو مساوی شخصیت و اقتدار رکھنے والے لوگوں کے یکجا موجود ہونے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ تیسرے یہ کہ خود دکن کے حالات اسقدر خراب ہو چکے تھے کہ نظام الملک کو انکی اصلاح کے لیئے اپنی پوری قوت صرف کرنے کی ضرورت تھی۔ حسین علی خاں کے معاہدہ سے دکن میں مرہٹوں کی جرات کو حیات تازہ بخش دی تھی۔ وہ شاہی فرمان کی بنا پر ہر علاقہ سے چوتھ اور سردیشمکھی وصول کرنے کا اپنے آپ کو مجاز سمجھنے لگے تھے اور جس علاقہ پر ایک دفعہ ان کا ہاتھ دراز ہو جاتا تھا اس پر ہمیشہ کے لیے ان کا حق قائم ہو جاتا تھا۔ مختلف مرہٹہ سردار مختلف بادشاہی صوبوں میں چوتھ اور سردیشمکھی وصول کرنے کے لیئے فوجیں لے کر پہنچ گئے تھے۔ بالاجی وشوناتھ نے خاندیس اور برار پائیں گھاٹ کو سنبھال لیا۔ کنہوجی بھونسلے برار پائیں گھاٹ میں بھیجا گیا اور اسے گونڈوانہ اور تمام مشرقی علاقوں سے "خراج" وصول کرنے کا اختیار دیا گیا۔ فتح سنگھ بھونسلے کرناٹک کی طرف مامور کیا گیا۔ پرتی ندھی حیدرآباد اور بیدر کے صوبوں میں مقرر کیا گیا۔ سرلشکر اورنگ آباد کے صوبہ میں متعین کیا گیا، اور سیناپتی بگلانہ اور گجرات کی طرف بھیج دیا گیا

حسین علی خاں کے دکن سے واپس جانے کے بعد عالم علی خاں نائب صوبہ دار ہوا جو ایک ۲۰ برس کا ناتجربہ کار لڑکا تھا۔ وہ ان لوگوں کو قابو میں نہ رکھ سکا اور تھوڑی مدت کے اندر صوبہ میں مرہٹہ راجہ کے نائب نے وہی حیثیت اختیار کر لی جو خود بادشاہ کے نائب یعنی صوبہ دار کی حیثیت تھی۔ بلکہ بادشاہ کا نائب اس کے سامنے عملاً بے اختیار ہو گیا، اور

اسکی حکومت آزاد بلگرامی کے بقول "نام کی حکومت سے زیادہ نہ رہی"۔ اس حالت کو خود نواب نظام الملک نے صمصام الدولہ خاں دوراں کے نام ایک خط میں اسطرح بیان کیا ہے:-

"بحال داشتن وضع مصالحت کہ کور نمک ہا کفار دکن نمودہ باقتضائے مصلحت وقت، ومفقود بودن سر انجام صیانت قلاع و حراست ملک استیصال کفرہ، ناچار بعمل آمدہ۔ شکستن ایں طلسم بیش از امداد مبلغ معتدبہ از حضور و میسر شدن خزانہ و سپاہ فراواں و پذیرائی مطالب کہ مکرر بقلم آمدہ وتا حال اثرے ازاں پیدا نیست، خلاف عقل و دور از صلاح بود، لہذا مسلم داشتہ شد لیکن رؤسای ایں طائفہ ضالہ، تسلط و ضبطے کہ بامید بر توابع ندارند، ازیں جہت جمع از دائرہ سخن شنوی اینہا بدر جستہ باطراف منتشر می شوند و بدستور قدیم غبار فتنہ بلند می کنند۔ مکرر تاکیدات بر رؤسای جہنم ماوای ایں جماعہ بعمل آمدہ۔ لیکن نظر بر عدم ضبط بے اختیار اند۔ بہرحال بے اعانت نقد از حضور و پذیرا گشتن مطالب ضروری کہ بکرات نوشتہ شد غیر ازیں کہ بلا علاج دارد مدارے بایں گروہ، کہ مثل خون فاسد در رگ و ریشۂ ایں صوبہ جا دارند، کردہ شود، چارہ و تدبیرے نیست" (رقعات موسوی خاں)

ان حالات میں جنگ بالا پور کے بعد جب نظام الملک اورنگ آباد پہنچے (شوال ۱۱۳۲ھ / ۱۷۲۰ء) تو انھوں نے محسوس کیا کہ اگر مرہٹوں کے بڑھتے ہوئے زور کو جلدی سے جلدی نہ روکا گیا تو دکن کا صوبہ بالکل ہی ہاتھ سے جائیگا۔ اتفاقاً اسکے تھوڑی ہی مدت بعد بالاجی وشوا ناتھ مر گیا (اکتوبر ۱۷۲۰ء - اوائل ۱۱۳۳ھ)۔ اور اسکے بیٹے باجی راؤ نئے پیشوا کو مرہٹہ راج کے معاملات سنبھالنے میں دیر لگی۔ ان حالات سے فائدہ

اٹھاکر نظام الملک نے پھر کولھاپور کے راجہ سنبھاجی سے اپنے قدیم تعلقات تازہ کرنے شروع کیئے۔ دوسری طرف چندر سین جادو کو جسے حسین علیخاں نے دبا دیا تھا، از سر نو قوت پہنچائی۔ اور اس دوران میں ساہو کے وکیل کو جو نئے صوبہ دار سے سابق صوبہ دار کی عطا کردہ مراعات تسلیم کرانے آیا تھا، دم دلاسے دیکر ٹالتے رہے۔ ان کی پالیسی یہ تھی کہ ساہو سے براہ راست جھگڑا کرنے کے بجائے خود مرہٹوں میں سے دو طاقتور حریفوں کو اس کے مقابلہ میں کھڑا کر دیں، اور پھر اپنی قوت کو ایک ثالث کی حیثیت سے استعمال کریں۔ چنانچہ جب ان کا یہ منصوبہ مکمل ہو گیا تو انھوں نے سنبھاجی اور چندر سین کے دعاوی کی بنا پر راجہ ساہو کے اس فعل کو سختی کے ساتھ قابل اعتراض قرار دیا کہ وہ شاہی علاقوں میں اپنے تحصیلدار مقرر کر کے تنہا خود ہی چوتھ اور سردیسمکھی وصول کر رہا ہے۔ باجی راؤ نے اسکے جواب میں جنگ کی طیاری شروع کر دی اور صوبہ اورنگ آباد کی سرحد پر مرہٹہ افواج کا اجتماع ہونے لگا۔ یہ قضیہ ابھی یہیں تک پہنچا تھا، اور نظام الملک کسی زبردست جوابی کارروائی کی فکر میں تھے، کہ دہلی سے ان کے نام شاہی فرمان آگیا جسمیں انہیں وزارت عظمیٰ کی خدمت کے لئے طلب کیا گیا تھا۔ اپنے بعد انہیں کوئی شخص ایسا نظر نہ آتا تھا جو انکی پالیسی کو کامیابی کے ساتھ چلا سکتا۔ اسلئے ناچار انھوں نے باجی راؤ کے مطالبات قبول کر لیئے۔

نظام الملک کی وزارت محمد امین خاں سابق وزیر اعظم عبداللہ خاں کی شکست کے بعد دو تین مہینہ سے زیادہ وزارت کا لطف نہ اٹھا سکا اور ربیع الثانی ۱۱۳۳؁ (جنوری ۱۷۲۱ء) میں اس کا انتقال ہو گیا۔

وزارت کے لئے اسکے بیٹے قمر الدین خاں اور خان دوراں خواجہ عاصم کے درمیان کچھ عرصہ تک کشمکش رہی۔ آخر کار اس بات پر تصفیہ ہوا کہ وزارت دونوں میں سے کسی کو نہ دی جائے بلکہ اس عہدہ کے لئے نظام الملک کو دکن سے بلایا جائے۔ ادھر خود نظام الملک نے بھی محمد امین خاں کی خبر وفات سن کر ایک طویل خط سعد الدین خان ناظم بیوتات کو لکھا اور اسمیں بادشاہ کی بد عہدی اور اپنی سابق حق تلفی کی شکایت کر کے وزارت کے لئے اپنا دعوی پیش کیا۔ اس خط کے چند فقرے یہ ہیں :-

" زمان صوبہ داری مالوہ نوشتہ جات حضور متواتر می رسید کہ خاطر اشرف خواہانِ استیصال معاندانِ فساد پیشہ است، و بارہا فرمودہ اند کہ در صورت التزام این امر وزارت را بحضور مفوّض شناسند چنانچہ درین باب فرمان والاشان بخط خاص شرف صدور یافت الحمد للہ والمنۃ کہ نظر بر مرضی مبارک پروای جان و مال و صرفہ عیال و اطفال تنخواہ دست از خان و مال کشیدہ ہنگامے کہ ہیچ کس در اقدام بایں امر خطیر رفاقت و اہم قبول نمی کرد متوکلاً علی اللہ المستعان کمر ہمت و عزم بستہ با عادی کہ بکثرت و انبوہ تمام با توپہای کلاں و توپخانہ فراوان معرکہ آرای قتال شدند و داد جلادت و مردانگی دادند، محاربات عظیم رو داد۔ بفضل الٰہی و اقبال بادشاہی فتوحات پے در پے نصیب شد۔ التزام شدہ اند کہ درین مہم اہم بعمل آمدہ زیادہ از حوصلہ بشری است۔ بعد ازیں ہمہ ترددات و مجادلات، رعب و صولت آنہا کہ در دلہا جا کردہ بود برطرف شدہ و قدر و وقع آنہا یک قلم از نظر ہا رفتہ جمعیت مخالفان از ہم پاشیدہ و

تفرقہ کلی در آنہا راہ یافتہ نبات النفس شدند۔ تا آنکہ بسعی اعتماد الدولہ مرحوم قتل حسین علی خان صورت بست۔ و قطب الملک بے دست و پا گشتہ مثل مرغ بے پر و بال بریسمان کشیدنی بدام آمد۔ و عرصۂ سلطنت صفائی اتم پذیرفت۔ منظور ازیں ہمہ جانبازیہا حصول ثمرات و ایفای عہد امر وزارت بود کہ ارشاد وفاءٌ للعہد حق ماست۔ نظر بر ایفای عہد و میثاق مرقوم ضرور بود کہ اعتماد الدولہ مغفور اقدام بقبول وزارت نمی نمودند۔ خوب باقتضای بشریت بے مروتی و خلف وعدہ کہ نبایست، از ایشان بعمل آمد۔ اگرچہ ایں تخلف دراں وقت ہم مکروہ طبع بود۔ لیکن نظر بر قرابت گویا بجا بود وازیں سبب خاطر نیز فی الجملہ اطمینان داشت۔ الحال کہ ایشان از میان رفتہ اند، امر مرقوم کہ ارفع امور است اگر بدیگرے مستقل گردد، بر طبیعت زیادہ ازانچہ در حوصلۂ تحریر گنجد، گراں و ناگوار خواہد بود و اختیار نوکری ہم گوارا نخواہد شد۔ بالفعل برای تجدید نسق برہم خوردۂ دکن بضرورت توقف رو دادہ و برای انتظام مہام صوبہ دار الظفر بیجاپور فوج فیروزی قریب بادونی رسیدہ۔ انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب فراغ حاصل نمودہ بحضور پر نور رسیدہ می شود۔ تا آں وقت عنایت اللہ خاں یا شخص دیگر کہ بخاطر اقدس رسد، نیابت ما سرانجام دہد۔" (رقعات موسوی خاں)

اس خط نے وزارت کے مسئلہ کا قطعی فیصلہ کر دیا۔ نظام الملک کے نام فوراً وزارت پر تقرر کا فرمان بھیجا گیا، اور خود انہی کی تجویز کے مطابق انکے آنے تک عنایت اللہ خاں کشمیری کو (جو فرخ سیر کے زمانہ میں دیوان خالصہ و تن تھا اور اب خانسامانی کا عہدہ رکھتا تھا) نائب وزیر کی حیثیت سے خدمات وزارت انجام دینے کے لئے مقرر کر دیا گیا۔

نظام الملک کو شاہی فرمان اسوقت ملا جبکہ وہ کرناٹک کے افغان سرداروں کو مطیع کرنے کے لئے ادھونی گئے ہوئے تھے۔ اسی وقت اورنگ آباد واپس ہوئے، وہاں اپنے پھوپھا عضد الدولہ قسورہ جنگ[1] کو نائب صوبہ دار کی حیثیت سے مامور کر کے ذوالحجہ ۱۱۳۳ھ (اکتوبر ۱۷۲۱ء) میں دھلی کی جانب روانہ ہوئے اور ربیع الثانی ۱۱۳۴ھ (فروری ۱۷۲۲ء) میں دھلی پہنچ کر ۵۲ برس کی عمر میں خلعت وزارت پہنا۔

نظام الملک کا وزارت پر فائز ہونا سلطنت مغلیہ کے لئے ایک ایسا اچھا موقع تھا کہ اگر اس سے فائدہ اٹھایا جاتا تو یقیناً سلطنت میں از سر نو ایک جان پڑ جاتی، اور اس کے مائل بہ انتشار اجزا میں پھر ایک پختہ اتصال پیدا ہو جاتا۔ ایک اعلیٰ درجہ کے قائد، مدبر اور منتظم ہونے کی حیثیت سے امرائے دولت میں صرف انہی کی ذات ایسی باقی رہ گئی تھی جو بگڑے ہوئے حالات کو درست کرنے، اور مرکزی اقتدار کے روزافزوں انحطاط کو سنبھال

---

[1] اصلی نام خواجہ کمال تھا۔ نظام الملک کی حقیقی پھوپھی اس سے منسوب تھیں۔ عالمگیر کے زمانہ میں توران سے ہندوستان آیا اور غازی الدین خاں فیروز جنگ کے توسط سے صوبہ حیدرآباد میں شاہی خدمات پر مقرر کیا گیا۔ عالمگیر نے اسکو عوض خاں کا خطاب دیا تھا۔ فرخ سیر کے عہد میں اسکو برار کی صوبہ داری دی گئی جس پر وہ محمد شاہ کے زمانہ تک رہا۔ عالم علی خاں کو شکست دینے کے بعد جب نظام الملک اورنگ آباد پہنچے تو انھوں نے اسے پنج ہزاری منصب اور عضد الدولہ قسورہ جنگ کا خطاب دلوایا۔ اورنگ آباد کی مسجد شاہ گنج اسی کی بنوائی ہوئی ہے اس مسجد کے آگے جو عظیم الشان حوض ہے اسکی تعمیر حسین علیخاں نے شروع کی تھی مگر توسیع و تکمیل عوض خاں نے کی۔

لینے کی قوت رکھتی تھی۔ ملک میں انکے حسن تدبیر اور زور شمشیر کی جیسی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ انکی وزارت کا اعلان ہوتے ہی اجیت سنگھ راٹھور والی جودھپور نے جو بادشاہ گر سیدوں کا زبردست حامی تھا اور جس نے سیدوں کے زوال پر علی الاعلان بغاوت کر کے اجمیر اور گجرات کے صوبوں میں شاہی اقتدار کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا، محمد شاہ کی اطاعت قبول کر لی، حالانکہ خان دوران، حیدر قلی خان اور قمر الدین خاں اعتماد الدولہ وغیرہ امرا اسکے مقابلہ سے عاجز ہو چکے تھے اور اسکی غارت گر فوجیں دھلی سے ١٦ میل کے فاصلہ پر الہ ویردی خاں کی سرا تک چھاپے مارتی ہوئی پہنچ گئی تھیں۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظام الملک کی وزارت میں سلطنت کی مرکزیت اور اسکی گرفت کو مضبوط کرنے کی زبردست قوت موجود تھی۔ مگر محض قوت کا موجود ہونا مفید نہیں ہو سکتا تھا، جبتک کہ اسکو کام کرنے کا موقع نہ دیا جاتا۔ اور یہ بہت جلدی ثابت ہو گیا کہ محمد شاہ اور اسکے ارکان دولت نئے وزیر اعظم کی قابلیتوں کو سمجھنے کی نہ صلاحیت رکھتے تھے، اور نہ انکو عمل کرنے کا کوئی موقع دینا چاہتے تھے۔

بادشاہ اور وزیر میں اختلاف محمد شاہ کا نیا وزیر اعظم ایک ایسا شخص تھا جس نے عالمگیر اعظم کے دامن تربیت میں آنکھیں کھولی تھیں، اور جسکی نگاہ میں سیاست و حکومت اور بادشاہی و فرمانروائی کا نمونہ عالمگیر کی ذات تھی۔ وہ ہندوستان کے تخت پر ایک ایسے شخص کو دیکھنا چاہتا تھا جو شاہانہ تجمل و وقار، بردباری و تحمل، حفظ آداب و مراتب، تہذیب اخلاق و تادیب اتباع، ضبط اوقات و فصل معاملات

میں عالمگیر کا صحیح جانشین ہو۔ اسکی خواہش تھی کہ بادشاہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ سلطنت کے کاموں پر صرف کرے، حکومت کے معاملہ میں شخصی رعایات سے کام نہ لے، قابل اور اہل لوگوں کو عہدوں پر مقرر کرے، امارت، خطابات اور مناصب ایسے لوگوں کو دے جو اِن چیزوں کی اہلیت رکھتے ہوں، اور اپنی اندرونی اور بیرونی معاشرت میں اُس متانت و پاکیزگی کو اختیار کرے جو شاہانہ عزت و حرمت کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ لیکن اس قسم کے خیالات رکھنے والے وزیر کو ایک ایسے نوعمر بادشاہ کے ساتھ واسطہ پڑا تھا جو رنگیلا[1]، عیش پسند، چھنوڑا اور لہو و لعب کا دلدادہ تھا۔ وہ "خوش باش دمے کہ زندگانی ایں است" کا قائل تھا۔ حکومت و سیاست کے خشک مسائل سے اسے دلچسپی نہ تھی۔ اس کی نگاہ میں وہ شخص ہر عنایت اور ہر مرتبہ و عزت کا مستحق تھا جو اسے خوش کر سکے، ہنسا سکے، اور اسکی دلچسپیوں کا سامان فراہم کر سکے۔ وہ قابلیت و اہلیت کو پرکھنے کی کوئی کسوٹی اپنے کانوں اور اپنی آنکھوں کی لذت کے سوا نہ رکھتا تھا۔ اسکے نزدیک عالمگیر کے زمانہ کا نظام الملک بہت دقیانوسی، قدامت پسند، اور فرسودہ خیالات کا آدمی تھا جس کی باتیں مضحکہ انگیز، جسکی تجویزیں حماقت آمیز، اور جسکی رائیں ناقابل توجہ تھیں۔ نوجوان بادشاہ کے اس رنگ طبیعت کو دیکھکر اسکے گرد ایسے لوگ فراہم ہو گئے تھے جنھوں نے اپنی خوشامد، فریب کاری، اور مصاحبت کے سبب سے اسکے مزاج میں دخل پالیا تھا۔ یہ لوگ اسکی دلچسپیوں، اس کے مشاغل، اسکے کھیل کود میں شریک ہوتے، ہر ممکن طریقہ سے اسکو خوش کرتے، اور اسکے تفر

---

[1] اس لفظ سے محمد شاہ کی سیرت کو ایسی قریبی مناسبت تھی کہ دلی والوں میں آجتک وہ محمد شاہ رنگیلے کے نام سے مشہور ہے۔

سے فائدہ اٹھا کر رعایا کو لوٹتے، رشوتیں لیتے اور سلطنت کے بڑے بڑے عہدے اور مناصب فروخت کرتے تھے۔ ان میں ایک شخص بھی اپنی سیرت، قابلیت اور ذہنیت کے لحاظ سے اس کا اہل نہ تھا کہ شاہی دربار میں جگہ پاتا، لیکن بادشاہ کی رنگین مزاجی، سفلہ نوازی، خوشامد پسندی، اور سب سے زیادہ مردم ناشناسی کی بدولت انہیں مراتب و مناصب ملے، شاہی تقرب حاصل ہوا، اور مملکت ہند کا حل و عقد ان کے ہاتھوں میں آگیا۔ ان لوگوں کی ذاتی اغراض کے لئے اس سے زیادہ نقصان دہ اور کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی کہ نظام الملک جیسا شخص دربار میں رہے اور بادشاہ پر اس کا اثر قائم ہو، اسلئے انھوں نے نظام الملک کی مخالفت اور بادشاہ کو ان سے برگشتہ کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، اور ایسی ایسی حرکات کیں، جن سے خود نظام الملک دل برداشتہ ہو گئے۔

محمد شاہ کے دوستوں کی حالت محمد شاہ کے ان مقربین بارگاہ کا بھی تھوڑا سا تعارف کر دینا ضروری ہے۔ ان میں سب سے زیادہ با اثر رحیم النسا نامی ایک عورت جان محمد درویش کی لڑکی تھی۔ نہایت ہوشیار، چالاک، پڑھی لکھی، اور محلات کے آداب سے واقف۔ امرا کے ہاں اپنے باپ کی غیب دانی کا چرچا کرتی پھرتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کا شہرہ قلعہ معلی تک بھی پہنچا، اور محمد شاہ کی ماں سے جبکہ وہ اور محمد شاہ دونوں سلیم گڈھ میں نظر بند تھے اس کا تعارف ہو گیا۔ جان محمد کی چند پیش گوئیاں اسکے حق میں صحیح نکلیں جن سے وہ اسکی معتقد ہو گئی، اور رحیم النسا کی چرب زبانی نے اسکے دل میں گھر کر لیا۔ خود محمد شاہ کو اس سے محبت ہو گئی، اور ماں بیٹوں نے اسے اپنے ساتھ رکھنے کے لئے مشہور

کر دیا کہ وہ محمد شاہ کی دودھ شریک بہن ہے۔ اس وقت سے وہ کوکی جیو کہلانے لگی۔ سیدوں کے زوال کے بعد جب سلطنت کے اختیارات محمد شاہ کے ہاتھ میں آئے تو یہ اس پر اتنی حاوی ہو گئی کہ اس نے شاہی مہر اس کے حوالہ کر دی اور اسے اختیار دے دیا کہ سرکاری کاغذات پر بادشاہ کی نائب کی حیثیت سے مہر کر دیا کرے۔ بڑے بڑے امرا، فوجدار، دیوان اور صوبہ دار اس کے دروازے پر پہنچتے اور اسکو رشوتیں دیکر اپنے تقرر کے فرامین حاصل کرتے تھے۔ جاگیر، منصب، ترقی، تقرر، غرض ہر چیز کے فرامین اسکے ہاتھ سے نکلتے اور وہ ہر فرمان کی قیمت وصول کرتی تھی۔ محمد خاں بنگش کا بیان ہے کہ مالوہ کی صوبہ داری کا فرمان حاصل کرنے کے لئے اسے کوکی جیو کو ایک لاکھ روپے دینے پڑے تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کاروبار اس کے ہاتھ میں کس قدر ترقی پر تھا۔ آخر میں صمصام الدولہ خاں دوران کی سازش سے اسکو زوال نصیب ہوا۔

ایک دوسرا شخص شاہ عبد الغفور تھا جس کا ذکر حسین علی خاں کے قتل کی سازش کے سلسلہ میں ہو چکا ہے۔ اس نے اور کوکی جیو نے باہم ایک دوسرے کی تائید کا عہد کر لیا تھا۔ کوکی حرم سرا میں اس کی ولایت و خدا رسیدگی کے چرچے کرتی، اور یہ کوکی کے باپ کی غیب دانی پر شہادت دیتا۔ اس طریقہ سے محمد شاہ اور اس کی ماں پر اس کا گہرا اثر قائم ہو گیا، اور ۱۳ سال تک یہ سلطنت کے معاملات پر ایسا حاوی رہا کہ اسکے سامنے وزیر کی بھی کوئی حقیقت نہ تھی۔ بلکہ بادشاہ تک کے احکام اس کے مقابلہ میں نہیں چل سکتے تھے۔ کوکی کے معاملات میں یہ اس کا ساتھی اور رشوتوں میں اس کا حصہ دار تھا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس طریقہ

ہے اسکو ۵ ہزار روپیہ روزانہ کی آمدنی ہوتی تھی۔ اسکے علاوہ محمد شاہ نے اسکو ٹکسال کا داروغہ بھی بنا دیا تھا جس کا حساب کتاب پوچھنے کی کوئی جرأت نہ کر سکتا تھا اور یہ اسمیں بے حساب غبن کرتا تھا۔ آخر میں جب حسابات کی جانچ کی گئی تو اسکے ذمہ ۶۰ لاکھ روپیہ واجب نکلا۔ اِس ولی اللہ کی للّٰہیت کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ اس نے اپنے ایک ملازم کو طلب کیا، معلوم ہوا کہ نماز پڑھ رہا ہے، اِس پر اس نے حکم دیا کہ جس حال میں ہو پکڑ لاؤ، چنانچہ وہ حالت نماز ہی میں گھسیٹ لایا گیا اور اس ظالم نے اس سے کہا کہ "تیرا آقا جو تجھے روزی دیتا ہے عبد الغفور ہے اور وہ یہاں بیٹھا ہے، پھر تو کس کی نماز پڑھ رہا تھا؟" اس کا ایک بیٹا عبدالرحیم نامی تھا جسے محمد شاہ نے شش ہزاری منصب عطا کیا تھا۔ اسکی بدمستی و سرکشی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ کسی کی جان اور عزت اسکے ہاتھوں محفوظ نہ تھی۔ بدمعاشوں کی ایک ٹولی ہر وقت اسکے ساتھ مسلح رہتی۔ کبھی وہ زنانہ لباس اور زیور پہنکر سڑکوں پر نکلتا، کبھی زرہ بکتر پہن کر پورا سپاہی بنا ہوا نکلتا، کبھی پاؤں میں گھونگھرو باندھ کر سر بازار ناچتا، اور ان تمام حالتوں میں اسکے بدمعاش ساتھی لوگوں کے راستے روک دیتے تھے، اور جو کوئی مزاحمت کرتا اسے قتل کر ڈالتے تھے۔ شریف عورتوں کی ڈولیاں اس کے محلہ سے گذرتی مشکل تھیں۔ وہ جس کی ڈولی چاہتا روک لیتا اور جو عورت اسے پسند آجاتی وہ اپنی عصمت اس سے نہ بچا سکتی تھی۔ یہ محمد شاہ کا شش ہزاری منصب دار تھا، حالانکہ کسی زمانہ میں وزراء اور نامور سپہ سالار اور بڑے بڑے والیان ریاست اس منصب کی تمنا کیا کرتے تھے۔

ظفر خاں روشن الدولہ محمد شاہ کا یار غار اور نفس ناطقہ بنا ہوا تھا۔ اس شخص میں کسی قسم کی علمی یا انتظامی یا فوجی قابلیت نہ تھی صرف مصاحبت، خوشامد اور چرب زبانی سے اس نے بادشاہ کے مزاج پر قابو پا لیا تھا، اور کوکی جیو سے بھی اس کا گہرا سازباز تھا۔ ان اثرات سے اس کو خوب آمدنی ہوتی تھی اور وہ اس دولت کو چراغاں کرنے، عمارات اور مساجد بنانے، اور بخشش و خیرات کرنے میں بے دریغ خرچ کرتا تھا جس سے عوام میں بھی اسکو شہرت حاصل ہو گئی تھی۔

ان لوگوں کے علاوہ برہان الملک سعادت خاں، صمصام الدولہ خان دوراں، اور حیدر قلی خاں[1] بھی جنکی سیرت سے ناظرین پہلے روشناس ہو چکے ہیں، بادشاہ پر بہت اثر رکھتے تھے اور یہ سب اپنے مفاد کے لیے نظام الملک کے وجود کو نقصان دہ سمجھتے تھے۔ انہیں سے حیدر قلی خاں سب سے زیادہ دیوانی و ملکی معاملات میں مداخلت کرتا تھا اور اپنے آپ کو وزیر سے کم نہ سمجھتا تھا۔ نظام الملک نے بمشکل محمد شاہ کو اس پر

---

[1] پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ حیدر قلی میر جملہ کے توسل سے نظام الملک کی پہلی صوبہ داری کے زمانہ میں دکن کا دیوان مقرر ہوا تھا۔ وہاں اس نے کروڑیوں اور متصدیوں پر زیادتی شروع کر دی اور نظام الملک کے پاس اسکے پیہم شکایات آئیں۔ اس پر نظام الملک نے اسکو سختی کے ساتھ ڈانٹا اور حکم دیا کہ جب تک وہ اپنے کردار کی اصلاح نہ کرے سلام کے لئے حاضر نہ ہو۔ آخرکار یہ دل برداشتہ ہو کر دکن سے واپس چلا گیا۔ اسی وقت سے اس کے اور نظام الملک کے درمیان مخالفت چلی آ رہی تھی۔

راضی کیا کہ ایسے گجرات کی طرف رخصت کردے، جہاں کی صوبہ داری پر اس سے پہلے وہ مقرر کیا جا چکا تھا۔

اس مختصر تشریح سے بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ محمد شاہ کے گرد کس قسم کے آدمی جمع تھے، اور نظام الملک سے ان کی مخالفت کے کیا اسباب تھے۔ نظام الملک نے کوشش کی کہ بادشاہ ان لوگوں کے دام سے نکلے، اور ان لوگوں نے کوشش کی کہ بادشاہ خود نظام الملک کو دفع کردے۔ آخر کار سلطنت کا دوست نظام الملک اپنے مقصد میں ناکام ہوا، اور سلطنت کے دشمن اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے۔

اصلاحات کے لئے نظام الملک کی تجاویز

سلطنت کے حالات کو درست کرنے کے لئے نظام الملک نے بادشاہ کے سامنے پہلی تجاویز جو پیش کیں وہ یہ تھیں :-

(۱) عہدوں کی خرید و فروخت کا سلسلہ بند کیا جائے، اور عہدہ داروں کے تقرر پر پیش کش یا نذرانہ کے طور پر جو رشوت لی جاتی ہے اسکو موقوف کر دیا جائے۔

(۲) محالات خالصہ میں سے بار آور اور زرخیز اراضی کو شاہزادوں، شاہزادیوں، اور امرا کی جاگیروں میں دینے کا طریقہ موقوف کیا جائے۔ اس طریقہ سے وہ بہترین زمینیں جو سلطنت کی آمدنی کا اصلی ذریعہ ہیں اشخاص کے قبضہ میں چلی جاتی ہیں اور سرکاری خزانہ میں اتنا روپیہ داخل نہیں ہوتا جو سلطنت کے مصارف اور ملازموں کی تنخواہوں کے لئے کافی ہو، ملازموں کی تنخواہیں مہینوں بقایا میں رہتی ہیں، اور اسکی تلافی کے لئے وہ رشوتیں لیتے اور رعایا کو

لوٹتے ہیں۔

(۳) نااہل لوگوں کو اعلیٰ مناصب دینے، اور پرانے آزمودہ کار اور مستحق لوگوں کو محروم رکھنے سے احتراز کیا جائے۔ اس سے کاردان لوگ بیکار ہوگئے ہیں، اور ناکارہ لوگوں کے ہاتھ میں آکر امور سلطنت خراب ہورہے ہیں۔

(۴) انتظام مالگزاری کی ابتری دور کی جائے، جسکی بدولت اجناس گراں ہوگئی ہیں اور رعایا پریشان ہورہی ہے۔ ہر روز دفتر وزارت کے سامنے لوگ "فریاد فریاد" کی صدا بلند کرتے ہوئے جمع ہوجاتے ہیں، اور ان فریادیوں میں پرانے نامور امرا کی اولاد بھی ہوتی ہے، جنمیں سے کوئی پکارتا ہے کہ میں "مہابت خاں کے خاندان سے ہوں" اور کوئی کہتا ہے کہ میں "علی مرداں خاں کا پوتا ہوں"۔

ان اصلاحات کے اجرا میں محمد شاہ کے درباریوں اور حواریوں کا نقصان تھا، اسلئے انھوں نے مزاحمت کی اور بادشاہ کو کسی تجویز پر راضی نہ ہونے دیا۔ دربار میں اصلاح و تخریب کے درمیان یہ کشمکش جاری تھی کہ گجرات سے حیدر قلی خاں کی شورش کی خبریں آئیں اور نظام الملک کو اس کے انسداد کے لئے احمد آباد جانا پڑا۔

مالوہ اور گجرات کا انتظام اوپر ذکر ہوچکا ہے کہ نظام الملک نے حیدر قلی خاں کو بمشکل دارالسلطنت سے دفع کرکے گجرات بھجوایا تھا۔ گجرات پہنچ کر اس من چلے شخص نے ظلم و ستم سے روپیہ وصول کرنا شروع کیا، امرا اور شاہی عہدہ داروں کی جاگیروں پر قبضہ کرلیا، سورت کے تاجروں پر دست درازی کی اور انکے اموال ضبط کرلئے۔ عبدالغفور

نامی ایک مشہور بوہرہ تاجر کو جو سورت کا ملک التجار سمجھا جاتا تھا، لوٹ لیا، اور ان طریقوں سے اس نے بے شمار دولت فراہم کرکے عربوں، حبشیوں اور فرنگیوں کی ایک فوج بھرتی کی، اور علی الاعلان ایسی حرکتیں کرنے لگا جن سے خود مختاری و بغاوت کی بو آتی تھی۔ نظام الملک کے بار بار عرض کرنے کے باوجود بادشاہ اپنے منظور نظر صوبہ دار کی تادیب پر راضی نہ ہوتا تھا۔ آخر کار جب یہ خبریں آئیں کہ حیدر قلی نے اپنے صوبہ میں وہ اختیارات استعمال کرنے شروع کر دیے ہیں جو صرف بادشاہ کے لئے مخصوص ہیں تو مجبوراً بادشاہ اس پر آمادہ ہوا کہ نظام الملک خود گجرات جاکر اس کی سرکوبی کریں۔ چنانچہ صفر ۱۱۳۵ھ (نومبر ۱۷۲۲ء) میں گجرات اور اس سے متصل مالوہ کی صوبہ داری نظام الملک کو عطا کی گئی اور وہ احمد آباد کی طرف بھیجے گئے۔ جب وہ گجرات کی سرحد پر جھابوہ تک پہنچ گئے تو حیدر قلی خاں نے مدافعت کے لئے اپنے صوبہ کے امراء سے مدد مانگی، مگر انھوں نے نئے صوبہ دار اور وزیر اعظم کے مقابلہ میں معزول و معتوب صوبہ دار کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ خود اس کے اکثر ساتھی جو تورانی تھے، نظام الملک کو اپنا سردار سمجھتے تھے اور وہ اپنے سردار کے مقابلہ میں اس کی حمایت کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے۔ حیدر قلی خاں نے جب اپنے آپ کو نظام الملک کے سامنے اسقدر بے بس پایا تو دیوانہ بن گیا اور اس کے ساتھی اسکو اودے پور کے راستے سے دہلی لے کر بھاگ گئے۔ نظام الملک بلا کسی مزاحمت کے گجرات میں داخل ہوئے، وہاں کے بگڑے ہوئے حالات کو درست کیا، دھولکا، بھروچ، جمبوسر، مقبول آباد اور بلسار کے پرگنے اپنی ذاتی

جاگیر میں شامل کیے، اور اپنے چچا معز الدولہ حامد خاں بہادر صلابت جنگ[1] کو اپنا نائب مقرر کر کے مالوہ کی طرف واپس ہوئے۔ مالوہ میں دوست محمد خاں والی بھوپال کو جس سے انکی پرانی مخالفت تھی اطاعت پر مجبور کیا، اور اپنے پھوپھی زاد بھائی عظیم اللہ خاں کو نائب صوبہ دار مقرر کر کے شوال ۱۱۳۵ھ (جولائی ۱۷۲۳ء) میں دھلی پہنچے۔

نظام الملک کے خلاف سازشیں

اس آٹھ نو مہینہ کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر اہل دربار نے نظام الملک کے لیے پہلے سے بھی زیادہ مشکلات کا سامان فراہم کر رکھا تھا۔ وہ دار السلطنت واپس آئے تو انھوں نے دیکھا کہ ہر شخص وزیر اعظم بنا ہوا ہے اور در اصل وزیر اعظم کوئی بھی نہیں ہے۔ بادشاہ کے اہالی موالی، حتیٰ کہ خواجہ سراؤں کی بھی تجویزیں سنی جاتیں اور سلطنت کے بڑے بڑے معاملات میں ان کو مداخلت کا موقع دیا جاتا تھا، مگر وزیر جو انتظام سلطنت کا اصلی ذمہ دار تھا، اسکے مشورے سنے ان سنے کر دیئے جاتے تھے۔ حرم سرا سے لیکر دیوان

---

[1] یہ غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ کا چھوٹا بھائی تھا۔ عالمگیر کے عہد میں منصب و خطاب سے سرفراز ہو چکا تھا۔ عالمگیر کے بعد شاہزادہ اعظم کے ساتھ مل کر بہادر شاہ سے جنگ کی۔ پھر اعظم کی شکست کے بعد بہادر شاہ کی ملازمت میں داخل ہو گیا، اور ۳؁ بہادر شاہی میں بیجاپور کی صوبہ داری پر مقرر ہوا، پھر کچھ مدت بعد اس خدمت سے دھلی واپس بلا لیا گیا۔ محمد امین خاں سے اسکے تعلقات خراب تھے، اسلئے حسن پور کی جنگ میں اس نے سید عبد اللہ خان کا ساتھ دیا تھا، مگر بعد میں نظام الملک کی خاطر اسکو معاف کر دیا گیا اور معز الدولہ صلابت جنگ کا خطاب دیکر گجرات کی نیابت صوبہ داری پر مقرر کیا گیا۔ یہ اپنی عادات و خصائل کی بنا پر "جنگلی شہزادہ" کہلاتا تھا۔

عام تک جتنے لوگ بادشاہ کے گرد و پیش تھے سب نے باہم یہ سازش کر لی تھی کہ نظام الملک کی کوئی بات نہ چلنے دی جائے۔ اس سازش کا سرغنہ صمصام الدولہ خان دوراں تھا جس نے دربار میں مغلوں کے خلاف ایک ہندوستانی پارٹی بنا رکھی تھی، اور ہندوستان زا مسلمانوں اور ہندو راجاؤں کے ساتھ متحد ہو کر اس نے یہ آواز بلند کرنی شروع کر دی تھی کہ ہر مغل (یعنی جو ترکستان، ماوراءالنہر یا ایران سے آیا ہوا ہو) خواہ اسکو ہندوستان میں رہتے بستے سو دو سو برس ہی کیوں نہ ہو گئے ہوں، بہرحال غیر ملکی ہے لہذا ہمارے ملک کے انتظام میں اُسکا کوئی حصہ نہ ہونا چاہئے۔ ان لوگوں نے آخر میں یہ کوشش کی کہ اپنی خفیہ چالوں سے بادشاہ اور نظام الملک میں عداوت پیدا کر دیں۔ چنانچہ یہ جب نظام الملک کے پاس آتے تو ان سے کہتے کہ محمد شاہ بالکل ناکارہ آدمی ہے، اسے معزول کر کے محمد ابراہیم کو تخت پر بٹھانا چاہئے۔ اور دوسری طرف بادشاہ سے جا کر کہتے کہ نظام الملک آپ کو معزول کر کے محمد ابراہیم کو تخت نشین کرنے کی فکر میں ہیں اور وہی اقتدار بہم پہنچانا چاہتے ہیں جو بادشاہ گر سیدوں نے حاصل کیا تھا۔ وہ محمد شاہ سے کہتے تھے کہ یہ چالاک بڈھا رفتہ رفتہ تمام ملک پر قبضہ جما رہا ہے۔ دکن کا عظیم الشان صوبہ جو پچھلے زمانہ میں کئی سلطنتوں کا شہ نشین تھا آپکی عطا کے بغیر اس نے از خود سیدوں سے چھین لیا۔ گجرات اور مالوہ کے بڑے بڑے صوبے بھی اس نے بلطائف الحیل آپ سے لے لئے، اور اب جو ملک باقی ہے اس پر وہ وزارت کے نام سے حاوی ہو گیا ہے۔ ان باتوں نے بادشاہ کو نظام الملک سے سخت بدگمان کر دیا، یہاں تک کہ نظام الملک کو اپنی جان کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ ۱۱۳۶ھ کی ابتدا میں انھوں نے دربار کی

آمد و رفت بند کر دی۔ وزارت سے استعفیٰ دیدیا اور دکن واپس جانے کا ارادہ کرلیا۔ مگر اہل دربار انکی طاقت سے واقف تھے، اور کھلم کھلا ان سے مخالفت کی جرأت نہ رکھتے تھے، اسلیئے انھوں نے بادشاہ اور وزیر میں مصالحت کرادی، اور بادشاہ کے کہنے سننے سے انھوں نے پھر دربار میں آنا جانا شروع کر دیا۔

سلطنت کی مایوس کن حالت یہ زمانہ جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں سلطنت مغلیہ کا بدترین زمانہ تھا۔ حکومت کے معاملات کی ابتری انتہا کو پہنچی ہوئی سیاسی، دیوانی، انتظامی، عدالتی، فوجی، غرض حکومت کے تمام محکمے بلا استثناء، بدنظمی کی عام وبا کے شکار ہو چکے تھے۔ چھوٹے سے لیکر بڑے تک تمام عہدہ داروں، اہلکاروں اور منصب داروں سے فرض کا احساس رخصت ہو چکا تھا۔ لوگوں نے اپنی ذاتی اغراض کے لیئے لحاظ سے مختلف جتھے بنا رکھے تھے۔ اور ہر جتھے کے افراد کی دلچسپیوں کا مرکز تمام تر اپنے جتھے کا مفاد اور دوسرے جتھوں کا عناد بنا ہوا تھا۔ ہر شخص جو کچھ سوچتا تھا ایک خاص جتھے کے فرد کی حیثیت سے سوچتا تھا، اور مجموعی طور پر ملک یا قوم یا سلطنت کے فرد کی حیثیت سے سوچنے کی صلاحیت اسمیں نہ تھی۔ ان جتھوں کے درمیان جوڑ توڑ، سازشوں اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششوں کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری تھا، اور اسمیں کسی کو ملک اور سلطنت کے عمومی فائدے یا نقصان کا خیال بھی نہ آتا تھا۔ امراکی شخصی پارٹیوں کے علاوہ جنسی عصبیتوں کی بنا پر بھی مختلف پارٹیاں بن گئی تھیں۔ گو اس قسم کی پارٹیاں ملک میں پہلے سے بھی موجود تھیں، مگر جیسا کہ قاعدہ ہے، قومی انحطاط کے زمانہ میں ہمیشہ

ایسے تعصبات ابھر آتے ہیں جن کا میلان جمع و تالیف کے بجائے تفریق و تقسیم کی طرف ہوتا ہے۔ وہی ایرانی، تورانی، ترک، مغل، افغان، اور ہندوستانی جو پہلے ایک شیرازے اور ایک نظام سلطنت میں منسلک ہوکر سارے ملک کی خدمت کرتے تھے، اب انمیں ایک دوسرے کے خلاف شدید تعصب پیدا ہوگیا، اور سب سے زیادہ خطرناک تعصب یعنی ملکی اور غیر ملکی کے تعصب نے انکے درمیان اتنی عداوتیں پیدا کر دیں کہ انکے لئے مل جل کر کام کرنا محال ہوگیا۔ پہلے انکی آپس کی رقابت کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ہر گروہ ملک اور سلطنت کی خدمت میں دوسرے سے زیادہ بڑھ جائے اور زیادہ مراتب و مناصب حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر اب ان رقابتوں نے یہ شکل اختیار کر لی کہ ہر گروہ کی قوتیں صرف اس ایک مقصد کے لئے وقف تھیں کہ دوسرے گروہ کو نیچا دکھائیں، اور اس کام میں ملک اور سلطنت کے مفاد کو عمداً قربان کر دینے میں بھی تامّل نہ کیا جاتا تھا۔ دربار شاہی سے لیکر ادنیٰ دفتروں تک یہ اختلافات ایک طوفان کی طرح پھیل گئے تھے، اور ہر شخص اپنے سرکاری فرائض کو چھوڑ کر اس دھڑے بندی اور اختلافی سیاست سے دلچسپی لینے لگا تھا۔ نظام الملک ایک طرف ان حالات کو دیکھ کر اور دوسری طرف بادشاہ کا رنگ دیکھ کر بالکل مایوس ہوگئے، اور انھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ جو سلطنت انتشار و پراگندگی اور زوال و انحطاط کے اس درجہ کو پہنچ چکی ہو اس کو دنیا کی کوئی قوت مٹنے سے نہیں بچا سکتی۔ اسے سنبھالنے کی کوشش کرنا اپنی محنتوں کو ضائع کرنا بلکہ قدرت سے جنگ کرنا ہے۔

نظام الملک پھر دکن میں اس فیصلہ پر پہنچنے کے بعد انکے لئے بجز اسکے کوئی چارہ باقی نہ رہا کہ وہ دکن واپس چلے جائیں اور اس صوبے کو، جو تیزی کے ساتھ مرہٹوں کے قبضہ میں جا رہا تھا، سنبھال کر بیٹھ جائیں۔ مگر یہ ارادہ ظاہر کرکے علی الاعلان دکن جانا مشکل تھا، اسلئے انھوں نے علالت مزاج اور ناموافقت آب و ہوا کا بہانہ کرکے ربیع الاول ۱۱۳۶ھ (دسمبر ۱۷۲۳ء) میں سنبھل (مراد آباد) کی طرف اپنی جاگیر پر جانیکی اجازت حاصل کرلی۔ اور اپنے بیٹے غازی الدین خاں کو نائب وزیر کی حیثیت سے دار السلطنت میں چھوڑ دیا۔ ابھی وہ جمنا پار کرکے شاہ درہ پر پہنچے تھے کہ راجہ گوجرمل دیوان خالصہ اور ایک با اثر خواجہ مونس نے بادشاہ کو ایسے باتدبیر شخص کی ناراضی کے نتائج سے آگاہ کیا، اور انکی طرف سے مطالبات کی ایک فہرست اسکے سامنے پیش کی جن کے منظور کرنے پر وہ پھر فرائض وزارت انجام دینا قبول کر سکتے تھے۔ ان مطالبات میں سب سے بڑا مطالبہ یہ تھا کہ محاصل کو اجارہ پر دینے کا طریقہ جو رتن چند بقال نے جاری کیا تھا، موقوف کر دیا جائے۔ مگر جسوقت گوجرمل یہ بیان پڑھ رہا تھا، وہ دفعتہً غش کھاکر گرا اور گھر پہنچتے پہنچتے مر گیا۔ نظام الملک نے یہ خبر سنی تو تصفیہ کی امید کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے۔ راستہ میں صمصام الدولہ خان دوراں، اعتماد الدولہ قمر الدین، اور روشن الدولہ ظفر خاں کے متعدد خطوط انکو ملے جنمیں لکھا تھا کہ اگر آپ کو کچھ ملال خاطر بہم پہنچا ہے تو بادشاہ آپ کو منانے کے لئے خود اپنی والدہ ماجدہ کو بھیجنے کے لئے طیار ہیں۔ لیکن نظام الملک ان پر فریب باتوں کے اصلی مقصد کو خوب

سمجھتے تھے، اسلئے انھوں نے اپنے سفر کو جاری رکھا۔ مراد آباد سے چکر کاٹتے ہوئے وہ آگرہ گئے، وہاں سے بادشاہ کو عرضی بھیجی کہ مرہٹوں کے غارت گردستے مالوہ اور گجرات کے صوبوں میں گھس آئے ہیں جن کا انتظام مجھ سے متعلق ہے، اسلئے میں مالوہ کی طرف جاتا ہوں۔ چنانچہ آگرہ سے اجین پہنچے، اور پھر اجین سے سیہور[1] جاکر سیدھا دکن کا راستہ لیا۔ سیہور پر پہلی مرتبہ انکے ہمراہیوں کو معلوم ہوا کہ منزل مقصود مالوہ نہیں بلکہ دکن ہے۔

مبارز خاں کو نظام کے مقابلہ پر اکسایا جاتا ہے

نظام الملک کے مخالفین کو اسی وقت سمجھ گئے تھے جب وہ دھلی سے روانہ بھی نہ ہوئے تھے۔ انھوں نے اس چال کا بہترین جواب یہ سوچا کہ انہیں دکن کی صوبہ داری سے معزول کرکے کسی دوسرے طاقتور شخص کو خفیہ طور پر صوبہ دار بنادیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ اس کے بعد نظام الملک کے لیئے دو صورتیں باقی رہ جائینگی۔ یا تو وہ دکن جاکر نئے صوبہ دار سے لڑینگے اور اس صورت میں یقیناً انہیں شکست ہوگی، کیونکہ دکن کا سردار اپنے صوبہ دار کے مقابلہ میں معزول شدہ صوبہ دار کا ساتھ دیگا۔ یا پھر وہ دارالسلطنت واپس ہو جائینگے اور ایک بے زور بے ٹھکانہ شخص کی طرح انہیں گمنامی میں زندگی بسر کرنی پڑیگی۔ اب ایک ایسے شخص کی ضرورت پیش آئی جسے اس بہترین چال کو عملی جامہ پہنانے کے لیئے دکن کا صوبہ دار بنایا جائے۔ دربار میں عنایت اللہ خاں کشمیری

---

[1] ریاست بھوپال کے علاقہ میں۔

موجود تھا جو خان ساماں کا عہدہ رکھتا تھا اور نظام الملک کی آمد سے قبل نائب وزیر رہ چکا تھا۔ اس نے اپنے داماد مبارز خاں عماد الملک کا نام پیش کیا جو ۱۲ سال سے حیدر آباد کا صوبہ دار تھا، اور مغلوں میں ایک نامور سپہ سالار سمجھا جاتا تھا۔ صمصام الدولہ کی ہندوستانی پارٹی نے اس نام کو دو وجوہ سے پسند کیا۔ ایک یہ کہ مبارز خاں کی جلادت و بہادری سے ان کو امید تھی کہ وہ نظام الملک کو تباہ کر دینے میں کامیاب ہو جائیگا۔ دوسرے یہ کہ وہ بھی مغل تھا، اور مغل سے مغل کو لڑانا اور ایک کے ہاتھوں دوسرے کا خاتمہ کر دینا ہندوستانی پارٹی کے لئے ایک نہایت مبارک فعل تھا۔ اس بنا پر بادشاہ سے مبارز خاں کے نام صوبہ داری کا فرمان حاصل کر کے خفیہ طریقہ سے حیدر آباد بھیج دیا گیا۔ اس کے علاوہ بہادر خاں[1] پنّی فوجدار کرنول۔ عبدالنبی خاں فوجدار کڑپہ، عبدالغفار خاں فوجدار ساوانور، سعادت اللہ خاں فوجدار کرناٹک، راجہ چندرسین اراؤ رنبھا، راجہ ساہو، عضد الدولہ عوض خاں، اور امین خاں دکنی کو بھی بصیغۂ راز احکام بھیجے گئے کہ وہ نظام الملک کے مقابلہ میں مبارز خاں کا ساتھ دیں۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد نظام الملک کے بیٹے غازی الدین خاں کو نیابت وزارت سے الگ کر دیا گیا، تاکہ اندرونی کارروائیوں کا انہیں کوئی علم نہ ہونے پائے۔

یہ مبارز خاں اصلاً بلخ کا باشندہ تھا۔ چھوٹی سی عمر میں ہندوستان

---

[1] اصلی نام ابراہیم خاں پنّی تھا، اور یہ اس داؤد خاں پنّی کا بھائی تھا جو ذوالفقار خاں کے ماتحت شش صوبہ دکن کا نائب صوبہ دار رہ چکا تھا۔

آیا اور ابتداءً ادنیٰ درجہ کی خدمتوں پر مقرر ہوتا رہا۔ پھر عنایت اللہ خاں کشمیری کی لڑکی سے شادی ہوتے ہی اسکی قسمت نے یکایک پلٹا کھایا، اور اپنے خسر کے توسل سے اس کو اعلیٰ مناصب ملنے شروع ہو گئے۔ عالمگیر کے آخر عہد میں اسے امانت خاں کا خطاب اور سنگمنیر کی فوجداری کا عہدہ ملا، اور بعد میں بیضا پور کی فوجداری بھی اسکے ساتھ ضمیمہ ہو گئی۔ بہادر شاہ کا وزیر اعظم منعم خاں اسکی اعلیٰ قابلیت کا بہت معترف تھا۔ اس نے غازی الدین خاں فیروز جنگ کی وفات کے بعد اسے گجرات کا صوبہ دار مقرر کیا۔ جہاندار شاہ کے عہد میں اسے مالوہ کی صوبہ داری پر منتقل کیا گیا اور شہامت خاں کا خطاب عطا ہوا فرخ سیر کے آغاز حکومت میں اسے مبارز خاں کا خطاب دیکر مالوہ سے گجرات اور پھر گجرات سے حیدر آباد کی صوبہ داری پر بھیجا گیا، اور ۱۲ سال تک بڑے دبدبہ اور شان و شوکت کے ساتھ اس خدمت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ ہمعصر مورخین اسکی جرأت، حسن انتظام، عدل و انصاف، اور ہیبت و صولت کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور ان کا بیان ہے کہ اس نے صوبہ حیدر آباد کا انتظام پورے ضبط کے ساتھ کیا تھا، تمام صوبہ میں اس کے احکام کی اطاعت کی جاتی تھی، شریروں کو اسکے سامنے سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوتی تھی، اور مرہٹے اسکے علاقہ سے چوتھ اور سردیسمکھی وصول نہیں کر سکتے تھے۔ اسکی ظاہری وجاہت، بارعب شخصیت اور اعلیٰ قابلیت کا ہر شخص پر بہت اچھا اثر پڑتا تھا۔ حسین علی خاں نے اپنی صوبہ داری کے زمانہ میں تمام پرانے عہدہ داروں کو الگ کر کے اپنے آدمی مقرر کئے، مگر اسے صوبہ حیدر آباد پر بدستور رہنے دیا۔ پھر جب

نظام الملک عالم علی خاں کو شکست دیکر اورنگ آباد پہنچے تو یہ انسے ملنے آیا اور انھوں نے اسے ہفت ہزاری منصب اور عماد الملک ہزبر جنگ کا خطاب دلوایا۔ لیکن اسکے بعد جب نظام الملک کرناٹک کے افغان فوجداروں (یعنی کڑپہ کرنول اور ساوانور وغیرہ کے فوجداروں) کو مطیع کرنے اور انسے پیش کش وصول کرنے کے لئے ادونی کی طرف گئے تو مبارز خاں نے انکو پیش کش کی تحصیل میں کوئی مدد نہیں دی اور یہ معلوم ہوا کہ اس نے اور افغان فوجداروں نے ملی بھگت کر رکھی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس نے سیکاکول کے علاقہ میں بعض معاملات خالصہ کو اپنی ذاتی جاگیر بنالیا ہے۔ بظاہر اس پر نظام الملک نے کسی ناراضی کا اظہار نہیں کیا، مگر دل میں انھوں نے سمجھ لیا کہ صوبہ دار لاکھ قابل سہی، تاہم ایک شخص کو ایک صوبہ میں طویل مدت تک رکھنے کی پالیسی درست نہیں ہے۔ چنانچہ جب وزیر اعظم ہو کر دھلی گئے تو انھوں نے مبارز خاں کے وکیل سے ان معاملات خالصہ کی آمدنی کا مطالبہ کیا جو ذاتی جاگیر میں شامل کر لی گئی تھیں، اور اسکے بعد بادشاہ کو مشورہ دیا کہ مبارز خاں کو حیدرآباد سے کابل کے صوبہ پر منتقل کر دے۔ جیسا کہ ہم اوپر بہ تفصیل بیان کر چکے ہیں، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سلطنت کے مصالح لوگوں کی نگاہوں میں کوئی چیز نہیں رہے تھے، اور ہر معاملہ میں صرف شخصی اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ مبارز خاں کے خسر عنایت اللہ خاں کشمیری نے نظام الملک کی اس تجویز کو ذاتی عناد پر محمول کیا، اور ان کے علی الرغم ہندوستانی پارٹی کی سازش سے مبارز خاں کے لئے پورے دکن کی صوبہ داری کا فرمان حاصل کر لیا۔

بعض لوگوں کا بیان ہے کہ نظام الملک کو دہلی ہی میں مبارز خاں کے صوبہ دار حیدر آباد بنائے جانے کا حال معلوم ہو گیا تھا، اور یہی ان کے دکن جانے کا باعث ہوا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا علم انہیں راستہ میں ہوا۔ لیکن دونوں صورتوں میں یہ امر متحقق ہے کہ مبارز خاں کے تقرر کا معاملہ بالکل پوشیدہ رکھا گیا تھا، اور نظام الملک کو سرکاری طور پر اس امر کی کوئی اطلاع نہیں دی گئی تھی کہ وہ صوبہ دکن سے معزول کر دئے گئے ہیں۔ بالفاظ دیگر اسوقت دکن کے دو صوبہ دار تھے۔ ایک خفیہ اور ایک علانیہ۔ دونوں اپنے آپ کو صوبہ کا جائز حاکم سمجھتے تھے، اور دونوں کو ایک ایک قانونی بنیاد پر یہ حق حاصل تھا کہ اپنے حریف سے لڑ کر اسکو صوبہ داری سے بے دخل کر دے، اسلئے دونوں میں سے ایک کو بھی بادشاہ کی نافرمانی کا الزام نہیں دیا جا سکتا۔ یہ اس دورخی سیاست کے نتائج تھے کہ سلطنت کے دو نہایت قابل اور نامور ارکان، حدود سلطنت کے اندر لڑ رہے تھے، اور دونوں کو خود وہی سلطنت لڑا رہی تھی جس کے دونوں تابع فرمان تھے۔

نظام الملک پھر صوبہ دار دکن بنائے جاتے ہیں۔

مبارز خاں کو شاہی فرمان اسوقت پہنچا جب وہ مچھلی بندر کے قریب چھوچھری پر ایک زمیندار (آپاراؤ) سے لڑ رہا تھا۔ دانشمندی کا اقتضا تھا کہ وہ بڑی مہم کی خاطر اس مہم کو کسی مناسب وقت کے لئے ملتوی کر کے فوراً اورنگ آباد پہنچ جاتا۔ اورنگ آباد اسوقت خالی تھا۔ اور نظام الملک کے نائب عوض خاں کے پاس اسوقت دو ہزار سے زیادہ فوج نہیں تھی۔ لیکن مبارز خاں نے آپاراؤ کی جنگ میں کئی مہینہ ضائع کر دیئے۔ پھر وہ حیدر آباد اسوقت

واپس ہوا جب بارش کا موسم شروع ہو چکا تھا اور بہت سے علاقوں کے فوجدار اپنی فوجیں لے کر حسب معمول جا چکے تھے۔ اس حالت میں اسے توقف کرنا چاہئے تھا۔ مگر اب اس نے جلد بازی سے کام لیا اور عین بارش کے زمانہ میں حیدر آباد سے اورنگ آباد کی طرف روانہ ہو گیا۔ بہادر خاں پنی فوجدار کرنول۔ ابوالفتح خاں (عبدالنبی خاں فوجدار کڑپہ کا بیٹا) عبدالمجید خاں میانہ (عبدالغفار خاں فوجدار ساوانور کا بیٹا) غالب خان (ابو طالب بدخشی کا بیٹا اور سعادت اللہ خاں فوجدار ارکاٹ کا نائب) اور دلاور خاں فوجدار رائچور اس کے ساتھ تھے، اور مجموعی طور پر اسکی فوج کی تعداد ۱۵ ہزار سوار اور ۳۰ - ۴۰ ہزار پیادہ سپاہ پر مشتمل تھی۔ لیکن ابھی وہ ناندیڑ کے قریب گوداوری کو عبور کر کے باسم کے علاقہ میں داخل ہوا تھا کہ نظام الملک رمضان ۱۱۳۶ھ میں اورنگ آباد پہنچ گئے، اور اس واقعہ نے سیاست کا نقشہ ہی دگرگوں کر دیا۔ دکن میں نظام الملک کو جو اثر حاصل تھا اسکو دیکھتے ہوئے محمد شاہ کو یہ امید نہیں تھی کہ انکے اورنگ آباد پہنچ جانے اور پھر وہاں انہیں طیاری کے لئے کافی مہلت بھی مل جانے کے بعد مبارز خاں انکے مقابلہ میں کامیاب ہو سکے گا۔ اسلئے اس نے اپنی بازی ہرتی ہوئی دیکھ کر چال بدل دی۔ اس نے نظام الملک کو لکھا کہ "دکن کے صوبے ہم نے اس بنا پر مبارز خاں کے سپرد کر دیئے تھے کہ تم کو ان کی ویرانی اور قلت محاصل کی شکایت تھی۔ ورنہ اگر ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ تمہیں دکن میں رہنے کی اسقدر خواہش ہے تو ہم کسی دوسرے کو اس پر نامزد نہ کرتے۔ اسیطرح

غازی الدین خاں فیروز جنگ کے نیابت وزارت سے ہٹنے کی وجہ بھی یہ ہوئی کہ تمھارے اورنگ آباد جانے کی وجہ سے وہ پریشان ہو گئے اور انھوں نے اپنے عہدہ کا کام چھوڑ دیا، اسلئے اعتماد الدولہ قمر الدین خاں کو نائب وزیر مقرر کر دیا گیا۔ خدانخواستہ اس کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ تم اپنے عہدوں سے معزول یا شاہی لطف و عنایت سے محروم کر دیے گئے ہو۔ وزارت اور صوبہ داری دونوں پر تم بحال ہو، جب تک چاہو اپنے صوبہ میں ٹھیرو اور جب چاہو حضور میں آجاؤ۔

مبارز خاں کو پٹنہ کی صوبہ داری پر مقرر کر دیا گیا ہے۔ اسکو وہاں بلا مزاحمت چلا جانے دو"۔ دوسری طرف مبارز خاں کو لکھا گیا کہ "دکن کا صوبہ تم کو اس بنا پر دیا گیا تھا کہ تم نے اپنے افغان حامیوں کی مدد سے اسکو سنبھال لینے کا اقرار کیا تھا۔ تم کو احکام اسوقت بھیج دیے گئے تھے جب عوض خاں دیوگڑھ میں اور نظام الملک مرادآباد میں تھے، اور دکن کا دار الحکومت اورنگ آباد خالی پڑا ہوا تھا۔ مگر تم نے ایک چھوٹے سے زمیندار کے مقابلہ میں اتنا وقت ضائع کر دیا کہ نظام الملک اور عوض خاں دونوں اورنگ آباد پر مل گئے۔ اب تم نے دوسری غلطی یہ کی کہ اورنگ آباد سے ۶۰ کوس کے فاصلہ پر پڑے ہوئے ہو اور بارش کا عذر کر رہے ہو۔ تمھارے حامی بہادر خاں وغیرہ بھی نہیں آئے۔ ایسی حالت میں نظام الملک کو صوبہ داری پر بحال کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے۔ تم کو اسکے بدلے پٹنہ کی صوبہ داری دی جاتی ہے۔ برہانپور یا سیکاکول میں سے جس راستے سے چاہو وہاں چلے جاؤ۔ نظام الملک کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ تم سے تعرض نہ کریں"۔ لیکن یہ

دونوں فرمان اسوقت پہنچے جب دونوں حریف صوبہ دار اپنا قضیہ قاضی شمشیر کے حوالہ کر چکے تھے۔

مبارز خاں کی شکست نظام الملک نے جسطرح اس سے پہلے عالم علی خاں اور دلاور علی خاں کو جنگ سے قبل صلح کی دعوت دی تھی، اسی طرح مبارز خاں کو بھی مصالحت اور دوستی کے انداز میں مسلمانوں کی باہمی جنگ کے وبال سے ڈرایا، قدیم روابط محبت اور ہم وطن کے تعلقات یاد دلائے، دربار میں بادشاہ اور اسکے مشیر و صلاح کار جو طفلانہ حرکات کر رہے تھے انکی کیفیت لکھ کر سمجھایا کہ ہم کو ان سازشوں کا آلہ کار نہیں بننا چاہئے، اور یہ بھی لکھا کہ میں صرف اسوقت تک یہاں ہوں جبتک میری اس صوبہ سے علیحدگی اور کسی دوسرے صوبہ تقرر کا فرمان نہیں آتا۔ جب باقاعدہ فرمان آجائیگا، میں چلا جاؤنگا۔ اتنی دیر تم توقف کرو۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مبارز خاں اس مصالحانہ پیغام کو قبول کرنے کے لئے طیار تھا۔ مگر اس کے پٹھان حلیفوں نے اسے وطنی عصبیت کا طعنہ دیا اور اس سے کہا کہ تم اپنے بادشاہ کے فرمان کو پس پشت ڈال کر اپنے مغل بھائی کی جانبداری کر رہے ہو۔ اس پر مجبوراً اس نے نظام الملک کے پیغام صلح کو رد کر دیا اور ان کے مقابلہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ ادھر نظام الملک اورنگ آباد سے ۶ ہزار سوار لیکر چلے۔ راستہ میں جب دونوں فوجوں کے درمیان ۱۲ کوس کا فاصلہ رہ گیا، تو مبارز خاں نے چاہا کہ کاوا کاٹ کر نظام الملک کی بے خبری میں سیدھا اورنگ آباد پہنچ جائے، کیونکہ اس کو معلوم ہوا تھا کہ اورنگ آباد کی محافظت کا کوئی انتظام

نہیں ہے اور اسے یہ بھی امید دلائی گئی تھی کہ دولت آباد کا قلعہ دار قلعہ اسکے سپرد کردیگا۔ اس خیال کے مطابق مبارز خاں نے اپنا کیمپ پورنا کے قریب چھوڑ دیا اور دوسرے راستہ سے تیزی کے ساتھ اورنگ آباد کی طرف چلا۔ مگر اسکی اس چال سے اسکے اہل فوج واقف نہ تھے۔ انھوں نے یہ خیال کیا کہ وہ نظام الملک کے مقابلہ سے جی چراتا ہے، اور اس سے انکی ہمتیں پست ہوگئیں۔ دوسری طرف نظام الملک کی فوج کو اسکا علم ہوا تو جو لوگ اپنی قلت تعداد سے خوف زدہ ہو رہے تھے، ان کے دل بڑھ گئے اور انھوں نے سمجھ لیا کہ مبارز خاں ان سے ڈر گیا ہے۔ چنانچہ اسی وقت لوگوں نے نظام الملک کو مبارکباد کی نذریں پیش کیں، اور ایک شاعر نے اس واقعہ کی تاریخ نکالی "ڈر گیا مبارز خاں"۔

مبارز خاں کی چال کو بھی نظام الملک بروقت سمجھ گئے اور انھوں نے اپنی فوج کے مرہٹے دستوں کو اسکے پیچھے لگا دیا، جنھوں نے اسکی فوج پر پیہم چھاپے مار مار کر اسکو اتنا دق کیا کہ وہ جس تیز رفتاری کے ساتھ اورنگ آباد جانا چاہتا تھا، اسمیں کامیاب نہ ہو سکا۔ اسطرح اپنے حریف کی یلغار کو روک کر نظام الملک اپنے توپخانہ سمیت اسکے تعاقب میں چلے اور شکر کھیڑہ[1] کے مقام پر اسکو جا لیا۔ ۲۳ محرم ۱۱۳۷ھ (۱۱ اکتوبر ۱۷۲۴ء) کو جنگ ہوئی جس میں مبارز خاں اور

---

[1] اورنگ آباد سے ۸۰ میل پر برار کے ضلع پڈدانہ میں واقع ہے۔ بعد میں اس کا نام فتح کھیڑہ رکھدیا گیا۔

اسکے ساتھ بہادر خاں پنی، غالب خاں، ابوالفتح خاں میانہ وغیرہ تیس چالیس بڑے بڑے سردار مارے گئے، اسکی فوج کے ساڑھے تین ہزار آدمی کام آئے اور مبارز خاں کے دو بیٹے خواجہ محمود خاں اور حامد اللہ خاں گرفتار ہوئے۔ ان نقصانات کے مقابلہ میں نظام الملک نے صرف تین سردار اور نسبتہً بہت کم سپاہی کھو کر فیصلہ کن فتح حاصل کر لی۔ یہ فتح بھی اس کا نتیجہ تھی کہ نظام الملک نے اپنے توپخانہ کو بہترین تدبیر سے استعمال کیا۔ اس کے بعد ربیع الثانی ۱۱۳۷ھ (جنوری ۱۷۲۵ء) میں وہ حیدرآباد پہنچے مبارز خاں کے بیٹے جلال الدین محمود خاں نے شہر انکے سپرد کر دیا۔ اب صرف ایک قلعہ گولکنڈہ باقی رہ گیا تھا جہاں مبارز خاں کا بیٹا خواجہ احمد خاں ایک سال تک مدافعت کرتا رہا۔ آخر کار ۱۱۳۸ھ ۱۷۲۶ء میں اس نے بھی اطاعت قبول کر لی۔ اسطرح صوبہ حیدرآباد کلیتہً انکے قبضہ میں آگیا اس موقع پر نظام الملک نے مبارز خاں کے خاندان سے جس مہربانی اور فیاضی کا برتاؤ کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کس قدر فراخ حوصلہ شخص تھے اور کس طرح دشمنوں کو دوست بنا لیتے تھے انھوں نے خواجہ احمد خاں کو شش ہزاری منصب اور شہامت خاں کا خطاب دیا۔ خواجہ محمود خاں کو پنج ہزاری منصب اور مبارز خاں کا خطاب عطا کیا۔ اور حامد اللہ خاں کو دو ہزاری منصب دیکر اس سے اپنی بہن کی شادی کر دی۔ صلابت جنگ کے زمانہ میں خواجہ محمود خاں کو مبارز الملک غالب جنگ کا خطاب اور نظامت حیدرآباد کا عہدہ دیا گیا۔ اور اسکی وفات کے

بعد حامد اللہ خاں کو مبارز الملک کا خطاب اور دیوان سرکار کا عہدہ عطا ہوا۔

بادشاہ کے نام نظام الملک کی عرضی

فتح سے فارغ ہو کر نظام الملک نے بادشاہ کو ایک طویل عرضی بھیجی جسمیں انھوں نے اپنے طرز عمل کی صفائی پیش کی۔ انھوں نے تیمور کے زمانہ سے محمد شاہ کے عہد تک مغل فوج اور مغل امرا کی وفاداری کا ذکر کرتے ہوئے اپنے خاندان کی اور خود اپنی خدمات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا، جنکی تازہ مثال گجرات میں حیدر قلی خاں اور مالوہ میں دوست محمد خاں کی سرکشی کا فرو کرنا تھا۔ پھر بتایا کہ میں نے اپنے ذاتی اقتدار کے لئے کبھی حرص و طمع سے کام نہیں لیا ورنہ محمد امین خاں میرے مقابلہ میں وزیر نہ ہوتے اور نہ میں بار بار شاہی طلب پر دہلی حاضر ہوتا۔ اسکے بعد انھوں نے اپنی ان کوششوں کا ذکر کیا جو وزارت کے زمانہ میں سلطنت انتظام کو درست کرنے کے لئے انھوں نے کی تھیں، اور ان اندرونی سازشوں، ریشہ دوانیوں اور پر فریب چالوں کی شکایت کی جن سے بادشاہ کے ہمدم و ہمراز لوگوں نے انکو ناکام کرنے کی کوشش کی۔ آگے چل کر انھوں نے بیان کیا کہ کسطرح خفیہ طور پر مبارز خان کو انکے مقابلہ میں ابھارا گیا، اور وہ اصل خطوط اور مراسلات جو مبارز خاں کے نام بھیجے گئے تھے، پیش کر کے سوال کیا کہ کیا میں اپنی اور اپنے خاندان کی سابق خدمات پر اسی صلہ کا مستحق تھا؟ پھر بیجاپور اور حیدر آباد کی تاریخ سے مثالیں پیش کر کے انھوں نے محمد شاہ کو بتایا

١۔ قتل کے وقت مبارز خاں کی عمر ٦٠ سال سے زیادہ تھی۔ اور وہ نظام الملک سے چند سال بڑا تھا۔

کہ ایک فرمانروا کے لئے سب سے بڑی مصیبت اسکے برے مشیر ہوتے ہیں، ایسے مشیروں کی بدولت عادل شاہ اور قطب شاہ کی سلطنتیں تباہ ہوئیں، اور انہی کی بدولت ایران پر افغانوں کا تسلط ہوا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے محمد شاہ کو نصیحت کی کہ وہ اپنی عادات و خصائل کی اصلاح کرے، اور اسے ان فرائض کی طرف توجہ دلائی جو ایک بادشاہ کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ آخر میں مبارز خاں کے ساتھ اپنی جنگ کا تذکرہ کیا، اور اپنی فتح یابی کی مفصل کیفیت بیان کی۔

نظام الملک کا مالوہ اور گجرات سے معزول اور دکن پر بحال ہونا ۔ محمد شاہ نے بظاہر اس خط کا تو کوئی اثر نہیں لیا۔ لیکن امرائے دربار کی ایک متفقہ عرض داشت کی بنا پر نظام الملک کی عفو تقصیر کر کے انہیں شش صوبہ دکن کی صوبہ داری پر مستقل کر دیا، انکی جاگیریں جو وزارت سے قبل انکو حاصل تھیں، بحال کیں، اور انہیں آصفجاہ کا خطاب اور منصب نہ ہزاری ذات و سوار عطا کیا۔ اسکے ساتھ ہی اس نے وزارت پر اعتماد الدولہ قمر الدین خاں کو مستقل کیا۔ مالوہ کی صوبہ داری سے آصفجاہ کو معزول کر کے گردھر بہادر ناگر کو مقرر کیا، اور گجرات کی صوبہ داری بھی انسے لیکر سربلند خاں کو عطا کی۔

دولت آصفیہ کی خود مختاری اس زمانہ سے دکن میں دولت آصفیہ کی حکومت خود مختاری شروع ہوتی ہے۔ گو نواب آصفجاہ نے قدیم خاندانی ملازمت کا لحاظ کرتے ہوئے بادشاہ کی اطاعت سے انحراف نہیں کیا۔ جہاں تک شاہی اقتدار کی ظاہری صورتوں کا تعلق

ہے، ان کے اختیار کرنے سے پرہیز کرتے رہے، بادشاہ کا لقب اختیار نہیں کیا، تخت پر نہیں بیٹھے، شاہی چتر نہیں لگایا، سکہ اور خطبہ اپنے نام کا جاری نہیں کیا، اور حد یہ ہے کہ اس واقعہ کے چند سال بعد بادشاہ کی طلب پر دھلی جانے اور جنگی و سیاسی خدمات انجام دینے میں بھی تامل نہیں کیا۔ لیکن شش صوبہ دکن میں حکومت و سیاست کی تمام عملی اغراض کے لئے اب وہ شاہی اقتدار سے بالکل آزاد ہو گئے۔ چھوٹے سے لیکر بڑے تک تمام عہدوں کا عزل و نصب، خطابات، مناصب، اور جاگیروں کی بخشش، جنگ و صلح اور معاہدات، باجگذار ریاستوں سے خراج کی تحصیل، ہمسایہ طاقتوں سے سیاسی معاملات اور دوسرے تمام امور بالاستقلال انھوں نے اپنے ہاتھ میں لے لئے اور انہیں اسی طرح انجام دیا جسطرح ایک خود مختار فرمانروا انجام دیتا ہے۔ ان کے بعد ان کے جانشینوں نے بھی ایک صدی سے زیادہ مدت تک شاہی حکومت کا احترام اسیطرح برقرار رکھا، جب تک تیموری نسل کا بادشاہ دھلی کے تخت پر موجود رہا اسوقت تک دکن میں اس کا سکہ و خطبہ جاری رہا، مسند نشینی کے لئے اس سے فرمان حاصل کئے جاتے رہے (گو یہ فرمان محض رسمی تھے، اور مسند نشینی کا انحصار ان فرامین پر نہ تھا)، اس کے فرامین کا استقبال اسی احترام کے ساتھ کیا جاتا رہا جسطرح قدیم زمانہ میں کیا جاتا تھا، لیکن ان ظاہری رسوم کے سوا، دولت آصفیہ پر دھلی کے بادشاہ کو کسی قسم کا عملی اقتدار باقی نہیں رہا

۸- انقراض سلطنت اور دکن کی علیحدگی کے اسباب

یہ واقعہ جن اسباب و وجوہ کا نتیجہ تھا ان کا ایک اجمالی تصور گذشتہ مباحث کے مطالعہ سے ناظرین کے ذہن میں قائم ہو گیا ہوگا۔ لیکن ایک مکمل اور صحیح تصور قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بیان کردہ واقعات کی روشنی میں ملک اور سلطنت کی سیاسی حالت، اسباب انحطاط، اور ان اسباب کے پیدا کردہ نتائج پر ایک مجموعی نظر ڈالی جائے۔

عالمگیر کی سیرت، اسکے طرز حکمرانی، اور اسکی سیاسی حکمت عملی پر بہت کچھ نکتہ چینی کی گئی ہے اور تاریخی ناقدین کے ایک بڑے گروہ نے اسکو زوال سلطنت کا باعث قرار دینے میں تامل نہیں کیا ہے۔ لیکن اس کے متعلق موافق یا مخالف کسی قسم کی رائے ظاہر کرنے سے پہلے ایک صحیح الفکر مبصر کو تحقیق کرنا چاہئے کہ عالمگیر کے عہد میں ملک اور اہل ملک کی حالت کیا تھی، اخلاقی، ذہنی، مادی، اور علمی و عملی حیثیت سے انکی اجتماعی اور انفرادی قوت و قابلیت کا کیا معیار تھا؟ اور اسکا لحاظ کرتے ہوئے وہ شخص جس کے ہاتھ میں انکی سیاست و قیادت کی باگیں تھیں کہاں تک انکے زوال کا ذمہ دار یا اسکے برعکس ان کے کچھ زیادہ مدت تک بقا کا موجب تھا؟ اس نقطۂ نظر سے جب کبھی اُس عہد کے حالات کا تفحص کیا جائیگا، تو یہ حقیقت سامنے آجائیگی کہ گیارہویں صدی ہجری (سترھویں صدی عیسوی) کا زمانہ ہندوستان میں ایک ایسا زمانہ تھا جسمیں اس ملک کے باشندے نصف النہار پر پہنچ کر زوال کی طرف سرعت کے ساتھ مائل ہو چکے تھے۔ امن و امان،

دولت مندی، خوشحالی، لوازمِ تمدن کی فراوانی، اسباب عیش کی افراط، اور اندرونی و بیرونی خطرات سے بے خوفی شاہجہاں کے عہد میں اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور اس نے انکے قوائے فکر و عمل کو سرد کرنا اور انکی اخلاقی و معنوی حالت کو بگاڑنا شروع کر دیا تھا۔ وہ انسانی قوتیں جو صرف جد و جہد کشمکش، مزاحمت، اور مقابلہ سے ابھرتی ہیں، خوش باشی، بے خوفی اور مرفہ الحالی کی بدولت معطل ہونے لگی تھیں، اور ان کی جگہ لوگوں میں وہ جذبات و داعیات ترقی کرنے لگے تھے جنکے اثر سے وہ اپنی معاشرت اور اپنے تمدن میں تکلف و تصنع، آرام و آسائش، زینت و آرائش، شان و شوکت، پاکیزگی و لطافت، اور حسن و نزاکت کے دلدادہ ہوتے جاتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ملک میں شاندار لباس، عالیشان عمارات، نفیس سواریاں، پاکیزہ ساز و سامان، اور دوسرے تمام لوازم تمدن بڑھ رہے تھے، مگر بہادر سپاہی، لائق سپہ سالار، بیدار مغز مدبر، قابل منتظم، اچھے کارفرما، اور ماہر کارپرداز گھٹتے چلے جارہے تھے۔ ایک طرف قدیم امرا کے خاندان جنھوں نے اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانہ میں بڑے بڑے قابل جوہر پیدا کئے تھے، ایسے بانجھ ہوگئے کہ انھیں پھر وہ جوہر پیدا نہ ہوئے۔ دوسری طرف ملک کی عام زندگی بھی تمدن و تہذیب کی ترقی سے اتنی مسموم ہوگئی کہ امرا و وزرا کے طبقہ میں اہل ملک سے نئے آدمیوں کی بھرتی روز بروز کم ہوتی چلی گئی۔ یہ قحط الرجال ہندوستان میں اسقدر نمایاں ہوگیا تھا کہ عالمگیر اکثر اسکی شکایت کرتا تھا، چنانچہ ایک جگہ اپنے رقعات میں لکھا ہے کہ "ازنایابی

مردم کار آہ! آہ!"

سلطنت مغلیہ کو ہندوستان کے علاوہ ایران و توران سے بھی قابل آدمیوں کی رسد پہنچتی تھی، جو تازہ خون، شاداب دماغ اور مستعد ہاتھ پاؤں لیکر آتے، اور یہاں کی رزم و بزم میں ایک نئی جان ڈال دیتے تھے۔ مگر انحطاط کی جو وبا ہندوستان میں چلی تھی وہی اس زمانہ میں ایران، توران، خراسان، عراق روم و شام سب پر پھیلی ہوئی تھی۔ سنہ ۱۰۳۶ھ ۱۶۲۷ء میں شاہ عباس صفوی کے انتقال کے بعد سے ایران میں بھی انحطاط شروع ہوگیا تھا جو صدی کے خاتمہ تک انتہا کو پہنچ گیا۔ جس سال ہندوستان میں عالمگیر کا انتقال ہوا اسکے دوسرے سال سلطنت ایران میں افغانوں کی شورش شروع ہوئی، اور جب ہندوستان میں محمد شاہ تخت پر بیٹھا اسکے تین سال بعد ایران میں صفوی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ مگر افغان قوم بھی حکمرانی کی صلاحیت سے محروم ہو چکی تھی۔ وہ تین سال سے زیادہ پوری سلطنت کے نظام کو نہ سنبھال سکی اور قریب قریب اُسی سال ایران کی نئی افغانی سلطنت کا خاتمہ ہوا جس سال نظام الملک نے سلطنت مغلیہ کی انتہائی بدنظمی سے مایوس ہوکر دکن کی راہ لی۔ ترکستان اور ماوراء النہر کی حالت ایران و افغانستان سے بھی بدتر تھی۔ وہاں وہ طوائف الملوکی شروع ہو چکی تھی جو گھن کی طرح ساری ترکی قوم کی قوت کو کھا گئی اور جسکی بدولت صدی ڈیڑھ صدی بعد زار روس کی سلطنت نے پورے ترکستان کو ہضم کر لیا۔

اسطرح ہندوستان میں کام کے آدمیوں کی پیداوار کم اور

بیرونی ہند سے انکی رسد کم تر ہو جانے کے سبب سے سلطنت مغلیہ میں اتنے بڑے ملک کے عظیم الشان نظام حکومت کو سنبھالنے اور قوت کے ساتھ چلانے کی صلاحیت کمزور ہو چکی تھی۔ لیکن اس کمزوری کے اثرات کو نمایاں اور غالب ہونے سے جس چیز نے روک رکھا تھا وہ عالمگیر جیسے زبردست حکمراں کی ذات تھی۔ اس کے سخت سے سخت مخالف بھی اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ وہ سادگی، جفاکشی، سپاہیانہ مستعدی، ان تھک محنت، امور مملکت کی شخصی نگرانی، حالات کو سمجھنے کی صلاحیت اور آدمیوں کو پرکھنے اور انسے کام لینے کی قابلیت میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا۔ اس نے اپنی گہری نگاہوں سے دیکھ لیا کہ اس کا ملک قحط الرجال میں مبتلا ہو چکا ہے، تمدن و تہذیب نے اہل ملک کو آرام طلب اور عیش پسند بنا دیا ہے، امن و امان نے انکی جنگی روح کو سرد کر دیا ہے، خوشحالی و فارغ البالی نے انکو سعی و کوشش سے مستغنی کر دیا ہے، اور انمیں کام کرنے کی قوتیں کم اور لطف اٹھانے کی قوتیں زیادہ ہو رہی ہیں۔ اس حالت میں اس نے ہندوستان کے اندر اور باہر سے جو بہترین آدمی مل سکتے تھے انکو چھانٹ چھانٹ کر فراہم کیا، ان کے جوہر اور انکی قابلیت کے مطابق انکی تربیت کی، انسے اعلیٰ ذمہ داری کے کام لئے، ہر شخص کو اس کام پر لگایا جس کا وہ اہل تھا۔ اور کسی کو اس منصب اور رتبے تک نہ بڑھنے دیا جس کے تحمل کی اسمیں صلاحیت نہ تھی۔ اسد خاں، ذوالفقار خاں، غازی الدین خاں فیروز جنگ، محمد امین خاں، چین قلیچ خاں، حمید الدین خاں، روح اللہ خاں بخشی، فتح اللہ خاں، عضد الدولہ

عوض خاں، تربیت خاں میر آتش، حسن علی خاں، شیخ نظام حیدر آبادی، عنایت اللہ خاں کشمیری، اور ایسے بہت سے آدمیوں کو جو اپنے عہد کے بہترین قائد مدبر اور منتظم تھے، اس نے خود اپنی تربیت سے بنایا، انسے کام لیا اور انھیں موزوں مقام پر رکھا۔ پھر اس نے اپنے پورے نظام حکومت کو جڑ سے لیکر چوٹی تک اپنی شدید نگرانی میں رکھا، صوبہ داروں اور سپہ سالاروں سے لیکر فوجداروں، دیوانوں اور متصدیوں تک حکومت کا کوئی عامل بادشاہ کی شخصی نگرانی سے آزاد نہ تھا، اور اس کے خوف سے اپنے کار مفوضہ میں غفلت نہ کر سکتا تھا۔ اسی طرح فوج اور امرائے فوج کو بھی اسنے مسلسل چالیس برس تک لڑائیوں میں مشغول رکھا، اور ان سے ایسی تھکا دینے والی محنت لی کہ عیش پسندی کا نشہ ہرن ہو گیا۔

مگر یہ سب کچھ شخص واحد کی کوشش، قابلیت اور رہنمائی کا نتیجہ تھا، اور اسی کے بل پر سلطنت ہند کا یہ عظیم الشان کارخانہ چل رہا تھا۔ ورنہ ارکان سلطنت میں یہ صلاحیت نہیں تھی کہ وہ خود اس بار کو سنبھال سکتے۔ عالمگیر نے جو مشین بنائی تھی، اور جن کل پرزوں سے اس کو ترکیب دیا تھا، ان کو چلانے اور ان سے کام لینے کے لئے اُسی جیسے ماہر فن انجینیر کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد جو لوگ اسکے جانشین ہوئے وہ اسکی سی مہارت و قابلیت نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے نہ مشین کی ترکیب کو سمجھا، نہ پرزوں کی صلاحیت کو۔ اسلئے وہ ایک دن بھی اس کارخانہ کو صحیح طریقہ سے نہ چلا سکے۔ گو اب بھی وہی کل پرزے موجود تھے جو عالمگیر کے زمانہ میں تھے، چند

مستثنیات کو چھوڑ کر بہادر شاہ کے زمانہ سے محمد شاہ کے زمانہ تک وہ لوگ برابر موجود رہے جنھوں نے عالمگیر کے ماتحت کام کیا تھا۔ لیکن خود فرمانروا اس قابلیت کے نہ تھے کہ وہ یہ سمجھ سکتے کہ کس پرزے سے کیا کام لینا چاہیئے، اور کون شخص کسقدر بار اٹھا سکتا ہے۔ نیز وہ اتنی قوت بھی نہ رکھتے تھے کہ اس زبردست مشین کو اپنے قابو میں رکھتے اور اس کے طاقتور پرزوں کو ایسی مضبوط گرفت میں جکڑے رہتے کہ کوئی پرزہ اپنی جگہ سے نہ ہل سکتا۔ انھوں نے کچھ پرزوں کو بدلا، کچھ کو بیکار کیا، کچھ کو ضائع کر دیا، کچھ پرزوں سے وہ کام لیا جو ان کے کرنے کا نہ تھا، اور اسطرح مشین کی ترکیب کو خراب کرنے کے بعد اس کو اپنے قابو میں رکھنے کے بجائے خود اپنے آپکو اس کے قابو میں دیدیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مشین بگڑی، کارخانہ ٹوٹا، پرزے منتشر ہوئے، اور پہیوں کی چند بیقاعدہ گردشوں نے خود کارخانہ داروں کو بھی پیس کر رکھ دیا۔ ذوالفقار خاں اور سادات بارہہ کے واقعات اسکی روشن مثالیں ہیں۔

عالمگیر کی وفات کے بعد لائق آدمیوں کی کمیابی سے بڑا فتنہ لائق فرمانرواؤں کا فقدان تھا۔ عالمگیر کے بیٹوں پوتوں اور پرپوتوں کی پوری فہرست پر نظر ڈال جاؤ۔ اسکو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے دفعتہً نسل تیموری سے فرمانروائی کی قابلیت سلب کر لی تھی۔ اعظم اور کام بخش کی بے تدبیری، بہادر شاہ کی بے خبری، جہاندار شاہ، فرخ سیر اور محمد شاہ کی انتہائی نااہلی، اور بہادر کے خاندان میں رفیع الشان اور نکوسیر جیسے زنانہ خصائل رکھنے وا

شاہزادوں کی پیدائش کو دیکھ کر بہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ایسے جانشین عالمگیر کو نہیں خود اکبر کو بھی میسر آتے تب بھی یہ پچاس سال کے اندر سلطنت کو ہاتھ سے کھو دیتے۔ ایک دو نا قابل بادشاہوں کے بعد کوئی ایک قابل بادشاہ تخت نشین ہو جاتا تو شاید سلطنت کو کچھ سنبھال لیتا۔ لیکن یہاں تو ایک نا قابل کے بعد دوسرا اس سے زیادہ نا قابل آتا رہا، اور عالمگیر کے بعد دہلی کے تخت کو ایک دن کے لیئے بھی کوئی اہل اور موزوں بادشاہ میسر نہ آیا۔ ان بادشاہوں میں خود معاملات کو سمجھ کر انکو قوت سے چلانے، اور اپنی شخصی طاقت سے اقتدار حاصل کر کے اسے برقرار رکھنے، اور اپنی ذاتی قوت فیصلہ سے کوئی راہ پیدا کر کے اپنے بل بوتے پر آگے بڑھنے کی قوت نہ تھی۔ ہر انتشار و اضطراب کے موقع پر جس طاقت ور اور حوصلہ مند شخص نے سب سے پہلے جھپٹ کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا، انھوں نے اپنے آپکو اور سلطنت کے کاروبار کو اسی کے قابو میں دیدیا، اور جب اسکے استبداد سے تنگ آگئے تو دوسرے خود غرض سازشی، اور چالباز لوگوں کے دام میں پھنس کر اس کے مقابلہ میں حصول اقتدار کے لیئے جدوجہد کرنے لگے۔ اس پیہم کشمکش سے ملک میں سازشوں، خفیہ ریشہ دوانیوں دورخی چالوں، اور دھڑے بندیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا، ملک اور سلطنت کے مفاد کو شخصی اغراض پر قربان کیا جانے لگا، امراء اور صوبہ دار، ایک دوسرے کے خلاف لڑائے گئے، سلطنت کے ذمہ دار عہدہ داروں کے مقابلہ میں مخالفوں اور دشمنوں تک کی ہمت افزائی کی گئی، قانون و آئین کا احترام اٹھ گیا، حکومت کا

انتظام درہم برہم ہوگیا، اطراف ملک میں عام ابتری و طوائف الملوکی پھیل گئی، اور وہ جبل متین جس نے سلطنت کے اجزاء کو ایک دوسرے کے ساتھ جکڑ رکھا تھا پارہ پارہ ہو کر رہ گئی۔ عالمگیر کی وفات سے محمد شاہ کی تخت نشینی تک ۱۳ سال کی مختصر مدت میں سات خونریز معرکے محض حصول سلطنت کے لئے پیش آئے جنھوں نے سلطنت کی بنیادیں ہلا ڈالیں۔ درباری سازشوں کی بدولت متعدد امراء اور صوبہ دار ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا ہوئے، اور وہ قوت جو سلطنت کی خدمت میں صرف ہونی چاہیے تھی اسطرح برباد ہوئی۔ خانہ جنگیوں کے بعد کامیاب فریق نے مخالف فریق کے حامیوں کو کچل ڈالا اور انمیں بہت سے قابل اور کارآمد آدمی تباہ ہوگئے۔ مختلف سیاسی پارٹیوں میں توازن قائم رکھنے والی کوئی قوت نہ تھی، اسلئے جو پارٹی برسر اقتدار آئی اس نے مقابل کی پارٹی کو برباد کرنے کی کوشش کی اور اس طریقہ سے بھی قوت کا ایک بڑا حصہ بیکار کر دیا گیا۔ مرکزی سلطنت کی کمزوری اور غلط پالیسی کی بدولت ملک کے مختلف حصوں میں سلطنت کے خلاف جنگجو قوموں نے خروج کیا۔ سکھ، جاٹ، مرہٹے، بندیلے، اور راٹھور طوفان کی طرح ہر طرف سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک جماعت نے سیاسی اغراض کے لئے ہندوؤں میں مغل سلطنت کے خلاف مذہبی جوش پیدا کیا اور یہ شورشیں بھی سلطنت کی تباہی کا ایک ذریعہ بن گئیں۔

حکومت کے اسطرح ابتری و بدنظمی کی حالت میں مبتلا ہو جانے سے مالگذاری اور خراج کی تحصیل میں کمی واقع ہونے لگی، تجارت اور

صنعت و حرفت کا بازار سرد پڑنے لگا جس سے جملہ اقسام کے محاصل پر برا اثر پڑا، اور روز بروز حکومت کے ذرائع آمدنی مسدود ہوتے چلے گئے۔ مگر اس کے باوجود جو تھوڑے بہت اموال خزانۂ سلطنت میں داخل ہوتے بھی تھے، انکو صحیح مصارف میں صرف کرنے کے بجائے ایسے غلط مصارف میں صرف کیا جاتا تھا جو بجائے مفید ہونے کے اُلٹے مضر ہوتے تھے۔ مصاحبوں، مسخروں، ڈوم ڈھاڑیوں، اور سامان عیش و نشاط پر پانی کی طرح روپیہ بہایا جاتا تھا، اور اہل فضل و کمال بھوکے مرتے تھے، فوج تنخواہوں کے لیئے ترستی تھی، اور جنگی ضرورت کے مواقع پر سامان جنگ کے لئے شاہی توشہ خانے کے برتن تک بیچنے کی نوبت آجاتی تھی۔

ان حالات میں ملک کے قابل لوگوں نے دیکھا کہ مرکزی سلطنت میں ترقی کا مدار قابلیت اور حسن خدمت پر نہیں ہے۔ شاہی اقتدار خواجہ سراؤں، خوشامدی مصاحبوں، اور سازشی درباریوں کے ہاتھ میں ہے۔ ان لوگوں کی موجودگی میں ملک اور سلطنت کی کوئی خدمت کرنا محال، اور اس خدمت کے صلہ پر ترقی حاصل کرنا غیر ممکن، بلکہ اپنی رہی سہی عزت و آبرو بچانی بھی مشکل ہے۔ لامحالہ انکو اپنی بھلائی اسی میں نظر آئی کہ مرکز سے الگ ہو کر جس علاقہ پر قابو پائیں اسمیں اپنی جداگانہ ریاست قائم کرلیں۔ جو لوگ اتنے طاقتور نہ تھے کہ خود کوئی ریاست قائم کرسکتے، انھوں نے کسی طاقتور امیر کا دامن تھام لیا، اور اسکی ملازمت میں داخل ہوگئے۔ رعایا بھی آئے دن کی طوائف الملوکی سے بیزار تھی۔ مرکزی سلطنت کے

ہر نئے انقلاب پر، ایک نیا صوبہ دار بھیجا جاتا تھا۔ وہ آئندہ کسی دوسرے انقلاب کے اندیشہ سے رعایا کو لوٹ کر جلدی سے جلدی اپنی جیبیں پر کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ جب کوئی دوسرا صوبہ دار آتا تو پہلا صوبہ دار اسکی مزاحمت کرتا اور رعایا اس پیچیدگی میں پھنس جاتی کہ کس کا ساتھ دے۔ ان مشکلات سے عاجز آکر صوبوں کے باشندے بھی اسکو ترجیح دیتے تھے کہ کوئی طاقتور شخص ان صوبہ میں اپنی مستقل ریاست قائم کرلے اور ایک باضابطہ اور پائیدار حکومت کے سایہ میں آکر وہ اس روز روز کی مصیبت سے نجات پائیں، انہی اسباب سے بنگال، اودھ، روھیلکھنڈ، مالوہ، گجرات، سندھ، اور دوسرے اقطاع میں چھوٹی بڑی ریاستیں قائم ہونی شروع ہوئیں۔

اسی سلسلہ کا واقعہ دکن میں نظام الملک کی مستقل ریاست کا قیام بھی ہے۔ نظام الملک اور ان کے خاندان نے دکن میں ستّر اسّی سال تک سلطنت کی اعلیٰ خدمات انجام دی تھیں۔ ان کے دادا، ان کے والد، ان کے چچا، انکے پھوپھا اور وہ خود اس خطۂ ملک میں سپہ سالاری، صوبہ داری اور فوجداری کی خدمات پر رہ چکے تھے۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کی فتح میں انکے دادا کا خون اور ان کے والد کا ہاتھ شامل تھا۔ دکن کی رعایا، زمیندار جاگیردار اور شاہی عمال سب پر ان کے ذاتی اور خاندانی اثرات تھے۔ اسکے علاوہ ان کے ساتھ تورانی امرا کی بھی ایک بہت بڑی جماعت تھی جن میں سے اکثر دکن کے کسی نہ کسی حصہ میں جنگی اور

انتظامی عہدوں پر رہ چکے تھے۔ اس وجہ سے کسی دوسرے صوبہ کی بہ نسبت ان کے لئے دکن میں اپنا اقتدار قائم کرنے کے زیادہ مواقع تھے۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے مالوہ اور گجرات کے صوبوں کو چھوڑ کر دکن کو ترجیح دی۔ حالانکہ جب انھوں نے اپنی مستقل ریاست قائم کرنے کا خیال کیا تھا اُسوقت ان دونوں صوبوں پر بھی انکی حکومت تھی۔ اس کے علاوہ مالوہ اور گجرات کو ترجیح نہ دینے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ یہ دونوں صوبے دارالسلطنت سے نسبتہً قریب تھے اور انھیں رکھنے سے اندیشہ تھا کہ شاہی حکومت سے کسی وقت براہ راست تصادم کی نوبت آجائیگی جس سے وہ بچنا چاہتے تھے۔

ماخذ:-

منتخب اللباب جلد دوم
فتوحات آصفی
مآثر الامرا
مآثر نظامی
سرو آزاد
خزانہ عامرہ } تالیف غلام علی آزاد بلگرامی
سیر المتاخرین تالیف سید غلام حسین خاں طباطبائی
طبع کلکتہ ۱۲۴۸ھ
حدیقۃ العالم

گلزار آصفیہ
تزک آصفیہ تالیف تجلی علی شاہ
تاریخ ظفرہ تالیف منشی گردھاری لال حقر طبع گورکھپور ۱۹۲۷ء
رقعات موسوی خاں جرأت میر منشی نواب آصفجاہ اول
(قلمی نسخہ - دفتر دیوانی حیدرآباد دکن)
بساط الغنائم - تالیف لچھمی نراین شفیق - طبع حیدرآباد سنہ ۱۳۲۲ھ
سیر الہند و گل گشت دکن
خزانہ رسول خانی
حقیقتہائے ہندوستان (قلمی) تالیف لچھمی نراین شفیق
(کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن)
سوانح دکن۔

Later Mughals by Irvine
A History of the Mahrattas by Grant Duff. Caloutta 1918
History of the Deccan by J. D. B. Gribble. London 1896 & 1924
A History of the Mahrattas by Waring
Rise of the Peshwas by H. N. Sinha. The Indian Press Allahabad 1931
The Nizam, by Briggs.
History of India by Elphinston. 5th Edition, 1866
Historical and Descriptive Skeetch of his Highness the Nizam's Dominions by S. Husain Bilgrami and C. Willwott.

باب سوم

نظام الملک آصفجاہ

دولت آصفیہ اور سلطنت مغلیہ کے تعلقات کی نوعیت

ہندوستان اور دوسرے تمام مشرقی ممالک میں جن اخلاقی نظریات نے سیاسیات پر غلبہ حاصل کر رکھا ہے، انمیں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک سلطنت کے ملازموں میں سے اگر کوئی شخص اس سلطنت کے خلاف بغاوت کرکے اپنی الگ ریاست کی بنا ڈالتا ہے، یا خود تخت شاہی پر قبضہ کر لیتا ہے، تو لوگ اسے غدار اور نمک حرام سمجھتے ہیں، اسکی اطاعت کو بدترین اخلاقی جرم خیال کرتے ہیں، اور ملک کے عوام و خواص کے دلوں میں مدتوں تک اس کے خلاف بغض و عداوت کی آگ بھڑکتی رہتی ہے، جس کو دبانے اور بجھانے میں اسکو بڑی مشکلات پیش آتی ہیں۔ باستثناء ان چند صورتوں کے جن میں شاہی خاندان اپنے مظالم اور برے اعمال کے سبب سے سخت نامقبول ہو چکا ہو، اور لوگ اس کے خلاف بغاوت کرنے والے کو اپنا ناجی سمجھنے پر مجبور ہوں، یہ قاعدہ کلیہ اور تمام صورتوں پر حاوی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق میں جب کوئی سلطنت طویل مدت تک قائم رہ جاتی ہے، اور باشندے

اسکے شاہی خاندان سے مانوس ہو جاتے ہیں، تو پھر اسکی انتہائی کمزوری، نالائقی اور بدنظمی کے باوجود ایک زمانہ دراز تک کوئی شخص اسکے خلاف علانیہ بغاوت کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اُس کے صوبہ دار عملاً خود مختار فرمانروا بن جاتے ہیں، مگر ظاہر میں اسکی وفاداری و اطاعت کا دم بھرنے پر اپنے آپکو مجبور پاتے ہیں، اور جو کوئی اسکے مقابلہ میں شاہی کا دعویٰ کرتا ہے، اُسے رائے عام کی ایسی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسکی نئی بادشاہی کی جڑ بنیاد ہل جاتی ہے، اور بسا اوقات خود اسکی اپنی رعایا اس کے خلاف شورش برپا کر کے اس کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ سلطنت مغلیہ کو جس چیز نے انتہائی ضعف انتشار کے باوجود سے ڈیڑھ سو برس تک ہندوستان کی سیادت پر برقرار رکھا وہ یہی خیالی قوت تھی۔ اس نے ذوالفقار خاں کو قوت و اقتدار کے منتہا پر پہنچ جانے کے باوجود بادشاہی کا دعویٰ کرنے سے باز رکھا۔ اسی نے سادات بارہہ کو بادشاہ گر بن جانے کے باوجود بادشاہ بن جانے سے روکا۔ اور اسی نے نظام الملک کو دکن کی بادشاہی کا اعلان کرنے سے محترز رکھا، حالانکہ جملہ انتظامی اور سیاسی حیثیات سے اب دکن اُن کا تھا اور مغل بادشاہ کو اس پر برائے نام سیادت سے زیادہ کوئی اقتدار حاصل نہ تھا۔

اس میں شک نہیں کہ اس عام قاعدہ کی پابندی کر کے نظام الملک نے اپنے آپ کو اس اعلیٰ سیاسی و آئینی مرتبہ سے محروم کر لیا جو بادشاہی کے محض ایک اعلان سے انکو حاصل ہو سکتا تھا۔

لیکن اسکے ساتھ ہی ان کو دو زبردست فوائد بھی حاصل ہوئے، جو اعلان شاہی کی صورت میں ہرگز حاصل نہ ہوتے۔

پہلا فائدہ جو اس زمانہ میں صرف اخلاقی تھا۔ مگر بعد میں اس نے سیاسی اہمیت بھی حاصل کرلی، یہ تھا کہ وہ نہ صرف رائے عام کی ملامت اور ناراضی سے محفوظ رہے، بلکہ جس طرح انھوں نے اور ان کی اولاد نے انحراف کی پوری قدرت رکھنے کے باوجود بادشاہ کی اطاعت کی اور مقام شاہی کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھا، اس کی بنا پر عام اہل ہند اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں میں وہ بہت عزت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے، اور یہ چیز اس زمانہ میں دولت آصفیہ کے لئے بہت بڑی قوت بن گئی جب سیاسی خطرات نے ہندوستان کی دوسری ریاستوں کی طرح اس دولت کو بھی ہر طرف سے گھیر لیا تھا۔

دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ انہیں وہ مشکلات پیش نہ آئیں جو ایسے حالات میں شاہی حکومت سے الگ ہونے، اور اپنی علیحدہ سلطنت قائم کرنے سے لازماً پیش آتیں۔ اگر وہ اس وقت بادشاہی کا اعلان کردیتے تو یقیناً ان کو مخالفت کے ایک بہت بڑے طوفان کا مقابلہ کرنا پڑتا۔ جنوبی ہند کے طاقتور فوجدار جن پر ابھی تک ان کی گرفت مضبوط نہ ہوئی تھی، دفعتہً ان کے خلاف علم بغاوت بلند کردیتے۔ کرناٹک کے بڑے اور چھوٹے پالیگر، نائک اور زمیندار، جنہیں صرف شاہی حکومت کی ہیبت و قوت نے باجگذار بنا رکھا تھا۔ یکبارگی انکے دائرۂ

اطاعت سے نکل جاتے، شمال کے بہت سے سردار جو نظام الملک سے حسد رکھتے تھے، انکے مقابلہ میں شاہی حکومت کی حمایت کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ مرہٹے اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں ذرہ برابر تأمل نہ کرتے، محمد شاہ اور اس کے نادان مشیروں کی غلط سیاست سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ محض نظام الملک کو نیچا دکھانے کے لئے باجی راؤ کو دکن کے دو تین صوبوں کا پروانہ عطا کر دیتے، اور آن واحد میں مہاراشٹر کے برگی تمام اقطاع دکن پر پھیل کر حکومت کا سارا شیرازہ درہم برہم کر ڈالتے۔ ان زبردست مخالفتوں سے مقابلہ کرنے میں نظام الملک جن ہتھیاروں سے کام لیتے وہ خود بھی پوری طرح قابل اعتماد نہ ہوتے۔ کیونکہ خود انکی رعایا، انکے ملازم، انکے سپاہی، اور انکے بہت سے سرداران فوج بھی دلوں میں ان کے مخالف ہوتے، اور نازک مواقع پر ان کا ساتھ چھوڑ کر مخالفوں سے مل جاتے۔ ایسے حالات میں اول تو دولت آصفیہ کا قیام ہی محال تھا۔ اور اگر بفرض محال نظام الملک اپنی اعلیٰ قابلیت سے اس میں کسی حد تک کامیاب ہو بھی جاتے تو انکی اولاد میں کوئی اس قابل نہ تھا جو انکے بعد اس امر خطیر کو سنبھال سکتا۔

ان مختلف پہلوؤں پر نظر کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نظام الملک کا شاہی حکومت سے علانیہ انحراف نہ کرنا اور مرتبۂ شاہی حاصل کرنے کی طمع سے — جو ایسی زبردست طمع ہے کہ قدرت و استطاعت حاصل ہونے کے بعد بڑے بڑے ضابط

انسانوں کے لئے بھی اس کا رد کرنا مشکل ہو جاتا ہے ـــــ احتراز کرنا محض مشرقی تخیل کی بنا پر ایک شریفانہ اور وفاشعارانہ فعل ہی نہ تھا، بلکہ ایک ایسا فعل بھی تھا جو غایت درجہ کے تدبر اور معاملہ فہمی کا ثبوت پیش کرتا ہے، اور جس پر صرف وہی لوگ قادر ہو سکتے ہیں جنکی عقل کبھی جذبات سے مغلوب نہیں ہوتی۔

یہ سوال ایک حد تک پیچیدہ ہے کہ اس ظاہری اطاعت اور باطنی خود مختاری کی حالت میں دولت آصفیہ اور سلطنت مغلیہ کے تعلقات کی سیاسی اور آئینی نوعیت کیا تھی۔ لیکن سادہ طریقہ سے اسکو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ عملاً خود مختار ہو جانے کے باوجود جس چیز نے نظام الملک اور انکے جانشینوں کو مغل بادشاہ کی اطاعت کا دم بھرنے پر آمادہ کیا تھا، وہ کوئی سیاسی و مادی قوت نہ تھی بلکہ محض ایک اخلاقی قوت تھی، اسلئے دولت آصفیہ پر سلطنت مغلیہ کا شاہی اقتدار بھی محض ظاہری اور نمائشی تھا۔ نظام الملک اور انکے جانشین بظاہر مغل سلطنت کے صوبہ دار تھے، صوبہ داری پر ان کا تقرر شاہی فرمان سے ہوتا تھا، اور وہ بادشاہ کے عطا کردہ خطابات و مناصب فخر کے ساتھ حاصل کرتے اور ان کو سرمایۂ عزت سمجھتے تھے، مگر دکن پر انکی حکومت بادشاہ کی عطا کردہ نہ تھی، نہ اس حکومت کا قیام بادشاہ کی قوت پر مبنی تھا، نہ بادشاہ کے ارادہ کو انکے عزل و نصب میں کوئی دخل تھا۔ جہاں تک حکومت کے انتظام، اور کلیات و جزئیات کے رتق و فتق، اور داخلی و خارجی سیاست کا تعلق تھا، اسمیں فرمانروائے دکن! شاہی مطلق العنان،

تھا جتنا ایک خود مختار بادشاہ ہوتا ہے۔ دکن کے صوبوں اور قسمتوں کے صوبہ دار اور فوجدار، نظام کے تابع فرمان تھے اور ان کا عزل و نصب کلیۃً نظام کے اختیار میں تھا، مگر ظاہری حیثیت سے وہ صوبہ دار دکن کے نہیں بلکہ بادشاہ کے صوبہ دار و فوجدار تھے، اور ایک مدت تک انکے تقرر کا فرمان بھی بادشاہ کی جانب سے آیا کرتا تھا۔ یہاں کی باجگذار ریاستیں بھی حقیقت میں نظام کی باجگذار تھیں، نظام ہی کو خراج ادا کرتی تھیں، اور نظام ہی ان پر بالادستی کے اختیارات استعمال کرتے تھے، مگر ان پر قانونی سیادت نظام کو نہیں، مغل بادشاہ کو حاصل تھی، وہ نظام کو اپنے بادشاہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ بادشاہ کے صوبہ دار کی حیثیت سے خراج ادا کرتے تھے، اور ان پر صوبہ دار دکن کی بالادستی و سیادت نہ کبھی رسمی حیثیت سے ظاہر کی گئی اور نہ انھوں نے اسکو رسمی حیثیت سے تسلیم کیا۔ حکومت کے انتظام میں بھی بادشاہ کے اس ظاہری اقتدار برقرار رکھا گیا۔ نظام کے ساتھ بادشاہ کا ایک دیوان رہا کرتا تھا، جو دیوان شاہی کہلاتا تھا۔ مگر یہ دیوان خود نظام کا اپنا منتخب کیا ہوا ہوتا تھا، امور ریاست میں اس کو کوئی دخل نہ تھا، اور اس کا کام صرف یہ تھا کہ نظام جن لوگوں کو جاگیریں، انعام اور مناصب وغیرہ عطا کریں انکی توثیق کے لئے وہ بادشاہ کی جانب سے سند لکھ دیا کرے۔ غرض سلطنت مغلیہ اور دولت آصفیہ کا اضافی تعلق کچھ اس نوع کا تھا کہ نہ اسکو کامل استقلال سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اور نہ حقیقی تابعیت سے، بلکہ وہ ان دونوں کے بین بین ایک مبہم اور غیر معین

حالت تھی، جس نے کوئی قطعی اور واضح آئینی شکل اختیار نہ کی تھی۔ مگر اس حالت کا میلان، استقلال کی طرف زیادہ اور تابعیت کی طرف برائے نام تھا۔ اور تابع و متبوع کے درمیان گویا اس امر پر ایک ذہنی سمجھوتہ ہوگیا تھا کہ متبوع اپنی سیادت کے ظاہری اعتراف و اقرار پر قانع تھا کیونکہ اسمیں بزور اسکو قائم کرنے کی قدرت نہ تھی۔ اور تابع صرف اس پر مطمئن تھا کہ اسے حقیقی اور واقعی استقلال حاصل ہے، کیونکہ متبوع کی اخلاقی و معنوی قوت کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے استقلال کو نمایاں کرنے اور تابعیت کے بدنما رنگ کو دھو ڈالنے کا یارا نہ رکھتا تھا۔ اس لحاظ سے سلطنت مغلیہ میں دولت آصفیہ کی حیثیت وہی تھی جو دولت عثمانیہ میں محمد علی پاشا خدیو مصر کی، اور دولت عباسیہ کے دور انحطاط میں ایران، خراسان اور ماوراء النہر وغیرہ ممالک کے رئیسوں کی تھی۔

۴ - دکن میں مرہٹوں سے کشمکش

اب ہم پھر واقعات کے سلسلہ کی طرف رجوع کرتے ہیں

مبارز خان اور اسکے بیٹوں کی قوت کا استیصال اور صوبہ حیدرآباد پر پوری طرح قبضہ کرنے کے بعد نظام الملک نے سب سے پہلے جس چیز کی طرف توجہ کی وہ یہ تھی کہ اپنی ریاست کے لئے ایک ایسے مقام کو محفوظ کرلیں جو بیرونی خطرات سے دور ہو۔ اورنگ آباد، بیدر اور بیجاپور مرہٹوں سے بہت قریب

تھے، اور مرہٹہ برگی ان علاقوں میں وبائی جراثیم کی طرح پھیل چکے تھے۔ ان میں سے کسی مقام کو ریاست کا مرکز بنانا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ لہذا انھوں نے حیدرآباد کو اس کے لیے منتخب کیا اور اس صوبہ میں کامل امن وامان قائم کرنے کی کوشش کی۔ یہاں انھوں نے واکن کھیڑہ، کوہیر اور ایلگندل کے سرکش زمینداروں کیطرف فوجیں بھیجیں، اور انکو بزور شمشیر مطیع کیا۔ ملک کے دوسرے اقطاع میں جہاں جہاں شریر جماعتوں نے فساد برپا کر رکھا تھا تھانے قائم کرکے بدامنی کا سدّباب کیا۔ اسکے بعد انھوں نے مرہٹوں کی طرف توجہ کی۔ مبارزخاں نے اپنی صوبہ داری کے زمانہ میں حسین علی خاں کی طے کردہ شرائط صلح کو قبول نہیں کیا تھا، اور اپنے صوبہ سے مرہٹوں کو چوتھ دینے سے انکار کردیا تھا۔ مرہٹوں نے فوجی قوت سے اپنا یہ حق قائم کرنے کی جتنی کوششیں کیں، مبارزخاں نے ان کا سختی کے ساتھ مقابلہ کیا، اور بارہا ان کو شکستیں دیں۔ اس وجہ سے صوبہ حیدرآباد میں مرہٹوں کا باقاعدہ عمل دخل، جیسا کہ دکن کے دوسرے صوبوں میں تھا، نہ ہو سکا۔ مگر اس کے باوجود وہ اس صوبہ کو ان کی دست برد سے محفوظ نہ رکھ سکا تھا کیونکہ مرہٹے اپنے قومی طریق جنگ کے مطابق، اس صوبہ کے اطراف ونواحی میں پھیل گئے تھے۔ عام رہزنی اور لوٹ مار کرکے انھوں نے شاہراہوں کو اسقدر غیر محفوظ کردیا تھا کہ تجارتی قافلوں کی آمد ورفت محال ہوگئی تھی، زمینداروں، اور عام رعایا سے بھی جہاں انکا بس چل جاتا، وہ چوتھ اور سردیسکھی وصول کرلیتے تھے،

اور اکثر اوقات یہ تحصیل معاہدہ کی مقررہ شرح سے بہت زیادہ ہوتی تھی۔ نظام الملک نے اس فتنہ کا سد باب کرنے کے لئے باجی راؤ کو چھوڑ کر، سری پت راؤ پرتی ندھی سے گفتگو کی جس سے باجی راؤ کی مخالفت کوئی مخفی راز نہ تھی، اور اسکی معرفت راجہ ساہو سے یہ سمجھوتہ کرالیا کہ آیندہ سے حیدر آباد کے صوبہ میں مرہٹوں کو براہ راست چوتھ، سردیسمکھی اور راہداری وصول کرنے کا حق نہ ہوگا، پیشوا کے گماشتے جو ان محاصل کی تحصیل کے لئے مقرر ہیں، اٹھا لئے جائینگے، اور ان محاصل کے عوض ایک مقرر رقم سالانہ خزانۂ عامرہ سے ادا کی جاتی رہیگی[1]۔ اس سمجھوتہ پر ساہو کو راضی کرنے کے لئے نظام الملک نے اسکے ساتھ متعدد رعایتیں کیں۔ اندراپور کے قریب، اسکو ایک جاگیر عطا کی، ایک اور جاگیر برار میں پرتی ندھی کو دی، اور اس سے پہلے ساہو کے مخالف سردار رنبھا جی نبالکر (راؤ رنبھا) کو جو جاگیر پونا کے نواحی میں دی تھی اسے موقوف کر کے کرلہ کے اطراف میں ایک دوسری جاگیر دے دی۔

باجی راؤ نے اس سمجھوتہ کی سختی کے ساتھ مخالفت کی۔ یہ مخالفت صرف اس بنا پر ہی نہ تھی کہ یہ اس کے مخالف پرتی ندھی کا طے کیا ہوا تھا، اور اسکے علم کے بغیر طے کیا گیا تھا۔ بلکہ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ پیشوا کی رائے میں مغلوں سے حقوق اور معاملات

---

[1] اس سمجھوتہ کی تفصیلات کہیں مذکور نہیں ہیں۔ منتخب اللباب اور حدیقۃ العالم میں صرف اس کا خلاصہ دیا گیا ہے۔

کا واضح تصفیہ کرنا مرہٹوں کے مفاد کے خلاف تھا، کیونکہ حقوق کو مبہم رکھنے اور معاملات کو الجھا ہوا رہنے دینے میں ان کو موقع حاصل تھا کہ اپنی قوت اور مغلوں کے ضعف کی نسبت سے جسقدر زیادہ فائدہ اٹھا سکیں، اٹھائیں۔ نیز وہ چوتھ اور دیسمکھی وغیرہ کی تحصیل کے بجائے ایک مقررہ رقم لینے کا بھی مخالف تھا، کیونکہ اس کے نزدیک مغل حکومت کے اقطاع میں مرہٹوں کے گماشتوں اور تحصیلداروں کا مقرر ہونا اور مرہٹہ برگیوں کا تحصیل کے نام سے پھیل جانا، درحقیقت یہ معنی رکھتا تھا کہ ان اقطاع میں مرہٹہ حکومت بتدریج قائم ہو رہی ہے، اور ایسی حالت میں اس امر کا قوی امکان تھا کہ ملک کے جس حصہ پر مغلوں کی گرفت کمزور ہو وہاں مرہٹے بلا کسی وقت و مزاحمت کے اپنا تسلط قائم کر لیں۔

ان وجوہ سے باجی راؤ نے سمجھوتہ کو رد کر دیا، اور پرتی ندھی نے اسکو برقرار رکھنے پر زور دیا۔ اس پر دونوں میں سخت نزاع برپا ہوئی، اور سنہ ۱۱۳۹ھ کے اواخر (۱۷۲۶-۲۷ء) میں اس نے کھلم کھلا مخالفت کی صورت اختیار کر لی۔ نظام الملک اس اختلاف سے فائدہ اٹھانے کے لئے پوری طرح طیار تھے۔ انھوں نے باجی راؤ کے مقابلہ میں سنبھاجی راجہ کولھاپور کو کھڑا کر دیا۔ اور چندر سین جادو، راؤ رنبھا نبالکر، اور دوسرے مرہٹہ سرداروں کو اسکی مدد کے لئے اشارہ کیا۔ چندر سین کی معرفت سنبھاجی نے صوبہ دار دکن کے سامنے دعویٰ پیش کیا کہ ستارہ اور کولھاپور کے خاندان سیواجی کے یکساں وارث ہیں، اسلئے ممالک دکن کی چوتھ اور

سردیسمکھی میں کولھاپور کے خانداں کو برابر کا حصہ ملنا چاہئے۔ صوبہ دار نے قانون رائج الوقت کے مطابق حکم جاری کیا کہ تا تصفیہ مقدمہ فریق ثانی کو چوتھ اور سردیسمکھی کی تحصیل سے روک دیا جائے۔ چنانچہ ہر طرف ساہو کے مکاسہ داروں اور نائبان سردیسمکھی کو اٹھا دینے کے احکام بھیج دے گئے۔

اب باجی راؤ کے لئے ضبط کرنا مشکل تھا۔ بارش کے اختتام تک اس نے مجبوراً صبر کیا۔ پھر ۱۱۴۰ھ کی ابتدا (اواخر ۱۷۲۷ء) میں وہ فوجیں لیکر غارتگری کرتا ہوا جالنہ کی طرف بڑھا۔ ادھر سے نظام الملک مقابلہ کے لئے آئے۔ جالنہ کے قریب ایک مختصر سی جنگ کے بعد باجی راؤ ماہور کی طرف بھاگا، پھر اورنگ آباد ہوتا ہوا خاندیس کی طرف چلا اور مشہور کر دیا کہ برہانپور کو غارت کرنے کا ارادہ ہے۔ نظام الملک برہانپور کو بچانے کے لئے روانہ ہوئے، مگر اجنٹہ گھاٹ تک پہنچے تھے کہ معلوم ہوا پیشوا گجرات کی طرف غارت گری کرتا ہوا چلا گیا ہے۔ وہ اس کے تعاقب میں چلے اور سورت تک پہنچ گئے۔ مگر وہ ہاتھ نہ آیا۔ مرہٹوں کے ہلکے رسالے جس تیز رفتاری سے نقل و حرکت کرتے تھے، اسکے مقابلہ میں ساز و سامان سے لدی ہوئی مغلی فوج کی رفتار نہایت سست تھی۔ اسلئے پیشوا کی اس چلت پھرت کو روکنا نظام الملک کے لئے مشکل تھا۔ علاوہ بریں یہ مرہٹوں کی ایک مستقل جنگی چال تھی کہ کھلے میدان میں باقاعدہ فوج کے مقابلہ سے جہاں تک ممکن ہو پہلو بچائیں، اور ملک کے

اطراف واکناف میں اچانک چھاپے مارکر اور تمام تباہی و بربادی پھیلا کر غنیم کو پریشان کردیں۔ اس چال کو ناکام کرنے کے لئے نظام الملک نے سورت سے سیدھا پونا کا رخ کیا۔ کیونکہ جب مرہٹوں کا خود اپنا گھر خطرہ میں ہوگا تو مجبوراً وہ اسکو بچانے کے لئے آئینگے، اور اسطرح ایک فیصلہ کن جنگ کا موقع نکل جائیگا۔ لیکن ابھی وہ احمد نگر تک نہ پہنچے تھے کہ مرہٹوں نے ہر طرف سے ان کو آگھیرا اور اپنے معروف طریقہ کے مطابق جنگ قزاقی شروع کردی جسے دکن کی اصطلاح میں "برگی گری" (Gurill warfare) کہتے ہیں[1]۔ انکے تیز رو سوار چھوٹے چھوٹے دستوں کی شکل میں چاروں طرف پھیل گئے۔

---

[1] مرہٹوں کے اس طریق جنگ کو اورم (Orme) نے خوب بیان کیا ہے وہ خود اس زمانہ میں موجود تھا، اور اس قسم کی لڑائیاں بچشم خود دیکھ چکا تھا۔ وہ لکھتا ہے:-

"مرہٹہ فوج کی طاقت زیادہ تر انکے کثیر التعداد سواروں پر مشتمل ہے، جو تکان اور صعوبتوں کا مقابلہ کرنے میں ہندوستان کی تمام دوسری فوجوں سے بڑھے ہوئے ہیں اور مشہور ہے کہ انکی بڑی بڑی جماعتیں ایک ایک دن میں پچاس پچاس میل کے دھاوے مار جاتی ہیں۔ یہ لوگ عام زد و خورد سے ہمیشہ اجتناب کرتے ہیں، اور جنگ کرنے میں وہ اس کے سوا کوئی اور خیال نہیں کرتے کہ دشمن کے ملک کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچائیں۔ اس غرض کے لئے، وہ جانور ہانک لیجاتے ہیں، فصلیں خراب کرتے ہیں، بستیاں جلا ڈالتے ہیں، اور ایسے ایسے ظلم و ستم -

رسد کا سلسلہ منقطع کر دیا، جنگلوں میں چارے کو جلا ڈالا، فصلوں اور آس پاس کے دیہات کو تباہ کر دیا، اور ان طریقوں سے مغل فوج کو قحط زدہ کر دیا۔ جہاں مغل سپاہ کا غلبہ دیکھا وہاں سے بھاگ نکلے، اور جہاں کسی قلیل جماعت کو پا لیا اسپر حملہ کر کے لوٹ مار اچل دے۔ نظام الملک نے لوہے کو لوہے سے کاٹنا چاہا اور اپنے حلیف مرہٹوں کو حکم دیا کہ وہ بھی باجی راؤ کی برگی گری کا

کرتے ہیں جنکی وجہ سے غیر محفوظ علاقوں کے باشندے انکی آمد کی پہلی خبر سنتے ہی اپنے گھر بار چھوڑ کر بھاگ نکلتے ہیں۔ انکی تیز نقل و حرکت اس رئیس کو جس سے وہ جنگ کرتے ہیں، اس کا بہت کم موقع دیتی ہے کہ وہ ان پر کوئی فیصلہ کن ضرب لگا سکے، یا انکے کسی دستہ ہی پر موثر حملہ کر سکے۔ پس میدان جنگ میں ایک بڑی فوج کے لاحاصل مصارف کا بار اور اس قسم کے دشمن سے جنگ کا موقع تک حاصل نہ ہونا، اور سب سے زیادہ نقصان جو انکی عام غارتگری سے ملک کو پہنچتا ہے، یہ سب چیزیں، اکثر ان حکومتوں کو جن سے وہ لڑتے ہیں، اس بات پر باسانی آمادہ کر دیتی ہے کہ روپیہ دیکر ان سے عافیت خرید لیں۔ ..... وہ بسا اوقات اپنے دستے، اور کبھی کبھی پوری پوری فوجیں کرایہ پر دے دیتے ہیں، مگر ان کو کرایہ پر لینا خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ کیونکہ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ فریق مخالف کی طرف سے اچھی شرائط پیش ہوں اور وہ اپنے حلیف کا ساتھ چھوڑ کر اسکے حریف سے نہ جا ملیں نیز وہ ان علاقوں میں بھی اپنی غارت گری کو نہیں چھوڑتے جن کی حفاظت کے لیے ان کو کرایہ پر لیا جاتا ہے"

(اورم۔ جلد اول صفحہ ۴۰)

مقابلہ انہی ہتھیاروں سے کریں۔ مگر چندر سین کی فوج مرہٹوں اور مغلوں سے مخلوط تھی۔ اسے برگی گری کے طریقوں پر پورا عبور نہ تھا۔ اور سنبھاجی کے کارکن، باجی راؤ سے ساز باز رکھتے تھے، اس لئے وہ بھی کچھ نہ کر سکا۔ آخر جب نظام الملک کافی پریشان ہو چکے، تو باجی راؤ نے عضد الدولہ عوض خاں کی معرفت صلح کی تجاویز پیش کیں، جن کا خلاصہ یہ تھا:۔

(۱) سنبھاجی پیشوا کے حوالہ کردیا جائے،

(۲) آئندہ کے لئے محاصل ملکی میں سے مرہٹوں کا پورا حصہ ملنے کی ضمانت دی جائے،

(۳) بقایا جو ابتک ادا نہیں ہوئے ہیں، ادا کردے جائیں۔

نظام الملک نے آخر کی دونوں شرطوں کو قبول کرلیا۔ مگر پہلی شرط ماننے سے انکار کردیا۔ آخر کار تصفیہ اس پر ہوا کہ نظام الملک سنبھاجی کو پنہلہ تک اپنی حفاظت میں پہنچا کر چھوڑ دیں۔ اس کے بعد راجہ ساہو کو اختیار ہوگا کہ اسکے ساتھ جو سلوک چاہے کرے۔ اس طرح سنہ ۱۱۴۱ھ (سنہ ۱۷۲۸ء) میں، دونوں کے درمیان صلح ہوگئی۔ نظام اور باجی راؤ پہلی مرتبہ ایک دوسرے سے ملے اور دونوں نے ایک دوسرے کی ضیافت کی۔ اسکے بعد دکن کے صوبوں میں مرہٹوں کے سرکاسہ دار اور گماشتے پھر مقرر ہوگئے۔ مگر صوبہ حیدرآباد کے متعلق وہ سمجھوتہ برقرار رہا جو راجہ ساہو اور نظام الملک کے درمیان ہو چکا تھا۔

اب پونا کے سیاسی مدبروں نے محسوس کیا کہ کولھاپور ریاست کا

روز توڑ دینا ضروری ہے، ورنہ صوبہ دار دکن ہمیشہ اس چلتے ہوئے ہتھیار کو اسی طرح استعمال کرتا رہیگا۔ چنانچہ دوسرے ہی سال انھوں نے سنبھاجی سے جنگ کی اور دریائے وارنا کے شمالی کنارے پر اسے سخت شکست دیکر بھگا دیا۔ اس جنگ میں خود تارا بائی اور اسکی بہو راجس بائی گرفتار ہو گئی تھی، اسلیے سنبھاجی بالکل بے بس ہو گیا اور اس نے ۱۱۴۳ھ (۱۷۳۱ء) میں راجہ ساہو سے ایک معاہدہ کر لیا، جسکی رو سے اسکو کولھاپور کی چھوٹی سی ریاست پر (جو ابتک قائم ہے) قناعت کرنی پڑی، اور باقی تمام مرہٹہ مقبوضات پر سے اپنے دعاوی کو چھوڑ دینا پڑا۔ اسطرح مرہٹوں کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرنے کا ایک بڑا ذریعہ نظام الملک کے ہاتھ سے نکل گیا۔

سنبھاجی کا زور ٹوٹ جانے سے دکن کے سیاسی توازن میں جو برہمی واقع ہو گئی تھی اس کو پورا کرنے کے لیے نظام الملک نے ایک اور قوت سے کام لینا چاہا۔ مگر اسمیں بھی انکو ناکامی ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ گجرات میں چند مرہٹہ سردار شاہی حکومت سے برسر پیکار تھے، اور ان کی محنتوں کا ثمرہ جو چوتھ اور سردیسمکھی کی شکل میں حاصل ہوا تھا، باجی راؤ نے عین موقع پر ان کے منہ سے چھین لیا تھا۔ اس پر یہ سردار باجی راؤ کے خلاف نعل در آتش ہو رہے تھے اور اس سے انتقام لینا چاہتے تھے۔ ان میں باجی راؤ کا سب سے زیادہ سرگرم مخالف ترمبک راؤ دبھارے تھا۔ اور پیلاجی گیکواڑ، کنتاجی اور رگھوجی بھانڈے اوداجی پوار اور دوسرے مرہٹہ سردار بھی اسکے

حامی تھے۔ نظام الملک نے اس سے مراسلت شروع کی، اور دونوں میں یہ قرارداد ہوگئی کہ گجرات کی طرف سے ترمبک راؤ اور حیدرآباد کی طرف سے نظام الملک پیش قدمی کریں اور پھر دونوں ملکر باجی راؤ پر ٹوٹ پڑیں۔ دوسری طرف نظام الملک نے مالوہ کے صوبہ دار محمد خاں بنگش سے بھی خط و کتابت کی اور اسے نربدا کے کنارے ایک مقام پر ملاقات کے لئے بلایا۔ رمضان ۱۱۴۳ھ (اپریل ۱۷۳۱ء) میں اکبرپور کے گھاٹ پر دونوں کی ملاقات ہوئی جس میں ۱۲ دن کی گفت و شنید کے بعد انھوں نے پیشوا کے مخالف مرہٹہ سرداروں کے ساتھ ایک متفقہ کارروائی کا نقشہ بنالیا۔ لیکن ترمبک راؤ اس نقشۂ جنگ سے ناواقف تھا۔ وہ قبل از وقت ۳۵[1] ہزار فوج لیکر دکن کی طرف چل پڑا کسی ذریعہ سے باجی راؤ کو اس سازباز کی خبر ہوگئی، اور اس نے فیصلہ کرلیا کہ دونوں حلیفوں کے ملنے سے پہلے ترمبک راؤ کا خاتمہ کردے۔ چنانچہ اس ارادہ سے وہ بلا توقف گجرات کی جانب روانہ ہوگیا۔ ۴ شوال ۱۱۴۳ھ (۱ اپریل ۱۷۳۱ء) کو بڑودہ اور دبھوئی کے درمیان بھیلاپور کے مقام پر دونوں کا مقابلہ ہوا جس میں ترمبک راؤ ایک اتفاقی واقعہ کا شکار ہوا، اور اسکے مرتے ہی اسکی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اسکے بڑے بڑے حامی یا قتل ہوئے، یا پکڑے گئے یا بھاگ گئے، اور اتنی بڑی مخالف جماعت آن کی آن میں پامال ہوگئی۔

---

[1] دبھاڑے خاندان کی روایت میں ترمبک راؤ کی فوج صرف ۵ ہزار بتائی گئی ہے۔ اور باجی راؤ اپنے ایک خط میں ۳۰ ہزار لکھتا ہے۔

اس واقعہ نے نظام الملک کے تمام نقشوں پر پانی پھیر دیا اب ان کے لئے اس امر کا کوئی موقع باقی نہیں رہا کہ مرہٹوں کی جماعت میں اختلافات برپا کر کے اپنے مقبوضات کو انکی دست برد سے محفوظ رکھیں۔ اسکے بعد دو صورتوں میں سے ایک صورت اختیار کرنا ناگزیر تھا۔ یا تو مرہٹوں سے لڑیں اور اسوقت تک لڑتے رہیں جب تک ان کا زور نہ ٹوٹ جائے۔ یا ان سے کوئی ایسا سمجھوتہ کریں جسکی مفید شرائط سے مطمئن ہو کر وہ دکن کے امن و امان سے تعرض کرنا چھوڑ دیں۔

پہلی صورت کے لئے نظام الملک طیار نہ تھے۔ کیونکہ اسوقت پیہم فتنہ و فساد اور بدامنی کے باعث دکن کے صوبوں کی معاشی اور انتظامی حالت نہایت ابتر ہو رہی تھی اور اس حالت میں ایسی قوت کا فراہم کرنا قریب قریب محال تھا جس سے مرہٹوں کے ساتھ ایک طویل فیصلہ کن جنگ کی جاسکتی۔ اس حالت کی اصلاح کے لئے نظام الملک کو امن کے چند سال درکار تھے، اور وہ اسی طرح سے حاصل ہو سکتے تھے کہ وہ پہلی صورت کو چھوڑ کر دوسری صورت ہی اختیار کرتے۔ اس غرض کے لئے انھوں نے باجی راؤ سے گفت و شنید شروع کی۔ آخر دونوں کے درمیان ایک خفیہ سمجھوتہ ہو گیا جس کا مدعا یہ تھا کہ اگر باجی راؤ دکن کے صوبوں سے کسی قسم کا تعرض نہ کرے تو نظام الملک شمالی ہند کی جانب اسکی ملک گیری میں کسی قسم کی مزاحمت نہ کرینگے[1] اس سمجھوتہ کا خلاصہ منسارام نے خود

---

[1] گرانٹ ڈف، ارون اور صاحب سیر المتاخرین نے بھی اس سمجھوتہ کا ذکر کیا ہے۔ مگر مجھے اس وقت تک اسکے وجود کا یقین نہ آیا جب تک مآثر نظامی سے اسکی تصدیق نہ ہو گئی کیونکہ اس کا مصنف نواب آصفجاہ کے خاص ملازموں میں سے تھا اور یہ سب معاملات اسکی آنکھوں کے سامنے پیش آئے تھے۔

نظام الملک کے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے :-

"انشاء اللہ تعالیٰ ملک گیری از نربدا آنطرف ذمہ آنہا می گزارم و فوج اینہا در تعلقہ من گردش نکنند" (مآثر نظامی صفحہ ٨٥)

یہ پہلا موقع ہے جبکہ ہم نظام الملک کو مفادِ سلطنت کے خلاف علانیہ ایک کارروائی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں، کہ اس وقت دکن کا مفاد اسی طریق کار میں تھا جو نظام الملک نے اختیار کیا۔ مگر اخلاق و دیانت کے نقطۂ نظر سے جب تک نظام الملک سلطنت مغلیہ سے اپنا تعلق منقطع نہ کر لیتے، اور مغل بادشاہ کے صوبہ دار کی حیثیت سے علانیہ دست بردار نہ ہو جاتے، اس وقت تک انکے لیئے یہ ہرگز جائز نہ تھا کہ سلطنت کے مجموعی مفاد کو دکن یا بالفاظ دیگر اپنی ریاست کے مفاد پر قربان کر دیتے۔ جس وقت وہ مرہٹوں کو شمالی ہند کی جانب پیش قدمی کی آزادی دے رہے تھے، انہیں یہ خوب معلوم تھا کہ محمد شاہ، اسکے ارکان سلطنت، اور اسکے امرائے فوج میں سے ایک شخص بھی اس قابلیت کا نہیں ہے کہ شمالی ہند، حتیٰ کہ خود دار السلطنت کو بھی مرہٹوں کی دست برد سے بچا سکتا ہو۔ ایسی حالت میں اس قسم کے سمجھوتے سے جو نتائج قدرتی طور پر پیدا ہونے والے تھے، اور جو فی الواقع ظاہر ہوئے، ان سے نظام الملک جیسا عمیق النظر اور پیش بیں شخص ہرگز غافل نہیں ہو سکتا تھا۔ اسلیئے ہم یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہیں کہ اسوقت دکن کو محفوظ رکھنے کی خواہش نظام الملک پر اس قدر غالب تھی کہ انھوں نے اس کی خاطر سلطنت اور ماورائے نربدا کے ممالک کیلیئے

ان تمام تباہیوں کو گوارا کرلیا جنکے نازل ہونے کا انکو پورا یقین تھا۔

۳ - شمالی ہند کے معاملات

اب ہم ان واقعات کی طرف توجہ کرتے ہیں جو اس سمجھوتہ کے بعد شمالی ہند میں پیش آئے اور جنکی بدولت آخرکار نظام الملک کو پھر ایک مرتبہ ہندوستان کی سیاست میں دخل دینا پڑا۔ مگر اسباب و نتائج کے سلسلہ کو واضح کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نظام الملک کی وزارت کے سقوط اور دکن میں ان کی خودمختاری کے آغاز سے ماورائے نربدا کے حالات میں جو تغیرات پیش آئے ان پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

گذشتہ باب میں بیان ہوچکا ہے کہ نظام الملک اپنی وزارت کے زمانہ میں مالوہ اور گجرات کی شورش فرو کرانے کے لئے بھیجے گئے تھے، اور ان دونوں صوبوں کی حکومت بھی انہی کو دے دی گئی تھی۔ انھوں نے شورش کو رفع کرکے گجرات میں اپنے چچا حامد خاں کو اور مالوہ میں اپنے پھوپھی زاد بھائی عظیم اللہ خاں کو نائب صوبہ دار مقرر کردیا تھا۔ مگر جب وہ بادشاہ سے بگڑ کر دکن چلے گئے، اور مبارز خاں کو شکست دیکر دکن پر قابض ہوگئے تو بادشاہ نے انکو مالوہ اور گجرات کی صوبہ داری سے معزول کردیا، اور گجرات پر سربلند خاں تونی اور مالوہ پر راجہ گردھر بہادر ناگر کو صوبہ دار مقرر کیا۔ نیز مانڈو اور دھار کی قلعہ داری سے بھی نظام الملک کے ملازم ابوالخیر خاں کو معزول کرکے قطب الدین علی خاں نیکوری کو مامور کیا۔

عظیم اللہ خاں اور ابوالخیر خاں نے مزاحمت کرنی چاہی، مگر عظیم اللہ خاں کو محمد شاہ نے اصالتہً اجمیر کی صوبہ داری دے کر راضی کر لیا۔ اور ابوالخیر خاں کو نظام الملک نے اپنے پاس بلا لیا۔ اسطرح مالوہ تو بآسانی نظام الملک سے واپس لے لیا گیا۔ لیکن گجرات میں حامد خاں سے شاہی عمال کا تصادم ہو گیا اور یہیں سے وہ فتنہ اٹھا جس نے آئندہ چند سال کے اندر شمال ہند میں سلطنت مغلیہ کی بنیادیں ہلا دیں۔

سر بلند خاں نے گجرات کی صوبہ داری کا پروانہ حاصل کرنے کے بعد شجاعت خاں کو اپنی طرف سے نائب صوبہ دار مقرر کیا اور اسے حکم دیا کہ حامد خاں کو بے دخل کر کے اس صوبہ میں ضبط و نظم قائم کر دے۔ یہ شخص حیدر قلی خاں کے بنائے ہوئے آدمیوں میں سے تھا، اور حامد خاں کے ساتھ پہلے سے اس کی مخالفت تھی۔ اس نے نیابت صوبہ داری کا پروانہ پہنچتے ہی حامد خاں کو دار الحکومت خالی کر دینے کا نوٹس دیدیا، اپنے بھائی رستم علی خاں کو سورت کی حکومت پر مامور کیا، جہاں سے اس نے نظام الملک کے عامل کو نکال باہر کیا، اور اسی طرح گجرات کی دیوانی سے بھی اس نے نظام الملک کے مقرر کردہ دیوان کو ہٹا دیا۔ حامد خاں نے دار الحکومت خالی کرنے کے لئے کچھ مہلت طلب کی، مگر شجاعت خاں نے اس کا کوئی عذر نہ سنا اور اس پر چڑھائی کر دی۔ تین دن تک مقابلہ کرنے کے بعد حامد خاں نے مجبور ہو کر

شہر حوالہ کر دیا، اور دوھد[1] کے مقام پر جا کر پناہ لی۔ وہاں سے اس نے یہ سب کیفیت نظام الملک کو لکھ کر بھیجی۔ انہیں شجاعت خاں کا یہ طرز عمل ناگوار ہوا، اور انھوں نے گجرات کی چوتھ کا لالچ دیکر مرہٹوں کو حامد خاں کی مدد پر آمادہ کر دیا[2]۔ چنانچہ ایک مرہٹہ سردار کنتھاجی بھانڈے پندرہ بیس ہزار فوج لیکر حامد خاں کے پاس پہنچ گیا اور ان دونوں نے احمد آباد سے ۴ کوس کے فاصلہ پر شجاعت خاں سے لڑ کر اسے قتل کر دیا (۱۱۳۷ھ/۱۷۲۴ء) اسکے بعد حامد خاں نے احمد آباد پر قبضہ کر کے کھلم کھلا شاہی اطاعت کا جوا اپنی گردن سے اتار دیا، شاہی عمال اور منصبداروں کو الگ کر دیا، اور دفتر دیوانی کے تمام کاغذات اپنے قبضہ میں کر لیے۔ کنتھاجی نے جو امداد اس کو دی تھی اسکے صلہ میں اس نے دریائے مہی کے مغرب کی طرف تمام پرگنوں کی چوتھ اور سردیسمکھی کا حق اسے عطا کر دیا۔ مگر مرہٹوں کی آتش طمع اس سے نہ بجھی اور انھوں نے خوب دل کھول کر احمد آباد کو لوٹا، حتیٰ کہ حضرت شیخ احمد کے مزار تک کو نہ چھوڑا۔

شجاعت خاں کے خون کا بدلہ لینے اور حامد خاں کو گجرات سے نکالنے کے لئے اس کے بھائی رستم علی خاں متصدی بندر سورت

---

[1] احمد آباد سے ۱۱۰ میل جانب مشرق۔

[2] بعض مورخین کا بیان ہے کہ مرہٹوں سے یہ معاملہ خود حامد خاں نے کیا تھا۔ اسمیں نظام الملک کی مداخلت کا انھوں نے کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

دفوجدار بڑودہ کو دھلی سے احکام بھیجے گئے۔ یہ شخص اس زمانہ میں پیلاجی گائیکواڑ سے جنگ میں مشغول تھا۔ ان احکام کے وصول ہوتے ہی اس نے پیلاجی کے ساتھ صلح کرلی، اور اسے دو لاکھ روپیہ دے کر حامد خاں کے خلاف اپنے ساتھ شریک کرلیا۔ اسطرح سورت سے یہ دونوں حلیف ۲۵ ہزار کے قریب فوج لیکر احمد آباد کی طرف بڑھے۔ آدراس[۱] کے مقام پر دونوں کی مڈبھیڑ ہوئی۔ پیلاجی بظاہر رستم علیخاں کے ساتھ تھا اور خفیہ طور پر نظام الملک نے اس کو حامد خاں کی حمایت کے صلہ میں بڑی بڑی امیدیں دلائی تھیں۔ مگر حقیقت میں وہ نہ رستم علی کا حامی تھا، نہ حامد خاں کا، بلکہ وہ اس تاک میں تھا کہ جو فریق غالب ہو اسکے ساتھ مل کر کمزور فریق کا مال اسباب لوٹ لے، اور پھر غالب فریق سے بیش قرار معاوضہ حاصل کرے۔ اس غرض سے وہ رستم علی کے پیچھے پیچھے ایک منزل کا فاصلہ چھوڑ کر آرہا تھا۔ فروری ۱۷۲۵ء (جمادی الاولیٰ ۱۱۳۷ھ) میں جنگ ہوئی۔ حامد خاں شکست کھاکر بھاگ نکلا اور رستم علی فتحیاب ہوا۔ لڑائی کے موقع پر دونوں طرف کے مرہٹہ حلیف خاموش کھڑے رہے اور جب دونوں فریق زد و خورد میں منہمک ہوگئے تو کنتھاجی نے اپنے دوست حامد خاں کا خیمہ و خرگاہ لوٹ لیا اور پیلاجی نے اپنے ظاہری دوست رستم علی خاں کے مال اسباب پر ایسا ہاتھ صاف کیا کہ جب وہ جنگ سے واپس ہوا تو اسے اپنی لشکر گاہ کا نشان

---

[۱] دریائے مہی کے کنارے احمد آباد سے تقریباً ۷۰ میل۔

تک نہ ملا۔

حامد خاں کا زوال اب یقینی تھا کیونکہ اس کے پاس اپنی کوئی قوت نہ رہی تھی اور اسکے مددگار مرہٹے رستم علی خاں کا غلبہ دیکھ کر بھاگ رہے تھے۔ لیکن ایک بالکل اتفاقی صورت نے نقشہ کو پھر بدل دیا شجاعت خاں کے قتل کی خبر سنکر دکن سے مرہٹوں کی ایک بہت بڑی تعداد گجرات کو لوٹنے کے لئے روانہ ہو چکی تھی۔ یہ جماعت اس جنگ کے دوسرے تیسرے روز دریائے مہی کو عبور کر کے حامد خاں کے پاس پہنچ گئی، اور آن کی آن میں ۷۰، ۸۰ ہزار آدمی اس کے لشکر میں فراہم ہو گئے۔ پیلاجی بھی اپنی مرہٹوں کے ساتھ مل گیا اور سب نے ہر طرف سے رستم علی کو گھیر لیا۔ چند روز کے اندر اس کا سارا لشکر مرہٹوں کی لوٹ مار اور رہزنی کے باعث بھوکوں مرنے لگا اور اس کے آدمی اس کا ساتھ چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ آخر اس نے احمد آباد کا رخ کیا اور لڑتا بھڑتا چند میل تک چلا گیا۔ راستہ میں ایک مقام پر تنگ آکر اس نے مقابلہ کیا اور بڑی بہادری کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس کا سر کاٹ کر احمد آباد بھیجا گیا جہاں اسکی نمائش کی گئی اور پیلاجی نے اس کا ایک ہاتھ کاٹ کر اپنے گھر بھیج دیا تاکہ اسکی "بہادری" کی یادگار رہے۔ اسطرح محض مرہٹوں کی مدد سے حامد خاں کو فتح حاصل ہوئی۔ اس کے صلہ میں اس نے کنتھاجی کو دریائے مہی کے جنوبی مغربی جانب کے تمام علاقے کی چوتھ دی جس میں احمد آباد بھی شامل تھا۔ اور پیلاجی گایکواڑ کو شمالی

مغربی جانب کے پورے نواحی گجرات کی چوتھ کا حق دیا جس میں سورت اور بڑودہ وغیرہ شامل تھے۔ دونوں جماعتوں کے مرہٹے تمام گجرات میں پھیل گئے، چوتھ کے علاوہ گھانس دانہ، کھنڈانی (خاندانی)، اور فدیہ اور ایسے ہی بہت سے مختلف ناموں سے انھوں نے رعایا پر تباہ کن ٹیکس لگانے شروع کرنے۔ رعایا کی جان و مال اور عزت و ناموس پر اس بیدردی سے حملے کرنے لگے کہ ہزارہا شرفا نے اپنی عورتوں اور بچوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا، تاکہ وہ بے عزتی سے بچ جائیں۔ ادھر حامد خاں پہلے سے زیادہ جرأت کے ساتھ شاہی حکومت سے سرتابی کا اظہار کرنے لگا۔ خاص بادشاہ کی جاگیر کا روپیہ اور شاہی استعمال کے لئے طیار کیا ہوا کپڑا لوٹ لیا۔ شاہی اموال کے خزائن جبراً کھلوائے اور ان پر قبضہ کرلیا۔ صوبہ کی تمام زمینوں کو عام اس سے کہ خالصہ ہوں یا جاگیر، اپنے تصرف میں لے لیا۔ اور دولت مند لوگوں کو پکڑ پکڑ کر ان سے جرمانے وصول کئے۔

ان واقعات کی اطلاع دہلی پہنچی تو سربلند خاں کو حکم دیا گیا کہ وہ گجرات کو حامد خاں اور مرہٹوں کے چنگل سے نکالنے کے لئے خود جائے۔ اسکی امداد کے لئے ۵۰ لاکھ روپیہ نقد دیا گیا۔ ۳ لاکھ روپیہ ماہانہ امداد منظور کی گئی، بڑے بڑے ہندو اور مسلمان سردار اس کی کمک پر مقرر کئے گئے اور نجم الدین علیخاں، سیف الدین علی خاں اور سادات بارھہ کے دوسرے بڑے بڑے سرداروں کو قید سے رہا کرکے اسکے ساتھ

جانے کا حکم دیا گیا[۱]۔ ان طیاریوں کے ساتھ رجب ۱۱۳۷ھ (اپریل ۱۷۲۵ء) میں وہ دھلی سے روانہ ہوا، اور ختم سال کے قریب گجرات کے علاقہ میں پہنچ گیا۔ حامد خاں جس کی تمام تر قوت کا انحصار مرہٹوں پر تھا، اس طاقت ور سردار کو آتا دیکھ کر محمود آباد کی طرف ہٹ گیا اور مرہٹوں کو اس نے اپنی مدد کے لئے طلب کیا۔ اس کی پیہم درخواستوں کے بعد کنتھاجی اس وقت محمود آباد پہنچا جب سربلند خاں کا نائب احمد آباد پر قابض ہو چکا تھا۔ اس کے آتے ہی حامد خاں نے احمد آباد پر حملہ کر دیا۔ مگر اہل شہر اب اس کی حکومت کو قبول کرنے کے لئے طیار نہ تھے۔ انھوں نے سختی کے ساتھ مدافعت کی۔ حامد خاں کی اپنی فوج تنخواہیں نہ ملنے کے باعث بددل ہو گئی۔ اہل گجرات میں سے جو لوگ اسکے ساتھ تھے وہ نئے صوبہ دار کے خلاف لڑنے سے جی چرانے لگے۔ مرہٹے صرف لوٹ مار سے مطلب رکھتے تھے۔ باضابطہ جنگ سے انکو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ایسی حالت میں جب معلوم ہوا کہ سربلند خاں ۳۰ ہزار فوج کے ساتھ سر پر آن پہنچا ہے تو حامد خاں نے ٹھیرنے میں کوئی فائدہ نہ دیکھا اور ربیع الثانی ۱۱۳۸ھ (دسمبر ۱۷۲۵ء) میں گجرات چھوڑ کر دکن چلا گیا، جہاں نظام الملک نے اسکو ناندیڑ کا صوبہ دار

---

[۱] ابو الفیض کا بیان ہے کہ سربلند خاں کو گجرات بھیجنے کا مقصد صرف یہی نہ تھا کہ اس صوبہ کو مرہٹوں اور حامد خاں کے تسلط سے آزاد کرالے، بلکہ یہ بھی مقصد تھا کہ دکن پر حملہ کر کے نظام الملک کو بھی وہاں سے نکال دے۔

مقرر کر دیا، اور ۴ سال بعد وہیں اسکا انتقال ہوا۔

اس طرح نظام الملک کی حکومت جو دو سال پہلے تک آگرہ اور اجمیر کی سرحدوں تک پہنچی ہوئی تھی، دریائے نربدا سے محدود ہو گئی۔ اور دو وسیع صوبے، مالوہ اور گجرات انکے قبضہ سے نکل گئے۔

ابتک مرہٹوں کی طرف سے نربدا پار کے شاہی علاقوں میں جسقدر دست درازیاں ہو رہی تھیں وہ مرہٹہ راج کی طرف سے نہ تھیں، بلکہ مختلف مرہٹہ سردار لوٹ مار کی غرض سے ادھر آنکلے تھے اور مغلوں کے باہمی اختلاف سے فائدہ اٹھا کر کامیاب ہو گئے تھے۔ لیکن اب نظام الملک اور بادشاہ کی علانیہ مخالفت، اور سلطنت مغلیہ کی ابتری، اور گجرات میں مرہٹہ سرداروں کی کامیابیاں دیکھ کر باجی راؤ پیشوا کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ہندوستان سے مغلوں کو نکال باہر کرنے کا بہترین وقت یہی ہے۔ چنانچہ اُس نے راجہ ساہو سے درخواست کی کہ وہ شمالی ہند پر حملہ کرنے، اور مرہٹہ راج کو نربدا پار کے صوبوں میں وسیع کرنیکی اجازت عطا کرے۔ باجی راؤ کے رقیب سری پت راؤ پرتی ندھی نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ اس نے اِسے خلاف احتیاط اور بے سمجھی بوجھی تجویز قرار دیا، اور کہا کہ جہاں تک بے ضابطہ غارتگری کا تعلق ہے مرہٹہ راجہ اس کا ذمہ دار نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔ مگر جب وہ اپنے مکھ پردھان کو مغل علاقوں پر حملہ کرنے کیلئے باضابطہ اجازت دیگا تو یہ شاہی حکومت سے لڑائی کا اعلان ہوگا، اور

اس صورت میں پوری سلطنت ہند سے مرہٹوں کو لڑنا پڑیگا۔ ہماری حکومت کی طاقت ابھی اتنی بھی نہیں ہے کہ جو علاقے ہم کو تفویض کردیے گئے ہیں، انمیں امن اور نظم و ضبط قائم کر سکیں۔ پھر ایک بڑی سلطنت سے جنگ چھیڑ دینا شدید حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر تم کو ممالک فتح کرنیکا شوق ہے، تو زیادہ بہتر یہ ہے کہ شمال پر حملہ کرنے کے بجائے، کرناٹک کے ان علاقوں کو فتح کرنے کی کوشش کرو جو سیواجی نے فتح کیے تھے۔ اس کے جواب میں باجی راؤ نے ایک بڑی پرجوش تقریر کی جسمیں ساہو کو اس کے دادا کی بہادریوں کے واقعات سنائے اور اسکو بتایا کہ کیسے طاقت ور بادشاہوں سے اس کے مقابلے ہوئے، اور کس کس طرح اس نے کامیابیاں حاصل کیں۔ پھر اس نے ہندوستان کی حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے مغلوں کی عیش پسندی، کاہلی، اور اخلاقی کمزوری کا مقابلہ مرہٹوں کی چستی، جفاکشی اور عملی قوت سے کیا، اور آخر میں کہا:۔

"اب وقت آگیا ہے کہ ہم ہندوؤں کے ملک سے ان غیر ملکیوں کو نکال باہر کریں اور غیر فانی شہرت پائیں۔ اپنی طاقت کو ہندوستان کی طرف صرف کرنے سے ہم آپ کے عہد حکومت میں مرہٹوں کا جھنڈا کرشنا سے اٹک تک اڑا دینگے"

اس پر ساہو نے جوش میں آکر کہا:۔

"نہیں! تم اسکو ہمالیہ پر نصب کردوگے"

اس قسم کی متعدد تقریروں سے باجی راؤ نے یہ بات ساہو کے ذہن نشین کردی کہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر حملے کرنے سے بہتر

ہے کہ اصل سلطنت پر حملہ کرکے تمام ملک کی حکومت حاصل کی جائے۔ ”ہم کیوں نہ بوسیدہ درخت کے تنے پر ضرب لگائیں۔ شاخیں اور پتے آپ سے آپ جھڑ جائینگے“

آخر کار پرتی ندھی کی مخالفت بے اثر رہی اور ساہو نے باجی راؤ کو شمالی ہند میں ملک گیری کی اجازت دیدی۔ اس اجازت کے ملتے ہی اس نے مختلف مرہٹہ سرداروں کو نربدا پار مالوہ اور گجرات کے علاقوں میں پھیلا دیا، گجرات، مالوہ، بندیلکھنڈ، اجمیر، آگرہ اور الہ آباد کے صوبہ ایک ایک کرکے مرہٹوں کے اثر میں آتے چلے گئے، یہاں تک کہ ان کی غارتگریاں خاص دارالسلطنت کے دروازوں تک پہنچ گئیں، اور دس برس کے اندر انھوں نے نربدا سے لیکر جمنا تک سارے وسط ہند کو ہلا ڈالا۔ چونکہ اس جدید فتنہ کی ابتدا ابھی گجرات ہی سے ہوئی، اسلئے ہم سب سے پہلے اس کا ذکر کرتے ہیں۔

گجرات پر مرہٹوں کا تسلط۔ حامد خاں کے گجرات سے جانے کے بعد مرہٹے بھی اپنے ملک کی طرف واپس چلے گئے تھے۔ سربلند خاں کے لئے یہ بہترین موقع تھا جس سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنے صوبہ میں نظم و ضبط قائم کرسکتا تھا۔ لیکن اس فرصت کو اس نے اپنے مددگاروں اور ماتحتوں سے لڑنے، اور اپنے ہاتھوں اپنی قوت کو برباد کرنے میں صرف کیا۔ وہ سادات بارھہ سے لڑا یہاں تک کہ نجم الدین علی خاں اسے چھوڑ کر اجمیر چلا گیا۔ سردار محمد خاں، علی محمد خاں بابی، اور دوسرے بڑے بڑے سرداروں

سے ایک ایک کرکے اسکی لڑائی ہوئی۔ خود اس کا بیٹا خانہ زاد خاں غالب جنگ اس سے بگڑ کر دھلی چلا گیا۔ بڑے بڑے تاجروں پر جبر و ظلم کرکے اُس نے روپیہ وصول کیا۔ اور اپنی ان حرکات سے عوام و خواص سب میں اپنے مخالفوں کی ایک خاصی جماعت پیدا کردی۔ یہی افراتفری کی حالت تھی جبکہ ۱۱۳۹ھ (۱۷۲۶ء) میں مرہٹے پھر گجرات پر سیلاب کی طرح ٹوٹ پڑے، اور حسب معمول قتل و غارت کا بازار گرم کرکے تھوڑی سی مدت میں انھوں نے اس سرسبز و شاداب صوبہ کو ویران کردیا۔ آخر تنگ آکر سربلند خاں نے کنتھاجی کو دریائے مہی کے مغربی جانب (باستثنائے پرگنہ و شہر احمد آباد) تمام علاقوں کی چوتھ کا حق عطا کردیا۔ اور پیلاجی گائیکواڑ کو جو گجرات میں ترمبک راؤ ڈبھاڑے سیناپتی کا نمائندہ تھا، اُنہی علاقوں کی سند لکھ دی جن کی چوتھ حامد خاں کے زمانہ میں وہ وصول کرتا تھا۔

اس واقعہ کی اطلاع دھلی پہنچی تو محمد شاہ سربلند خاں کی اس کمزوری پر ناراض ہوا اور اس نے گجرات کی مہم کے لیے ۲ لاکھ روپیہ ماہوار کی جو امداد مقرر کی تھی وہ بند کردی۔ سربلند خاں اس رقم کے بغیر اپنا کام نہیں چلا سکتا۔ وہ مالیات کے انتظام سے سراسر نابلد تھا۔ گجرات کا صوبہ کسی طرح اسکی فضول خرچیوں کا بار نہ اٹھا سکتا تھا۔ حکومت کے مصارف تو درکنار، اس کی فوج ہی کی تنخواہیں اسقدر زیادہ تھیں کہ گجرات کی آمدنی ان کے لیے کفایت نہ کرسکتی تھی۔ اب جو مرکزی حکومت کی امداد بند ہوگئی تو اس کمی کو

پورا کرنے کے لئے اس نے پہلے سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ لوگوں پر جرمانے کرنے شروع کر دیئے۔ اس طرح دشمن مرہٹوں کے ہاتھوں ملک کی تباہی میں جو کچھ کسر رہ گئی تھی وہ خود ملک کے محافظ اور امین نے پوری کر دی۔ پھر جب اس لوٹ مار سے بھی اس کا کام نہ چلا تو اس نے امرائے دربار کی وہ تمام جاگیریں جو گجرات میں تھیں، ضبط کر لیں۔ اس کے جواب میں امرائے دربار نے سربلند خاں کی وہ تمام جاگیریں جو پنجاب میں تھیں ضبط کرا لیں اور آپس میں تقسیم کر لیں۔ اس طرح ایک طرف اسکے تعلقات مرکزی حکومت سے سخت کشیدہ ہوگئے اور دوسری طرف خود اپنے صوبہ کے باشندوں اور با اثر سرداروں سے اسکی مخالفت ہوگئی۔

یہ وہ زمانہ تھا، جبکہ دکن میں نظام الملک اور باجی راؤ کے درمیان جنگ ہو رہی تھی اور اسکی وجہ سے باجی راؤ گجرات کی طرف پوری طرح توجہ نہ کر سکتا تھا۔ کنتھاجی اور ترمبک راؤ دبھاڑے، جنھوں نے سربلند خاں سے چوتھ کا حق حاصل کیا تھا، باجی راؤ کی مخالف جماعت کے سرغنے تھے، اسلئے ان دونوں کو اصل مرہٹہ راج کی تائید حاصل نہ تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ پیشوا انکو گجرات سے بے دخل کرنے کا خواہشمند تھا۔ چنانچہ اس نے ۱۱۳۹ھ اور ۱۱۴۰ھ (۱۷۲۷-۲۸ء) میں کئی مرتبہ اپنے سپہ سالار اوداجی پوار، اور خود اپنے بھائی چمناجی کو گجرات کی طرف بھیجا، اور انھوں نے یہاں کے مغل عہدہ داروں سے بھی مدد کی درخواست کی۔ لیکن چونکہ باجی راؤ کی تمام تر قوت نظام الملک کے مقابلہ میں صرف ہو رہی تھی، اسلئے

وہ گجرات کی طرف اتنی فوج نہ بھیج سکا جو کنتھاجی اور پیلاجی کو شکست دے سکتی۔ سربلند خاں کے لئے اس زمانہ میں بہترین حکمت عملی یہ تھی کہ وہ باجی راؤ کے بھیجے ہوئے سرداروں کے ساتھ مل کر کنتھا اور پیلا کا استیصال کردیتا۔ اور پھر خود باجی راؤ کے مقابلے میں نظام الملک کے ساتھ شریک ہوجاتا۔ مگر اس نے اس موقع سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ بلکہ اس کو اپنے بادشاہ، اپنی رعیت، اپنے صوبہ کے امراء اور اپنے ہمسایہ صوبہ کے حاکم (نظام الملک) سے لڑنے بھڑنے میں ضائع کردیا۔ آخر ۱۱۴۱ھ (۱۷۲۹ء) میں جب پہلی مرتبہ نظام الملک اور باجی راؤ کے درمیان صلح ہوگئی، اور باجی راؤ اپنی پوری قوت کے ساتھ گجرات کی سرحد پر نمودار ہوا تو سربلند خاں نے اسکے مقابلہ میں اپنے آپ کو بالکل بے بس پایا، اور مجبور ہوکر پورے صوبہ گجرات میں پیشوا کو چوتھ اور سردیسمکھی وصول کرنے کا حق دیدیا۔[1]

---

[1] اس سند میں چوتھ اور سردیسمکھی سے شہر و پرگنہ سورت کو مستثنیٰ کرلیا گیا تھا، اور شہر احمد آباد کی آمدنی کا صرف پانچواں حصہ عطا کیا گیا تھا۔ شرائط وہی تھیں جو دکن میں حسین علی خاں نے مقرر کی تھیں۔ اور اسی طرح محاصل کرنے کے لئے پیشوا کو اپنے مکاسہ دار اور گماشتے مقرر رکھنے کا حق دیا گیا تھا۔ مگر ایک معنی خیز شرط یہ بھی تھی کہ پیشوا گجرات میں مرہٹہ راج کی رعیت کو فساد سے روکنے کا ذمہ دار ہوگا۔ یہ شرط در اصل ترمبک راؤ دبھاڑے، کنتھاجی اور پیلاجی کو بے دخل کرنے کے لئے رکھی گئی تھی، اور اسی کی بدولت بعد میں ان دونوں گروہوں کے درمیان وہ لڑائی ہوئی جس کا ذکر ہم اوپر کرچکے۔

سربلند خاں کی اس آخری حرکت نے شاہی دربار میں اسکا کوئی اعتبار باقی نہ رکھا۔ دوسرے ہی سال (؁ ۱۱۴۳ھ ؁ ۱۷۳۰ء) صمصام الدولہ خاں دوراں کے مشورہ سے محمد شاہ نے اسکو معزول کر دیا اور اسکی جگہ راجہ ابھے سنگھ راٹھور والی جودھپور کو گجرات کا صوبہ دار مقرر کیا۔ مگر یہ انتخاب پہلے انتخاب سے بھی زیادہ غلط تھا۔ رعایا پر ظلم وستم کرنے میں ابھے سنگھ کسی طرح سربلند خاں سے کم نہ تھا۔ اور اس کا مذہبی تعصب[1] اس پر مزید تھا، جس کے باعث صوبہ کے عام باشندے اور خاص مسلمان (جن پر اس زمانہ میں فوجی قوت کا دارومدار تھا) اس کے سخت مخالف ہوگئے۔ اس اندرونی کمزوری کے ساتھ نئے صوبہ دار نے مرہٹوں کا زور توڑنے کی جتنی کوششیں کیں انمیں وہ کامیاب نہ ہوا اور نہ ہوسکتا تھا۔ علاوہ بریں اسکی صوبہ داری کے آغاز ہی میں واقعات نے ایسا رخ بدلا کہ ابھے سنگھ کے لئے کامیابی کے جو تھوڑے بہت مواقع باقی تھے وہ بھی جاتے رہے۔ اس کو گجرات آئے ہوئے پورا ایک سال بھی نہ

---

[1] ابھے سنگھ کے مذہبی تعصب اور ظلم وستم کا حال ابوالفیض اسطرح بیان کرتا ہے:۔

چناں ظلم و بیداد را کرد سر کہ نشنید کس زاں ستم بیشتر
شد آں شہر اسلام از کافراں بصد ظلم و بیداد ویراں چناں
کہ ناید بشرح و بیاں از ظلم کنم گر ہمہ آں را رقم
نمودند در جیوتہای شریر بسے طفل ارباب ایماں اسیر
شدہ در رہِ کفر آموزگار نمودند در راہ کفر استوار
ازیں ظلم مظلومہاے شمار روانہ بدہلی شدند اشکبار

ہوا تھا کہ ترمبک راؤ دبھاڑے، کنتھاجی، اور پیلاجی گائکواڑ نے نظام الملک اور محمد خاں بنگش (صوبہ دار مالوہ) کے ساتھ سازش کرکے باجی راؤ سے جنگ کی اور اس میں ایسی سخت شکست کھائی کہ ہمیشہ کے لئے ان کی قوت کا استیصال ہوگیا۔ اسکے بعد ۱۱۴۴ھ (۱۷۳۱ء) میں نظام الملک اور باجی راؤ کے درمیان وہ مفاہمت ہوگئی جسکی بدولت دکن کی طرف سے اطمینان کلّی حاصل کرکے باجی راؤ کو شمالی ہند کی تسخیر پر اپنی پوری توجہ صرف کرنے کا موقع مل گیا۔ ان حالات میں ابھے سنگھ کے لئے بجز اسکے کوئی چارہ نہ رہا کہ گجرات کی چوتھ اور سردیسمکھی کے جو حقوق سربلند خاں نے پیشوا کو عطا کئے تھے، ان کو بے چوں وچرا تسلیم کرلے۔ تاہم اس نے بڑودہ اور ڈبھوئی سے مرہٹوں کو نکالنے کی کوشش کی اور پیلاجی گائکواڑ کو دھوکہ سے قتل کردیا۔ مگر اس کی یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی۔ پیلاجی کے بھائی مادھاجی نے اسے شکست دیکر بڑودہ پھر فتح کرلیا، اور پیلاجی کے بیٹے دمناجی نے جودھپور کے علاقہ پر حملہ کرکے ابھے سنگھ کو مجبور کردیا کہ گجرات کو چھوڑکر خود اپنے ملک کے بچانے کی فکر کرے۔

مالوہ پر مرہٹوں کا تسلّط گجرات کے بعد دوسرا صوبہ جس پر مرہٹوں کا دست تعدی دراز ہوا، مالوہ تھا۔ اوپر ذکر ہوچکا ہے کہ ۱۱۳۷ھ (۱۷۲۵ء) میں نظام الملک کو مالوہ سے معزول کرکے محمد شاہ نے راجہ گردھر بہادر ناگر کو اس صوبہ کا والی مقرر کیا تھا۔ اس کی صوبہ داری کا آغاز ہی تھا کہ مالوہ پر مرہٹوں کی دست درازیاں شروع ہوگئیں۔ ابتداءً ان دست درازیوں کا مقصد لوٹ مار کے

سوا کچھ نہ تھا۔ اور اس غرض کے لئے باجی راؤ ہر سال رانوجی سندھیا، ملہار جی ہولکر، اودا جی پوار، اور چمناجی آپا کو مالوہ کی طرف بھیجتا رہتا تھا۔ لیکن بعد میں راجپوتانہ کے ہندو رئیس جن کا سرغنہ جے سنگھ سوائی تھا، مغل حکومت کا استیصال کرنے کے لئے مرہٹوں کی خفیہ امداد پر آمادہ ہو گئے، اور اندور کا طاقتور چودھری نند لال منڈلوئی بھی جے سنگھ کے اشارہ سے مرہٹوں کا مددگار بن گیا۔ ان سب کے ساز باز نے مرہٹوں کے ہاتھ اسقدر مضبوط کر دیئے کہ دو تین سال کے اندر وہ تمام مالوہ پر چھا گئے۔ ان کے مقابلہ میں گردھر بہادر کی کمزوری کے متعدد اسباب تھے۔ وہ انتہا درجہ کا بخیل اور زر پرست آدمی تھا، ضرورت کے وقت روپیہ خرچ کرنے میں دریغ کرتا تھا، حتیٰ کہ فوج کے مصارف بھی اسکو بار گراں محسوس ہوتے تھے۔ اس وجہ سے اسکی فوجی قوت کمزور تھی۔ اس کے صوبہ کے بڑے بڑے سردار بھی یا تو اس کے مخالف تھے یا غیر جانبدار۔ رہی مرکزی حکومت، تو وہ خواب ناز میں محو تھی، مالوہ کی خطرناک حالت اور گردھر بہادر کے ضعف کا حال جاننے کے باوجود اس نے مدافعت کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ اس نامساوی مقابلہ میں گردھر بہادر زیادہ مدت تک نہ ٹھیر سکا، اور جمادی الاولی ۱۱۴۱ھ ۱۷۲۸ء میں اجین کے قریب مرہٹوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اسکے بعد شاہی حکومت نے مالوہ کی مدافعت کے لئے اسکے بیٹے راجہ بھوانی رام چمنا بہادر کو مامور کیا مگر مالی امداد نہ کی حالانکہ اسی کی زیادہ ضرورت تھی۔ آخرکار چند مہینوں میں اس کی ناکامی بھی آشکارا ہو گئی۔ پھر

گردھر بہادر کا چچا زاد بھائی دیا بہادر (چھبیلہ رام ناگر کا بیٹا) صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ اس نے آکر مالوہ میں سختی کے ساتھ نظم و ضبط قائم کرنے کی کوشش کی، مگر ایسے حالات میں جبکہ دشمن سر پر موجود ہو سختی کا الٹا اثر ہوتا ہے۔ پورا ایک سال بھی نہ گذرا تھا کہ مقامی زمیندار اس کے جبر و تشدد سے تنگ آکر مرہٹوں سے مل گئے، اور دھار کے قریب اسکو شکست دے کر قتل کر ڈالا (ربیع الثانی ۱۱۴۳ھ۔ اکتوبر ۱۷۳۵ء)۔ راجہ جے سنگھ سوائی نے اس فتح پر باجی راؤ کو مبارکباد دی، اور اسے لکھا کہ

"تم نے مالوہ میں اپنے دھرم کی خوب رکھشا کی، اور مسلمانوں کی سرکوبی کرکے دھرم کا جھنڈا گاڑ دیا۔ تم نے میری آرزو پوری کر دی[1]"

اس زمانہ میں الہ آباد کا سابق صوبہ دار محمد خان بنگش دہلی میں موجود تھا۔ ظفر خاں روشن الدولہ اور رحیم النسا کوکی نے بڑی بڑی رشوتیں لینے کے بعد اسے مالوہ کی صوبہ داری پر بھجوا دیا۔ یہ ایک بہادر سردار تھا۔ اس نے مالوہ پہنچ کر مرہٹوں کو متعدد شکستیں دیں، ایک سال کے اندر انہیں اجین، مندیشور، اور دھار، کے

---

[1] ایسے ہی ایک موقع پر جے سنگھ نے نند لال کو لکھا:-
"تم پر ہزار آفریں، کیونکہ تم نے صرف میری بات پر بھروسہ کرکے، اور اپنے دھرم کو نفع پہنچانے کی خاطر مالوہ میں مسلمانوں کو مٹا دیا، اور وہاں اپنے دھرم کو مضبوطی کے ساتھ قائم کر دیا۔ تم نے میرے دل کی تمنا پوری کر دی"

علاقوں سے نکال دیا، اور نربدا کے کنارے انکے نئے قلعوں کو مسمار کر دیا۔ یہی زمانہ تھا جبکہ دکن میں نظام الملک اور مرہٹوں کے درمیان کشمکش ہو رہی تھی۔ جیساکہ اوپر بیان ہو چکا ہے، اس زمانہ میں نظام نے محمد خاں سے خط و کتابت کی، گجرات کے مرہٹہ سرداروں کو باجی راؤ کے مقابلہ میں اُکسایا، اور رمضان ۱۱۴۴ھ (اپریل ۱۷۳۲ء) میں نربدا کے کنارے محمد خاں بنگش سے مل کر اس کو بھی اس اتحاد میں شرکت پر راضی کر لیا۔ لیکن گجرات کے مرہٹہ سرداروں کی شکست نے سارا نقشہ بدل دیا۔ اس واقعہ کے بعد نظام الملک اور باجی راؤ میں سمجھوتہ ہو گیا، گجرات پر مرہٹوں کا تسلط مستحکم ہو گیا، محمد خاں مرہٹوں کے مقابلہ میں تنہا رہ گیا، اور مرہٹوں کو دکن اور گجرات کی طرف سے مطمئن ہو کر اپنی پوری پوری توجہ مالوہ کی طرف منعطف کر دینے کا موقع مل گیا۔ دوسرے ہی سال باجی راؤ نے ایک لاکھ سواروں کے ساتھ مالوہ پر حملہ کیا اپنے سپہ سالاروں کو پندرہ پندرہ بیس بیس ہزار فوج دیکر اس صوبہ کے مختلف اقطاع میں پھیلا دیا، اور ہر طرف لوٹ مار کر کے محمد خاں کو اسقدر پریشان کیا کہ اسے بہت کچھ مال دیکر ان سے عارضی صلح کرنی پڑی۔ مرہٹوں کو بلطائف الحیل دفع کرنے کے بعد اس نے بادشاہ سے امداد طلب کی اور پیہم عرضیاں بھیجیں اور لکھا کہ اسوقت مالوہ پر شمالی ہند کی حفاظت کا انحصار ہے۔ اگر اس پر مرہٹے قابض ہو گئے تو پھر آگرہ و دھلی کی بھی خیر نہیں ہے۔ اس نے یہاں تک لکھا کہ اگر کسی اور شخص کو بھیجا جائے تو میں اسکے ماتحت کام کرنے کے لئے طیار ہوں۔ لیکن

محمد خاں نے نظام الملک سے اتحاد کرنے کی جو کوشش کی تھی، وہ بادشاہ کے اہلِ دربار اور خصوصاً صمصام الدولہ خاں دوراں کی نگاہ میں اتنی بڑی معصیت تھی کہ اسکے بعد وہ مالوہ کی صوبہ داری پر کسی طرح نہ رکھا جا سکتا تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۱۴۵ھ (سنہ ۱۷۳۲ء) میں محمد خاں مالوہ سے معزول کیا گیا، اور اس کی جگہ صمصام الدولہ کے مشورہ سے مہاراجہ جے سنگھ سوائی والی امبیر جو پہلے سے آگرہ کا صوبہ دار تھا، مالوہ کا بھی صوبہ دار بنا دیا گیا۔

یہ جے سنگھ وہی شخص تھا جسکی بدولت مالوہ میں مرہٹوں کو فروغ نصیب ہوا، جسکی سازشوں سے اس صوبہ کے بڑے بڑے زمیندار مرہٹوں سے مل گئے، اور جسکی تدبیروں سے پے درپے چار صوبہ دار ملک کا انتظام کرنے میں ناکام ہوئے۔ وہ علی الاعلان مغلوں کا دشمن تھا اور انکو نکالنے کے لیے انکے ہر دشمن کی مدد کرنے پر آمادہ تھا۔ اس زمانہ کے تمام مورخین بالاتفاق لکھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے خلاف انتہا درجہ کا تعصب رکھتا تھا، اور مرہٹوں سے اسکی موافقت سیاسی اغراض پر نہیں بلکہ مذہبی جذبہ پر مبنی تھی[1]، جس کو اس نے کبھی چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اس

---

[1] جے سنگھ کے متعلق ابوالفیض لکھتا ہے:-

ز وقتے کہ اسلام در ہند ہست — چنیں راجۂ بد سیر برنخاست
بود ہمتش دزد شب ہمرہاں — کہ در ہند نامے نماند ز دیں
ہماں کافر از غیرت کافری — چو دید از شہنشاہ بے جوہری
طلب کرد کفار را از دکن — کہ گردند دیں را اگر بیخ کن
غنیم لعیں را ز راہ وداد — در اقلیم ہندوستاں راہ داد

نازک موقع پر ایسے خطرناک دشمن کو ملک کی حفاظت کے لئے مامور کرنا، اور دار السلطنت کی شہر پناہ سے لیکر دریائے نربدا تک کا سارا علاقہ اسکے سپرد کردینا بجز اس کے اور کچھ معنی نہ رکھتا تھا کہ سلطنت مغلیہ اب خود ملک ہاتھ سے دینے پر آمادہ تھی۔

بندیل کھنڈ پر مرہٹوں کا تسلط جے سنگھ کے صوبہ دار مالوہ مقرر ہونے کے بعد جو واقعات پیش آئے، انکو بیان کرنے سے پہلے، مختصر طور پر بندیلکھنڈ کے واقعات بھی بیان کردینے ضروری ہیں، تاکہ شمالی ہند کی طرف مرہٹوں کے اقدام کی تاریخی اور جغرافی ترتیب برقرار رہے۔

بندیلکھنڈ میں راجہ چتر سال دنگھا کی شورش ایک مدت سے چلی آرہی تھی۔ ۱۱۳۳ھ (۱۷۲۰ء) میں جب محمد خاں بنگش الہ آباد کا صوبہ دار مقرر ہوا تو اس نے بندیل کھنڈ پر متعدد چڑھائیاں کیں، اور چار سال تک لڑنے کے بعد بندیلوں کی بغاوت کو دبادیا۔ مگر ۱۱۳۷ھ (۱۷۲۴ء) میں جب نظام الملک نے مبارز خاں کو شکست دیکر، شاہی حکومت کے علی الرغم صوبہ دکن پر قبضہ کرلیا، اور بادشاہ نے اپنی فوجی قوت کو مجتمع کرنے کی خاطر، دوسرے امراء کی طرح محمد خاں کو بھی اسکی فوج سمیت دہلی بلالیا، تو بندیلوں کو پھر سر اٹھانے کا موقع مل گیا، اور انھوں نے جھانسی سے لے کر بہار کی سرحدوں تک ایک فتنۂ عظیم برپا کردیا۔ اس تازہ شورش کو فرو کرنے کے لئے ۱۱۴۰ھ (۱۷۲۷ء) میں محمد خاں پھر بھیجا گیا۔ اور اس نے ایک سال کے اندر بندیلوں کو پیہم شکستیں دیکر ان کا

صدر مقام جیت پور[1] فتح کرلیا۔ راجہ چھتر سال اور اسکے لڑکوں نے مجبور ہو کر بادشاہ کی اطاعت قبول کی، جن شاہی علاقوں پر قبضہ کیا تھا، انہیں واپس کیا، اور اپنے ملک میں شاہی تھانے مقرر کرنے پر راضی ہو گئے۔ لیکن دھلی کی درباری سازشیں جو سلطنت کی بیخ کرنے پر تلی ہوئی تھیں، پھر برسرکار آئیں۔ محمد خاں کے دشمنوں نے مشہور کیا کہ وہ تیموری خاندان کا دشمن ہے اور ہندوستان میں پٹھان سلطنت قائم کرنا چاہتا ہے۔ برہان الملک سعادت خاں، صمصام الدولہ خاں دوراں، اور دوسرے ارکان سلطنت نے چھتر سال اور اسکے ساتھیوں کو خطوط لکھ کر انہیں شورش پر آمادہ کیا، اور یقین دلایا کہ شاہی حکومت کی جانب سے انکے مقابلہ میں محمد خاں کی کوئی اعانت نہ کی جائیگی۔ بندیلوں نے اس طرف سے شہ پاکر ۱۱۴۱ھ (۱۷۲۹ء) میں بغاوت کر دی اور مرہٹوں کو جو گردھر بہادر کو قتل کر کے مالوہ پر مسلط ہو چکے تھے، اپنی مدد کے لئے بلا لیا۔ محمد خاں ان واقعات سے بے خبر، بندیلکھنڈ کے پہاڑی علاقوں میں لشکر انداز تھا اور اسکی فوج کا بیشتر حصہ رخصتیں لیکر جا چکا تھا، کہ باجی راؤ پیشوا اور راجہ چھتر سال ۷۰ ہزار فوج کے ساتھ اس پر ٹوٹ پڑے۔ محمد خاں ان سے شکست کھا کر جیت پور کے قلعہ میں پناہ گزیں ہوا۔ اور وہاں سے اس نے بادشاہ اور اس کے ارکان سلطنت کو پیہم عرضیاں

---

[1] صوبہ متحدہ کے ضلع ہمیر پور میں واقع ہے۔

بھیجیں۔ مگر ان کی طرف کوئی توجہ نہ کی گئی۔ بلکہ امداد دینے کے بجائے صمصام الدولہ نے بندیلوں کو لکھا کہ ایک کامیاب افغان سردار سلطنت کے لئے خطرناک ہے۔ اب جبکہ وہ تمھارے قابو میں آگیا ہے، تم اسکو ہرگز نہ چھوڑو۔ اس کا سر بادشاہ کے لئے ایک پسندیدہ تحفہ ہوگا"۔ محمد خاں کے بیٹے قائم خاں نے فیض آباد جاکر برہان الملک سعادت خاں سے مدد مانگی۔ لیکن امداد تو درکنار، وہاں اسکی گرفتاری کا سامان کیا گیا جسکی خبر پاکر اسے بھاگنا پڑا۔ آخر کار جب محمد خاں سب طرف سے مایوس ہوگیا تو اس نے ۱۱۴۲ھ (۱۷۲۹ء) میں بندیلوں سے صلح کرلی اور ان کو یہ اقرار نامہ لکھ دیا کہ آئندہ وہ بندیلکھنڈ پر کبھی فوج کشی نہ کریگا۔

اس کامیابی کے بعد مرہٹوں نے اپنی امداد کے صلہ میں راجہ چھتر سال سے بندیلکھنڈ کا جنوبی مغربی علاقہ حاصل کرلیا، جس کی آمدنی ۳۰ لاکھ روپیہ سے زیادہ تھی[1]۔

قلب سلطنت پر مرہٹوں کی یورشیں

اب ان واقعات کا سلسلہ مکمل ہوچکا ہے جو نربدا کے شمال میں مرہٹوں اور سلطنت مغلیہ کے درمیان ۱۱۴۵ھ (۱۷۳۲ء) تک پیش آئے۔ ان کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطنت ہند کے معاملات سے نظام الملک کی دست کشی، اور بادشاہ سے انکی ناچاقی کا نتیجہ یہ ہوا

---

[1] اسکے دو سال بعد راجہ چھتر سال مرگیا اور اسکی ریاست اسکے دو بیٹوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک کو پنا کا علاقہ ملا اور دوسرے کو جیت پور کا۔

کہ صرف ۸ سال کی مدت میں مرہٹے گجرات میں سلطنت کے شریک غالب بن گئے، مالوہ کے بیشتر حصوں پر عملاً ان کا قبضہ ہو گیا، بندیلکھنڈ کا ایک حصہ انکی حکومت میں شامل ہو گیا، اور اب انکے قدم آگرہ اور دہلی کی طرف بڑھنے لگے۔ ایک طرف مرہٹوں کی دست درازیاں اس شدت کے ساتھ بڑھتی چلی جا رہی تھیں، اور دوسری طرف سلطنت کے کارفرما کا یہ حال تھا کہ جب دکن، گجرات، اور مالوہ سے وحشت انگیز خبریں آتیں تو اسکے خوشامدی مصاحب اس کا دل بہلانے کے لئے اسے دہلی کے باہر باغوں اور شکارگاہوں میں لیجاتے اور ہفتوں اسکو سیر و شکار میں مشغول رکھتے تاکہ ان منحوس خبروں سے خاطر نازک پر میل نہ آجائے۔ اس کا وزیر بھی اپنی تشویش رفع کرنے کے لئے دارالسلطنت سے باہر نکل جاتا تھا، اور مہینہ مہینہ بھر سیر و تفریح سے اپنی پراگندہ بالی کا علاج کرتا رہتا تھا۔ اس دوران میں سلطنت کے سب کام ملتوی رہتے تھے، اور جو قیمتی وقت ملک کی حفاظت میں صرف ہونا چاہیے تھا وہ اسطرح ضائع کر دیا جاتا تھا۔

اس زیاں کاری سے ملک کی تباہی میں جو کسر باقی رہ گئی تھی وہ جے سنگھ جیسے الدّ الخصام کو آگرہ اور مالوہ کی صوبہ داری پر مامور کرکے پوری کر دی گئی۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، یہ صوبہ دار مرہٹوں کا دلی دوست اور سرگرم معاون تھا۔ باوجودیکہ اس نے سلطنت کے خرچ پر ۳۰ ہزار سوار اور اس سے زیادہ پیدل فوج رکھ چھوڑی تھی، لیکن مالوہ کی حکومت پر مقرر

ہونے کے بعد اس نے مرہٹوں کی دست برد کو روکنے کی کوئی کوشش نہ کی، بلکہ ان کو شمالی ہند کی طرف اور زیادہ بڑھ جانے کے لئے راستہ دے دیا۔ کچھ زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ مرہٹوں کے غارت گر دستے لوٹتے مارتے آگرہ کے نواح تک پہنچ گئے، اور دہلی انکی زد سے کچھ زیادہ دور نہ رہا۔ اب بادشاہ کی آنکھیں کھلیں، اور وہ خود مرہٹوں کے مقابلہ کے لئے دہلی سے نکلا، مگر فرید آباد سے آگے نہ بڑھا۔ آخر کار قمر الدین خاں وزیر الممالک نے جنگ پر جانے کی درخواست کی۔ اور وہ شوال ۱۱۴۵ھ (اپریل ۱۷۳۳ء) میں غازی الدین خاں فیروز جنگ[1] اور عظیم اللہ خاں ظہیر الدولہ[2] کو ساتھ لیکر آگرہ کی طرف گیا۔ لیکن چند مہینے بعد کچھ کئے بغیر واپس آگیا۔ دوسرے سال مرہٹوں نے پھر حملہ کیا اور گوالیار سے لیکر اجمیر تک پھیل گئے اور آگرہ کے نواحی میں فتنہ عظیم برپا کیا۔ اس مرتبہ صمصام الدولہ خان دوران بہادر کو جنگ پر جانے کا حکم دیا گیا لیکن انہوں نے کئی مہینے گومگو میں صرف کر دیے۔ اور ۱۱۴۶ھ کے اواخر اوائل ۱۷۳۴ء میں اسوقت دہلی سے نکلا جبکہ بارش کی آمد قریب تھی اور حسب معمول مرہٹے اپنے گھروں کی طرف واپس جا رہے تھے۔ اس طرح یہ سال بھی کسی دفاعی کارروائی کے بغیر ضائع کر دیا گیا۔

۱۱۴۷ھ (اواخر ۱۷۳۴ء) میں مرہٹوں نے اور زیادہ شدید حملہ

---

[1] نظام الملک کے فرزند اکبر اور قمر الدین خاں وزیر الممالک کے داماد۔

[2] قمر الدین خاں کے برادر عم زاد۔

کیا۔ اور اسکی مدافعت کے لیئے بادشاہ نے وزیر الممالک قمر الدین خاں اور میر بخشی صمصام الدولہ کو بھیجا۔ مقدم الذکر کے لیئے آگرہ کا محاذ مقرر کیا گیا جدھر خود باجی راؤ حملہ آور ہوا تھا، اور موخر الذکر کو اجمیر کی طرف جانے کا حکم دیا گیا جہاں ملہار راؤ ہولکر غارت گری کر رہا تھا۔ اس نقشہ کے مطابق قمر الدین خاں آگرہ کی طرف سے مالوہ پر بڑھا اور نرور کے علاقہ میں باجی راؤ سے چند لڑائیاں ہوئیں مگر کوئی فیصلہ کن جنگ نہیں ہوئی، یہاں تک کہ برسات کا موسم آگیا، اور باجی راؤ دکن واپس چلا گیا۔ اجمیر کی جانب صمصام الدولہ اور جے سنگھ مل کر ملہار راؤ ہولکر کے مقابلہ میں بڑھے۔ لیکن قبل اسکے کہ کوئی جنگ ہو اجے سنگھ نے صمصام الدولہ کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ ہولکر سے سمجھوتہ کر لے۔ چنانچہ اس نے صوبہ مالوہ سے ۲۲ لاکھ روپیہ چوتھ کے طور پر مرہٹوں کو دینا منظور کر لیا، اور اجین میں پیشوا کا وکیل مقرر ہو گیا۔ یہ سمجھوتہ بادشاہ کی اجازت کے بغیر میر بخشی نے خود اپنے اختیار سے کر لیا۔

۱۱۴۸ھ (۱۷۳۵ء) میں مرہٹوں نے ایک طرف اودے پور، ناگور[1]، اور اجمیر پر اور دوسری طرف بندیلکھنڈ کے راستے دوآبہ کے علاقہ پر حملہ کیا۔ شاہی حکومت کی طرف سے صمصام الدولہ اجمیر کی طرف بھیجا گیا، اور قمر الدین خاں دوآبہ کی طرف۔ محمد خاں بنگش اور برہان الملک سعادت خاں کو حکم دیا گیا کہ مدافعت میں وزیر کے

---

[1] جودھپور کے علاقہ میں۔

ساتھ مل کر کام کریں۔ لیکن اس مرتبہ بھی مرہٹوں کی دست درازیوں کا سد باب نہ ہو سکا۔ سال کے اختتام پر (۱۷۳۶ء کے آغاز میں) باجی راؤ نے راجہ جے سنگھ کے توسط سے درخواست کی کہ مالوہ اور گجرات میں چوتھ اور سردیسمکھی وصول کرنے کا حق بادشاہ کی جانب سے باضابطہ تسلیم کر لیا جائے۔ جے سنگھ اور صمصام الدولہ نے اسکی تائید میں پر زور سفارش کی، اور انکے اثر سے محمد شاہ اس بات پر راضی ہو گیا کہ آیندہ فصل میں جنوب چنبل کے اضلاع سے باجی راؤ کو ۱۳ لاکھ روپیہ ادا کرے۔ نیز اسکو کوٹہ، بوندی وغیرہ راجپوت ریاستوں سے .... ۱۰۶ روپیہ بطور خراج وصول کرنے کا حق دیا۔ اس دوسری شرط کا مقصود یہ تھا کہ راجپوتوں اور مرہٹوں کے درمیان عداوت پیدا کر دی جائے۔ خان دوران نے ان شرائط کے مطابق باجی راؤ سے گفتگو کرنے کے لئے اپنے وکیل یادگار خاں کشمیری، کرپا رام اور نجابت علی خاں کو روانہ کیا، اور انہیں خفیہ طور پر چوتھ اور سردیسمکھی کی سند بھی لکھوا کر دیدی، تاکہ سمجھوتہ ہونے کے بعد وہ پیشوا کے حوالہ کر دی جائے۔ لیکن باجی راؤ کے وکیل ڈھونڈو پنت پورندھری کو جو دہلی میں رہتا تھا، اس تمام خفیہ کارروائی کا حال معلوم ہو گیا، اور اس نے باجی راؤ کو لکھ بھیجا۔ باجی راؤ نے اس سے سمجھ لیا کہ بادشاہ اور اسکے ارکان سلطنت بہت زیادہ مرعوب ہو چکے ہیں، اور خود دب کر صلح کرنا چاہتے ہیں، اس لئے اس نے اپنے مطالبات اور زیادہ بڑھا دیے۔ ۸ ربیع الاول ۱۱۴۹ھ (۱۶ جولائی ۱۷۳۶ء) کو دھولپور میں مجلس صلح منعقد ہوئی، جسمیں شاہی

حکومت کی طرف سے یادگار خاں اور جے سنگھ، اور مرہٹوں کی طرف سے خود باجی راؤ شریک تھا۔ باجی راؤ نے اس کانفرنس میں جو مطالبات پیش کئے، ان کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) پورا صوبۂ مالوہ اسکو جاگیر میں دیدیا جائے، اور جن جن علاقوں پر روہیلے متصرف ہیں (مثلاً بھوپال) وہاں سے ان کو بے دخل کردیا جائے۔

(۲) مانڈو، دھار، اور رائے سین کے قلعے حوالہ کئے جائیں۔

(۳) چنبل کے جنوب کے پورے علاقہ میں جاگیر اور فوجداری کے اختیارات عطا کئے جائیں۔

(۴) شاہی خزانہ سے ۵۰ لاکھ روپیہ دیا جائے، ورنہ اتنی ہی آمدنی کا علاقہ بنگال، الہ آباد، بنارس، گیا، اور متھرا کے اضلاع میں بطور جاگیر دے دیا جائے۔

(۵) شش صوبۂ دکن میں سردیشپانڈیہ گری[1] کا حق تسلیم کیا جائے۔

محمد شاہ نے ابتدائی چار مطالبات کو رد کردیا۔ اور صرف آخری مطالبہ کو چھ لاکھ روپیہ کا نذرانہ لیکر قبول کرلیا۔ اس سے دراصل نظام الملک پر ایک ضرب لگانی مقصود تھی۔ وہ مرہٹوں

---

[1] سردیشپانڈیہ گری کا حق کل آمدنی کا ۵ فی صدی ہوتا ہے۔ مرہٹوں کو دکن میں ۲۵ فی صدی چوتھ اور ۱۰ فی صدی سردیسمکھی کا حق پہلے سے تھا۔ اب انھوں نے ۵ فی صدی کا اور مطالبہ کیا۔

کے ساتھ سمجھوتہ کرکے جس اطمینان سے دکن میں بیٹھے ہوئے شمالی ہند کی دار و گیر کا تماشہ دیکھ رہے تھے، اسکو ختم کرنے، اور انکو پھر مرہٹوں کے مقابلہ میں لے آنے کی اس کے سوا کوئی اور صورت نہ ہو سکتی تھی کہ دونوں کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکرا دئے جائیں، اور نظام الملک کو اس امر کا یقین دلا دیا جائے کہ اگر مرکزی حکومت پر مرہٹوں کا اثر قائم ہو گیا تو دکن کا رئیس بھی اس کی مضرت سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، محمد شاہ اور اسکے ارکان سلطنت کی یہ چال پوری طرح کامیاب ہوئی۔

دھولپور کی کانفرنس میں باجی راؤ اپنے مطالبات تسلیم نہ کرا سکا۔ لیکن جے سنگھ مرہٹوں کی حمایت پر تلا ہوا تھا۔ اس نے باجی راؤ کو اپنے اختیار سے مالوہ میں اپنا نائب مقرر کر دیا، اور اس سے یہ رسمی اقرار نامہ لکھوا لیا کہ آئندہ وہ شاہی علاقوں میں شورش برپا نہ کرینگے۔ اس طرح شاہی حکومت کو دوہرا نقصان پہنچا۔ مالوہ کا صوبہ بھی عملاً ہاتھ سے نکل گیا، اور صلح بھی نہ ہوئی، جس کی اسوقت سخت ضرورت تھی۔

کانفرنس کی ناکامی کے بعد مرہٹوں نے ایک زبردست حملے کی طیاری کی، اور ذوالقعدہ ۱۱۴۹ھ (مارچ ۱۷۳۷ء) میں ان کے دل بادل دوآبہ کے علاقہ پر ٹوٹ پڑے۔ بادشاہ نے انکے مقابلہ کے لئے قمر الدین خاں اور صمصام الدولہ کو کثیر فوج کے ساتھ بھیجا۔ اور دوسری طرف سے اودھ کا صوبہ دار سعادت خاں ان کو دوآبہ سے مارتا بھگاتا آگرہ پر صمصام الدولہ سے آملا۔ یہاں یہ دونوں

اس انتظار میں ٹھیر گئے کہ قمر الدین خاں کے ساتھ مل کر باجی راؤ پر حملہ کریں جو اسوقت گوالیار کے قریب مقیم تھا۔ لیکن باجی راؤ اس مرتبہ اپنے انتہائی مطالبات منوانے کے لئے ایک ایسی کارروائی کرنا چاہتا تھا جس سے بادشاہ خوف زدہ ہو جائے اور تمام ہندوستان پر مرہٹوں کی دھاک بیٹھ جائے۔ چنانچہ وہ ان آرام طلب امیروں کو ضیافتوں میں مشغول چھوڑ کر ایک دوسرے راستے سے سیدھا دھلی کی طرف بڑھا، اور ذوالحج کی نویں تاریخ کو اچانک دارالسلطنت کے سامنے نمودار ہو گیا۔ اس غیر متوقع حملہ کا وہی اثر ہوا جو باجی راؤ پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اگرچہ اسوقت شہر میں دس بارہ ہزار سوار اور ٢٠ ہزار پیادہ فوج موجود تھی، جو مرہٹہ فوج کے مقابلہ میں کسی طرح کم نہ تھی۔ سامان جنگ بھی کافی تھا۔ خورد و نوش کے سامان کی بھی کمی نہ تھی۔ اور شہر پناہ بھی اتنی مضبوط ضرور تھی کہ توپوں اور قلعہ شکن آلات کے بغیر مرہٹے اسکو مسخر نہ کر سکتے تھے۔ علاوہ بریں دھلی سے تھوڑے ہی فاصلہ پر وزیر، امیر بخشی، اور صوبہ دار اودھ کثیر التعداد فوجوں کے ساتھ موجود تھے، اور اس صورت میں محاصرہ چند روز سے زیادہ نہ رہ سکتا تھا۔ مگر اسوقت اصلی کمی ظاہری وسائل کی نہ تھی بلکہ باطنی خصائل کی تھی۔ بادشاہ سے لیکر سلطنت کے ادنی کارپردازوں تک سب جرأت، تدبر اور عقل و فکر سے عاری تھے۔ ان کو بدحواس کرنے کے لئے صرف یہ خیال کافی تھا کہ جو دشمن متعدد شاہی فوجوں کے درمیان سے چیرتا پھاڑتا عین دارالسلطنت کے سامنے آن پہنچا ہے، وہ

بالیقین ایک بے پناہ دشمن ہے۔ اس حالت میں وہ صرف ایک ہی تدبیر سوچ سکتے تھے، اور وہ یہ تھی کہ اپنی جانیں بچا کر جمنا کے رستے بھاگ نکلیں۔ لیکن سعد اللہ خاں میر آتش نے جو نظام الملک کے ساتھ دکن کی مہمات میں کام کر چکا تھا، ان کی ہمت بندھائی، اور اسکے مشورے سے ایک فوج مارا مار مرتب کر کے امیر خاں عمدۃ الملک کے زیر قیادت باجی راؤ کے مقابلہ میں بھیجی گئی۔ اس فوج میں بہت سے ایسے نوجوان سردار بھی تھے جو بہادری و سپہ گری کا غرور تو بہت رکھتے تھے، مگر فن جنگ کی ابجد سے بھی ناواقف تھے۔ انھوں نے امیر خاں کے احکام کی اطاعت نہ کی، جلد بازی سے کام لیکر مرہٹوں سے بے تحاشا جا بھڑے، اور تھوڑی سی زد و خورد کے بعد اس طرح بدحواس ہو کر بھاگے کہ باقی فوج کے بھی پاؤں اکھڑ گئے۔ اس شکست سے شہر اور قلعہ معلی میں انتہا درجہ کی سراسیمگی پھیل گئی، اور بادشاہ سے لیکر امراء و عمائد شہر تک سب نے نکل بھاگنے کا ارادہ کر لیا۔ مگر عین وقت پر مرہٹوں کے حملہ کی خبر سنکر قمر الدین خاں لمبے لمبے دھاوے مارتا ہوا آ پہنچا اور اسکے آتے ہی باجی راؤ راجپوتانہ کی طرف چل دیا۔

یہ واقعہ ایسا تھا جس نے بادشاہ اور اسکے مشیروں کے ہوش درست کر دیے۔ اب انھوں نے محسوس کیا کہ مرہٹوں کی شورش اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ اس کا سد باب انکے بس کا نہیں ہے، اور اگر اسوقت اس کا سد باب نہ ہوا تو صرف سلطنت ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ انکی جان، مال اور آبرو بھی محفوظ نہیں رہ سکتی۔

اس خوف اور پریشانی کی حالت میں انھوں نے ہر طرف نگاہ دوڑائی، مگر تمام ملک میں نظام الملک کے سوا کوئی شخص ایسا نظر نہ آیا جو سلطنت کو مرہٹوں کے سیلاب سے بچا سکتا ہو۔ آخرکار تمام اہل دربار نے جن میں نظام الملک کا سب سے بڑا مخالف صمصام الدولہ بھی شامل تھا، بادشاہ کو مشورہ دیا کہ وہ صوبہ دار دکن کی طلب کا فرمان بھیجے، اور عنان اقتدار پھر اس کے سپرد کر دے۔

۳۔ نظام الملک دھلی میں

نظام الملک نے چھ سال قبل مرہٹوں سے جو سمجھوتہ کیا تھا، اس سے انکی غرض صرف یہ تھی کہ دکن میں انکو چند سال کے لئے امن نصیب ہو جائے، اور وہ سکون و اطمینان کی فضا میں اُس شدید ابتری و بدنظمی کی اصلاح کر سکیں جو ستّر اسّی برس کی پیہم بدامنی سے دکن کے صوبوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ غرض اس سمجھوتہ سے ان کو حاصل ہو گئی۔ چھ برس کی یہ پوری مدت انھوں نے نظام حکومت کی اصلاح اور امور مملکت کے ضبط و ربط میں صرف کی۔ یہی زمانہ ہے جسمیں انھوں نے مرہٹوں کی سرحد سے متصل علاقوں کے متعدد شہروں کو مستحکم کیا۔ اطراف و نواحی کے سرکش زمینداروں کو مطیع کر کے انسے خراج اور مالگذاری کے متعلق ایسے معاملات طے کئے جو حکومت کے ساتھ انکے تعلقات کو پائیدار کرنے والے تھے۔ دور افتادہ ممالک کے فوجداروں اور عاملوں پر مرکزی حکومت کا اقتدار از سر نو قائم کیا۔ حکومت کے محکموں کی از سر نو تنظیم کی ضوابط و قوانین

نافذ کئے۔ عدالت کوتوالی اور دیوانی و مال کے بگڑے ہوئے نظام کو پھر درست کیا۔ دکن کے مختلف اقطاع میں اپنے امرائے فوج کو جاگیریں دیں اور انکی مدد سے اپنی فوجی طاقت کو اسقدر ترقی دیدی کہ بوقت ضرورت وہ ۳ لاکھ فوج میدان جنگ میں اتار سکتے تھے۔ غرض اسی چھ سال کی مدت میں انھوں نے نظام حکومت کا وہ ڈھانچہ طیار کیا، جو سالار جنگ اعظم کے عہد تک برابر قائم رہا، اور بہت سی ترمیم و اصلاح کے ساتھ ابتک قائم ہے۔

اس تعمیری کام کی تکمیل کے لئے انکو امن و اطمینان کے مزید چند سال درکار تھے، کیونکہ ابھی تک کرناٹک کے علاقوں پر ان کی حکومت کی گرفت کافی مضبوط نہیں ہوئی تھی۔ لیکن شمالی ہند کے سیاسی تغیرات نے انکو مجبور کردیا کہ وہ اپنی توجہ اورنگ آباد سے ہٹاکر دہلی کی طرف مبذول کریں۔ مرہٹوں کے سیلاب میں سلطنت مغلیہ کا قصر انکی توقع سے بھی زیادہ سرعت کے ساتھ متزلزل ہوگیا، دکن کے برگی چند سال کے اندر گجرات، مالوہ، راجپوتانہ، اجمیر، آگرہ، اور الہ آباد کے صوبوں پر چھاگئے، اور دارالسلطنت پر حملہ کرکے انھوں نے نہ صرف یہ کہ بادشاہ اور اسکے ارکان سلطنت کو مرعوب کردیا، بلکہ تمام ہندوستان پر اپنی قوت کی دھاک بٹھادی۔ حالات کے اس نوبت پر پہنچ جانے کے بعد نظام الملک کے لئے خاموش رہنا خودکشی کا ہم معنی تھا۔ کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مرہٹے مرکزی حکومت پر مسلط ہوجاتے، ہندوستان کا ایک بڑا حصہ انکے قبضہ میں آجاتا، اور پھر وہ ایک بالادست طاقت کی حیثیت

سے دکن کے رئیس کو اپنا تابع فرمان بنانے کی کوشش کرتے، حالانکہ ابتک آئینِ سلطنت کے مطابق صوبہ دارِ دکن خود راجہ ساہو پر بالادستی کے اختیارات رکھتا تھا۔ علاوہ بریں باجی راؤ نے اب اس سمجھوتہ کو بھی توڑ دیا تھا جو چھ سال قبل اسکے اور نظام الملک کے درمیان ہوا تھا۔ اس نے بادشاہ پر دباؤ ڈال کر شش صوبہ دکن میں سردیشپانڈیہ گری کی سند حاصل کر لی تھی، جو نہ صرف اس سمجھوتہ کی خلاف ورزی تھی، بلکہ اس بات کی دلیل بھی تھی کہ بادشاہ کو مغلوب کرنے کے بعد مرہٹے پہلے سے بھی زیادہ قوی ہو کر دکن پر اپنا دستِ تعدی دراز کرینگے۔

یہ اسباب تھے جن کی بنا پر بادشاہ کا فرمانِ طلب پہنچتے ہی نظام الملک دھلی جانے کے لئے طیار ہو گئے۔ دکن میں انھوں نے اپنے دوسرے بیٹے نظام الدولہ ناصر جنگ کو نائب مقرر کیا۔ ۱۷ر ذی الحج ۱۱۴۹ھ (۱۷ر اپریل ۱۷۳۷ء) کو برھانپور سے روانہ ہوئے، اور ۱۵ر ربیع الاول ۱۱۵۰ھ (۱۲ر جولائی ۱۷۳۷ء) کو دھلی پہنچ گئے۔ شاہی حکومت کی جانب سے انکا ایسا استقبال ہوا جو اس سے پہلے کبھی کسی صوبہ دار کا نہ ہوا تھا۔ وزیر الممالک قمر الدین خاں ان کو لینے کے لئے دھلی سے ۵۵ میل تک آیا۔ راستے میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد بادشاہ کی جانب سے خواجہ سرا اور خواص تحفے لیکر آتے، مزاج پرسی کرتے، اور بادشاہ کا اشتیاق ملاقات ظاہر کرتے۔ ان کے لئے صدیوں کا مقررہ آئین توڑا گیا، اور خاص طور پر حکم دیا گیا کہ انکی سواری دار السلطنت میں نوبت و نقارہ کے ساتھ

داخل ہو۔ حالانکہ جہاں بادشاہ مقیم ہو، وہاں ۳ میل کے اندر کسی امیر کی نوبت نہیں بج سکتی تھی۔ جب وہ دلی میں داخل ہوئے تو ان کی سواری دیکھنے کے لئے سارا شہر امنڈ آیا، اور ہر طرف ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ گئے۔ دیوان خاص میں بادشاہ نے شرف ملازمت بخشا اور خلعت میں چارقب عنایت کیا جو اسوقت تک صرف تیموری نسل کے شاہزادوں کے لئے مخصوص تھا۔ اس غیر معمولی استقبال سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اسوقت بادشاہ سے لیکر شہر کے ادنی باشندے تک سب اس امر کو محسوس کر رہے تھے کہ تمام ملک میں صرف یہی ایک شخص ہے جو سلطنت کو تباہی سے بچا سکتا ہے۔

ایک مہینہ بعد ۱۷؍ ربیع الثانی (۱۳؍ اگست) کو بادشاہ نے راجہ جے سنگھ اور باجی راؤ مرہٹہ کو صوبہ آگرہ اور صوبہ مالوہ سے معزول کر کے نظام الملک کے بڑے بیٹے غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ کو ان دونوں صوبوں کا والی مقرر کیا، اور اس تقرر کے ساتھ یہ شرط لگا دی کہ نظام الملک خود جا کر مرہٹوں کو مالوہ سے نکال دیں۔ اس زمانہ میں نادر شاہ والی ایران قندھار کا محاصرہ کئے پڑا تھا، اسکے سفرا دہلی میں مقیم تھے، اور تمام آثار سے نمایاں ہو رہا تھا کہ تسخیر قندھار کے بعد کابل، اور پھر پنجاب کی باری آنے والی ہے۔ نظام الملک نے بادشاہ کو اس بزرگ تر خطرے کی طرف توجہ دلائی، اور اس سے کہا کہ مرہٹوں کے فتنہ کو فرو کرنے کے لئے تو میرے چند آزمودہ کار امیر کافی ہیں، وہ مناسب طریقہ سے اس کا سد باب کر دینگے، لیکن اسوقت مرہٹوں سے زیادہ بڑا خطرہ نادر شاہ

کہا ہے۔ اسکے لئے بہترین تدبیر یہ ہے کہ فوج اور سامان جنگ فراہم کر کے آپ خود افغانستان کی طرف روانہ ہوں، اور مجھے آگے بھیج دیں تاکہ میں غزنی میں بیٹھ کر شاہ ایران کی نقل و حرکت پر نظر رکھوں۔ مگر محمد شاہ مرہٹوں سے اتنا خوف زدہ ہو چکا تھا کہ وہ یہ خیال ہی نہیں کر سکتا تھا کہ ان سے زیادہ خطرناک بھی کوئی قوت ہو سکتی ہے۔ اس نے کہا کہ سرحد افغانستان کے پہاڑی دروں سے گذرنا اور جنگجو افغان قبائل سے عہدہ برآ ہو کر ہندوستان پہنچنا نادر شاہ کے لئے آسان نہیں ہے۔ لہذا تم ادھر سے بے فکر ہو کر مالوہ کا رخ کرو، اور اپنی تمام توجہ مرہٹوں کی شورش فرو کرنے میں صرف کر دو۔

بہر حال حکم شاہی کے مطابق نظام الملک دھلی سے ۳۰ ہزار فوج، اور ایک زبردست توپخانہ، جو اس وقت ہندوستان میں سب سے بہتر شمار ہوتا تھا، لیکر روانہ ہوئے۔ آگرہ میں اپنے ماموں زاد بھائی محی الدین قلی خاں کو نائب صوبہ دار مقرر کیا۔ وہاں سے اٹاوہ، مکھن پور، کالپی، اور بندیلکھنڈ ہوتے ہوئے بھوپال[1] پہنچ گئے۔ دھلی سے انھوں نے ناصر جنگ کو تاکیدی احکام بھیجے تھے کہ وہ باجی راؤ کو دکن سے نکلنے کا موقع نہ دیں۔ لیکن اس کوشش میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اور باجی راؤ ۸۰ ہزار فوج لیکر نربدا اتر آیا۔ شعبان ۱۱۵۰ھ (دسمبر ۱۷۳۷ء) میں جب باجی راؤ نظام الملک کے مقابلہ پر پہنچا تو انھوں نے بھوپال کے قلعہ میں اور اس کے قریب

---

[1] اس زمانہ میں بھوپال کا رئیس یار محمد خاں بن دوست محمد خاں تھا۔

کی پہاڑیوں پر ایک مستحکم پوزیشن اختیار کرلی جسکے ایک جانب تالاب ہے۔ اور دوسرے جانب ایک نالہ بہتا ہے۔ اسوقت انکی فوج بندیلکھنڈ اور راجپوتانہ کے سرداروں کی جمعیتیں ملاکر ۸۰ ہزار کے قریب تھی۔ مرہٹے حسب معمول چاروں طرف بھیل گئے اور انھوں نے غارت گری کرکے نظام الملک کی فوج میں رسد اور چارہ کا قحط برپا کردیا۔ سعادت خاں صوبہ دار اودھ کے داماد اور بھانجے ابو المنصور خاں صفدر جنگ اور کوٹہ کے راجہ نے انکو مدد پہنچانے کی کوشش کی، لیکن ملہار راؤ ہولکر اور جسونت راؤ پوار نے انہیں شکست دیکر پسپا کردیا۔ نظام الملک نے امداد کے لئے دھلی اور اورنگ آباد کی طرف قاصد بھیجے۔ مگر دھلی سے کوئی امداد نہ بھیجی گئی، کیونکہ صمصام الدولہ کا جذبۂ حسد اب پھر صوبہ دار دکن کے خلاف بھڑک اٹھا تھا۔ رہا اورنگ آباد، تو وہاں ناصر جنگ نے بعجلت ایک فوج مہیا کرکے اپنے والد کو امداد بھیجنے کی طیاری کی۔ لیکن دریائے تپتی پر باجی راؤ کے بھائی جمنا جی آپا نے ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ اسلئے ادھر سے بھی کوئی مدد نہ پہنچ سکی۔ خود نظام الملک کی فوج میں راجپوت سردار غدر پر آمادہ تھے، اور انکو صرف اس چیز نے روک رکھا تھا کہ نظام الملک نے ان کا سامان اپنے پاس قلعہ میں رکھ چھوڑا تھا۔ قحط اور چارہ کی قلت کا یہ حال تھا کہ روپیہ کا ایک سیر غلہ مل رہا تھا، اور جانور بھوکوں مر رہے تھے۔ آخر اس محاصرہ کی حالت سے تنگ آکر نظام الملک قلعے سے نکلے بھاری سامان بھوپال اور اسلام گڑھ میں چھوڑا اور فوج کو توپوں

کی حفاظت میں لیکر دھلی کی جانب روانہ ہوئے۔ مرہٹے ہر طرف سے ھجوم کر کرکے آتے تھے، مگر توپخانہ کی آتش باری انکو قریب نہ پھٹکنے دیتی تھی۔ اسطرح لڑتے بھڑتے، تین میں روزانہ کی رفتار سے نظام الملک آگے بڑھتے رہے، یہاں تک کہ دوراھہ پہنچ گئے جو سرونج سے ۶۴ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اب محاصرہ کی حالت ختم ہو چکی تھی۔ لیکن مرہٹوں کی غارتگری اور رسد و چارہ کی قلت نے نوبت اس حد کو پہنچادی تھی کہ فوج کے لیے نقل و حرکت مشکل تھی۔ اس حالت میں نظام الملک کے لیے بجز اسکے چارہ نہ تھا کہ دو صورتوں میں سے ایک صورت اختیار کریں۔ یا ایک فیصلہ کن جنگ، یا اعتراف شکست کے ساتھ صلح۔ فوج کی معنوی اور جسمانی کمزوری کو دیکھتے ہوئے پہلی صورت ممکن نہ تھی۔ اسلیے انھوں نے دوسری صورت کو ترجیح دی، اور ۲۶ رمضان ۱۱۵۰ھ (۱۶ جنوری ۱۷۳۸ء) کو دوراھہ میں باجی راؤ سے صلح کرلی۔ اس صلحنامہ میں انھوں نے باجی راؤ سے وعدہ کیا کہ وہ اسکو چنبل اور نربدا کے درمیان کا پورا علاقہ بادشاہ سے دلوا دینگے، اور مصارف جنگ کے عوض ۵۰ لاکھ روپیہ نقد بھی دلوانے کی کوشش کرینگے۔ اس طرح جنگ ختم ہو گئی اور ذی الحجہ ۱۱۵۰ھ (اپریل ۱۷۳۸ء) میں نظام الملک دھلی واپس پہنچ گئے۔

نادر شاہ کا حملہ نظام الملک کی واپسی کے بعد ہی وہ طوفان ہندوستان پر امنڈ آیا، جس کا خطرہ انھوں نے مالوہ کی مہم پر جانے سے پہلے ہی ظاہر کر دیا تھا۔ یہ نادر شاہ فرمانروائے ایران

کے حملہ کا خطرہ تھا۔ اس مشہور فاتح نے ۱۱۴۸ھ (۱۷۳۶ء) میں صفوی خاندان سے ایران کا تخت چھیننے کے بعد سب سے پہلے جس چیز کی طرف توجہ کی تھی وہ قندھار کے غلزئیوں کی سرکوبی تھی، کیونکہ انھوں نے چند سال قبل نہ صرف جنوبی افغانستان کا پورا علاقہ سلطنت ایران سے چھین لیا تھا، بلکہ خود ایران پر حملہ کرکے صفوی خاندان کی بنیادیں ہلا ڈالی تھیں۔ ۱۱۴۹ھ (۱۷۳۷ء) میں اس نے ۸۰ ہزار فوج کے ساتھ قندھار پر حملہ کیا، اور ساتھ ہی محمد شاہ کو پیغام بھیجا کہ آپ صوبہ کابل کے حکام کو احکام دیدیجئے کہ وہ قندھار کے افغانوں کو اپنے علاقہ میں پناہ نہ لینے دیں، جواب میں محمد شاہ نے اس سے وعدہ کرلیا کہ ہم تمھارے باغیوں کو اپنے ہاں پناہ نہ دینگے۔ مگر جب نادر شاہ قندھار پر حملہ آور ہوا، اور افاغنہ اس سے شکست کھا کر بھاگے تو سلطنت مغلیہ کی سرحد پر کسی نے ان کا راستہ نہ روکا اور غزنی وکابل کے علاقہ میں ان کو پناہ لینے کا موقع دیدیا گیا۔ اس پر نادر شاہ نے محرم ۱۱۵۰ھ (مئی ۱۷۳۷ء) میں پھر ایک سفیر دھلی بھیجا اور اسکو حکم دیا کہ ۴۰ دن کے اندر محمد شاہ سے اس خلاف ورزی عہد کی بابت جواب لیکر آئے۔ لیکن محمد شاہ ایک سال تک اس کو ٹالتا رہا، اور پیہم تقاضوں کے باوجود اسے دھلی کے دربار سے کوئی جواب نہ ملا۔ نظام الملک جس زمانہ میں دکن سے دھلی پہنچے تھے، اسوقت یہ سفیر جواب کے لئے دربار میں تقاضا کررہا تھا، اور نادر شاہ قندھار کے محاصرہ اور غلزئیوں کی سرکوبی

میں پوری شدت کے ساتھ مشغول تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، نظام الملک نے اس حالت کو دیکھ کر ابتدا ہی میں سمجھ لیا تھا کہ قندھار کی فتح کے بعد فراریوں کے تعاقب کا بہانہ کر کے نادر شاہ کابل و غزنی کے علاقہ میں گھس آئیگا، اور سلطنت مغلیہ کو کمزور پا کر پھر ہندوستان کا رخ کریگا۔ اسی بنا پر انھوں نے مشورہ دیا تھا کہ مرہٹوں سے پہلے نادر شاہ کے مقابلہ کی طیاری کرنی ضروری ہے۔ مگر اس وقت انکے مشورہ کو رد کر دیا گیا۔ آخر کار ذی القعدہ ۱۱۵۰ھ (مارچ ۱۷۳۸ء) میں قندھار فتح ہو گیا، اور اسکے بعد ہی نادر شاہ نے اپنے سفیر کو حکم بھیجدیا کہ خواہ جواب ملے یا نہ ملے تم واپس آجاؤ۔ سفیر کا واپس بلانا گویا نادر کی جانب سے اعلان جنگ تھا۔ چنانچہ محرم ۱۱۵۱ھ (مئی ۱۷۳۸ء) میں نادر شاہ نے مغل افغانستان (غزنی و کابل) پر حملہ کر دیا۔

ایک نظر اس دفاعی قوت پر بھی ڈال لیجئے جس کے بھروسہ پر محمد شاہ نے نادری خطرہ کو ہیچ سمجھ رکھا تھا۔ محمد شاہ کے ابتدائی عہد سے کابل کا صوبہ دار ناصر خاں تھا، جسکو دربار شاہی میں ظفر خاں روشن الدولہ کے ساتھ توسل حاصل تھا۔ افغانستان کے دفاعی انتظامات، سرحدی اور کوہستانی راستوں کی حفاظت، اور قبائل کے وظائف کے لئے جسقدر رقم خزانۂ شاہی سے مقرر تھی، وہ روشن الدولہ ہی کی معرفت بھیجی جاتی تھی۔ بعد میں جب بادشاہ پر صمصام الدولہ کا رسوخ زیادہ ہوا تو اس نے روشن الدولہ کا استیصال کرنے کے لئے منجملہ اور الزامات کے ایک الزام یہ بھی لگایا کہ وہ کابل کی رقم میں غبن کرتا ہے چنانچہ اسکے اغوا سے محمد شاہ نے یہ رقم بھیجنی بند کر دی۔

ناصر خاں نے اس پر پیہم احتجاج کئے، اور اس رقم کے بغیر افغانستان کی حفاظت سے اپنی معذوری کا اظہار کیا، مگر اس پر کوئی توجہ نہ کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قبائل کے وظائف بند ہو گئے اور انھوں نے صوبہ دار کابل کے احکام کی اطاعت چھوڑ دی۔ پہاڑی راستوں کے محافظ تنخواہیں نہ ملنے کے باعث اپنے فرائض سے سبکدوش ہو گئے۔ فوج کی تنخواہیں پانچ سال تک بند رہیں، اور ان کا نظم و ضبط ختم ہو گیا۔ جب نادر شاہ قندھار پر حملہ آور ہوا، اور قزلباشوں کے دستے سرحد کابل تک تاخت و تاراج کرتے ہوئے پہنچ گئے، ناصر خاں نے پھر روپیہ کی شدید ضرورت ظاہر کی، اور اس خطرہ کی طرف توجہ دلائی جو قضائے مبرم کی طرح اسکے سر پر چھا رہا تھا مگر صمصام الدولہ کے حامیوں نے اسکے ظاہر کردہ خطرات کو بالکل جعلی افسانہ قرار دیا، اور بادشاہ کو یقین دلایا کہ یہ سب باتیں قمر الدین خاں اور نظام الملک کے اشارے سے کی جا رہی ہیں۔ تاکہ صمصام الدولہ کے مقابلہ میں پھر تورانی گروہ کا اثر قائم کیا جائے۔ آخر کار ناصر خاں کابل کو ایک قلعہ دار کی حفاظت میں چھوڑ کر آرام سے پشاور آن بیٹھا۔

کابل کے بعد ہندوستان کا دوسرا صوبہ جو نادر شاہ کی پیشقدمی کو روک سکتا تھا، پنجاب تھا۔ یہاں کا صوبہ دار زکریا خاں ایک بہادر اور منتظم شخص تھا۔ مگر چونکہ وہ تورانی گروہ سے تعلق رکھتا تھا، اور قمر الدین خاں کا خالہ زاد بھائی تھا اسلئے ہندوستانی گروہ اور اس کا سردار صمصام الدولہ اس سے دشمنی رکھتا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ ان لوگوں نے مسلسل اس کی غیبتیں کر کے بادشاہ کو اس سے سخت

بدظن کر دیا۔ اور جب نادر شاہ کے حملہ کا خوف ظاہر کر کے اس نے مالی امداد کے لئے عرضیاں بھیجیں، تو انھوں نے بادشاہ کو یقین دلایا کہ یہ بھی اسی تورانی سازش کا شگوفہ ہے۔ اس طرح پنجاب کی حفاظت کا بھی بروقت کوئی انتظام نہ ہو سکا۔

ان حالات میں جب نادر شاہ نے سلطنت ہندوستان پر حملہ کیا تو کوئی قوت اسکو روکنے والی نہ تھی۔ صفر ۱۱۵۱ھ (مئی ۱۷۳۸ء) میں غزنی بلا مزاحمت مفتوح ہو گیا۔ اسکے ایک مہینہ بعد کابل کے قلعہ دار نے بھی ناکام مقابلہ کے بعد ہتھیار ڈال دئے۔ جمادی الاخریٰ (ستمبر) میں جلال آباد مسخر ہوا، اور اس جرم میں کہ وہاں کے لوگوں نے نادر شاہ کے ایلچیوں کو قتل کر دیا تھا، سارا شہر تباہ و برباد کر دیا گیا۔ شعبان (نومبر) میں نادر شاہ ہندوستان کی طرف بڑھا۔ ناصر خاں نے پشاور کے نواحی سے ۲۰ ہزار افغان جمع کر کے علی مسجد اور جمرود کے درمیان کے درہ پر اس کا راستہ روکا، لیکن یہ بھیڑ بھاڑ نادر کی باضابطہ فوج کے ایک حملہ کی بھی تاب نہ لا سکی۔ ناصر خاں اور اسکے ہمراہی سردار گرفتار ہوئے، اور پشاور فتح ہو گیا۔ اسکے بعد نادر شاہ پنجاب کی طرف بڑھا۔ زکریا خاں صوبہ دار پنجاب نے شاہی حکومت کی امداد کے بغیر جو کچھ طیاری ممکن تھی کی اور لاہور پر ایرانی فاتح کا مقابلہ کیا مگر ڈیڑھ دن سے زیادہ وہ بھی نہ ٹھیر سکا اور شوال (جنوری ۱۷۳۹ء) میں اس نے لاہور تسلیم کر دیا۔ اس فاتحانہ اقدام کے دوران میں اٹک سے لیکر سرہند تک ہر طرف قزلباشوں کے رستے پھیل گئے، اور انھوں نے اپنی ترکتازیوں

سے شہروں، قصبوں اور قریوں کو غارت کر کے سارے پنجاب میں تہلکہ عظیم برپا کر دیا۔ لاہور سے چلکر نادر شاہ سرہند، انبالہ، شاہ آباد تھانیسر ہوتا ہوا سرائے عظیم آباد پر خیمہ زن ہوا جو کرنال سے صرف ۱۲ میل جانب شمال واقع ہے۔

محمد شاہ کی آنکھیں اُس وقت کھلیں جب سارا افغانستان ہاتھ سے نکل چکا تھا، اور نادری سیلاب خیبر کے بند کو توڑ کر پشاور تک بڑھ آیا تھا۔ اب سلطنت ہند کے فرمانروا کو یقین آیا کہ اسکے ملک پر واقعی کوئی حملہ ہوا ہے۔ اس نے سلطنت کے تین سب سے بڑے امیروں کو ایک کروڑ روپیہ، فوج اور سامان جنگ کی فراہمی کے لیے عطا کیا، اور رمضان ۱۱۵۱ھ (دسمبر ۱۷۳۸ء) میں انہیں دھلی سے رخصت کیا۔ یہ تین امیر نظام الملک آصفجاہ وکیل مطلق اعتماد الدولہ قمر الدین خاں وزیر الممالک اور صمصام الدولہ خان دوران میر بخشی تھے۔ لیکن ان تینوں میں سے ایک کو بھی سردار اور قائد اعلیٰ بناکر سیاہ و سپید کے اختیارات نہیں دے گئے تھے، حالانکہ ایسے مواقع پر ایک شخص کو مختار مطلق بنانا ضروری ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دھلی سے دو فرسنگ جاکر یہ لوگ بادلی کی سرائے پر ٹھہر گئے اور غنیم کا مقابلہ کرنے کے بجائے آپس کے توڑ جوڑ میں وقت ضائع کرنے لگے۔ نظام الملک اور اعتماد الدولہ تورانی گروہ پر اعتماد رکھتے، اور چاہتے تھے کہ مدافعت کا کام انہی پر چھوڑ دیا جائے۔ امرا و اعیان سلطنت میں جو لوگ کچھ سمجھ بوجھ رکھتے تھے انکی بھی یہ رائے تھی کہ ملک میں اسوقت صرف نظام الملک ہی ایک ایسا جہاندیدہ، آزمودہ کار، ماہر جنگ اور

مدبر سیاست ہے جس نے عالمگیر کی آنکھیں دیکھی ہیں، اور اس مہلک طوفان میں سلطنت کے جہاز کو بچائے جانے کی اگر کوئی صورت ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ اس شخص کو ناخدا بنا کر اسی کی تدبیر پر جہاز کو چھوڑ دیا جائے۔ اسکے برعکس خان دوراں اور اسکے ساتھ پورا ہندوستانی گروہ اس کا سخت مخالف تھا کہ تورانیوں کے ہاتھ میں عنان اقتدار دیدی جائے۔ یہ لوگ تورانیوں کو غدار سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک تورانی اور ایرانی سب ایک تھے۔ انہیں قوی شبہ تھا کہ وہ ایرانی فاتح کے ساتھ مل جائینگے اور پھر ہندوستان میں ایک غیر ملکی حکومت قائم کر دینگے[1]۔ وہ تمام تر ہندوستان کے راجپوتوں اور مرہٹوں پر اعتماد رکھتے تھے، اور انہیں یقین تھا کہ راجپوتوں کی تلوار اور مرہٹوں کی جنگ قزاقی نادرشاہ کا منہ پھیر دیگی۔ چنانچہ انھوں نے جے سنگھ سوائی، باجی راؤ مرہٹہ، اور دوسرے بڑے بڑے سرداروں کو بادشاہ کی طرف سے خطوط لکھوائے۔ مگر عین وقت پر ثابت ہو گیا کہ انمیں سے کوئی سلطنت اور ملک کی مدافعت کے لئے طیار نہ تھا۔ جے سنگھ اور راجپوت سردار اس نازک موقع

---

[1] اسی زمانہ میں جب زکریا خاں نے مجبور ہو کر لاہور نادر شاہ کے سپرد کر دیا، تو ہندوستانی گروہ نے اس واقعہ کو تورانیوں کی غداری کے ثبوت میں پیش کیا، اور زکریا خاں پر یہ الزام لگایا کہ اس نے ایرانیوں کے ساتھ سازباز کر کے ملک فروشی کی ہے۔ حالانکہ جسوقت ایرانی حملہ کی مدافعت کے لئے زکریا خاں بار بار مدد طلب کر رہا تھا اسوقت یہی ہندوستانی گروہ تھا جس نے اسکو جھٹلایا اور اسکی مدد کے لئے ایک پیسہ اور ایک سپاہی تک نہ بھیجا۔

سے فائدہ اٹھا کر مغلوں کی اطاعت کا جوا اتار پھینکنے کے لیے طیار ہو گئے۔ باجی راؤ نے بظاہر امداد پر آمادگی ظاہر کی[1] مگر عملاً اس نے شمالی ہند کی مدافعت سے کوئی دلچسپی نہ لی اور صرف مہاراشٹر کی حفاظت کے لئے نربدا اور بندھیاچل کے استحکامات کی بندش پر اپنی ساری توجہ مبذول رکھی۔

غرض اس دھڑے بندی اور اندرونی اختلاف میں پورا ایک مہینہ ضائع کر دیا گیا، یہاں تک کہ نادر شاہ کے اٹک پار اتر آنے کی خبر پہنچی۔ تب یہ لوگ لاہور کی طرف روانہ ہوئے، مگر پانی پت میں ان کو خبر ملی کہ نادر شاہ نے لاہور پر قبضہ کر لیا ہے۔ اسلئے انھوں نے وہیں پڑاؤ ڈال دیا، اور محمد شاہ کو باصرار لکھا کہ آپکے آئے بغیر کام نہ چلیگا۔ آخر کار محمد شاہ کو بھی اپنے عشرت کدہ سے نکلنا پڑا۔ پانی پت پہنچ کر اس نے امرا سے مشورہ طلب کیا کہ جنگ کس نہج پر کی جائے۔ نظام الملک نے رائے دی کہ کرنال چل کر مدافعت کی طیاری کی جائے، کیونکہ وہاں میدان وسیع ہے اور علی مرداں کی نہر سے پانی بافراط مل سکتا ہے۔ مجلس جنگ کے دوسرے ارکان نے بھی اس رائے کو پسند کیا۔ ذی قعدہ کی ابتدا (فروری ۱۷۳۹ء)

---

[1] باجی راؤ اپنے ایک خط میں پیلاجی جادوں کو لکھتا ہے:-

"میں شمالی ہند کی طرف منزل بمنزل کوچ کرونگا۔ طہماسپ قلی بادشاہ ایران دہلی کی تسخیر کے لئے نکلا ہے۔ میں محمد شاہ کی امداد کیلئے ملہار راؤ ہولکر، رانوجی سندھیا اور راؤ اوداجی پوار کے ماتحت مالوہ کی فوج بھیج رہا ہوں۔ مرہٹہ راج کیلئے یہ بات قابل فخر ہے کہ وہ اس موقع پر دہلی کے بادشاہ کی مدد کرے۔"

میں کرنال پر جاکر ڈیرے ڈال دیے گئے۔ بادشاہی فوجیں ۱۲ میل کے رقبہ پر پھیل گئیں، انکے گرد ایک خندق، اور مٹی کی دیوار تعمیر کی گئی، اور اسکے مورچوں پر توپیں لگادی گئیں۔ اس کے ایک ہفتہ بعد نادر شاہ بھی مقابلہ پر آپہنچا، اور کرنال سے چھ میل کے فاصلہ پر خیمہ زن ہوا۔

اس مقابلہ میں نادر شاہ اور محمد شاہ کی قوت کا موازنہ کرنے کے لئے صرف اتنا جان لینا کافی نہیں ہے کہ نادر کے کیمپ میں ڈیڑھ لاکھ کے قریب آدمی تھے، اور محمد شاہ کے کیمپ میں ۱۰ لاکھ بلکہ یہ فرق بھی معلوم کرنا ضروری ہے نادر کے ڈیڑھ لاکھ میں سے ۵۰ ہزار جنگ آزما سپاہی تھے، اور باقی ایک لاکھ غیر مقاتل متعلقین لشکر تھے۔ گویا لشکر کا پورا ایک تہائی حصہ مقاتل فوج پر مشتمل تھا۔ بخلاف اسکے محمد شاہ کے کیمپ میں ۷۵ ہزار سے زیادہ مردان کار نہ تھے، اور اس لحاظ سے یہاں مقاتلین اور غیر مقاتلین کے درمیان ایک اور ۱۲ کی نسبت تھی۔ علاوہ بریں محمد شاہ کے کیمپ میں غیر مقاتل خدام، شاگرد پیشہ، سائیس حتیٰ کہ عورتیں تک مسلح تھیں، سب کی سواری کے لئے گھوڑے موجود تھے، اور ضرورت کے وقت سب اپنی حفاظت آپ کرنے کے قابل تھے۔ مگر محمد شاہ کے کیمپ میں بڑا الاؤ لشکر اُن خواتین حرم اور لونڈیوں، ماماؤں، خواجہ سراؤں، خادموں اور امراء کے دوسرے متعلقین پر مشتمل تھا جنھوں نے کبھی رن کی صورت تک نہ دیکھی تھی۔ اس حالت میں نادر شاہ کی فوج سے

ایک سپاہی پر دو آدمیوں کی حفاظت کا بار تھا اور وہ دو آدمی
بھی ایسے تھے جو ضرورت کے وقت اس بار کو خود اٹھا سکتے تھے۔
لیکن محمد شاہ کی فوج کے ہر سپاہی پر ۱۲ آدمیوں کی حفاظت کا بوجھ
بھی تھا، اور یہ ۱۲ آدمی ایسے تھے جو ہاتھ ہلانے کے قابل بھی نہ تھے۔
پھر دونوں کی جنگی سپاہ میں بھی زمین و آسمان کا فرق تھا۔ نادر
کی زبردست قوت ضابطہ نے اس کی پوری فوج کو ایک بنیان
مرصوص بنا رکھا تھا۔ اور محمد شاہ کی فوج ایک فراش مبثوث کے
سوا کچھ نہ تھی۔ وہاں سمع وطاعت اور نظم وضبط کا یہ حال کہ ۵۰
ہزار انسان ایک شخص کے اشاروں پر حرکت کرتے تھے۔ ایک ہاتھ
کے ساتھ پچاس ہزار ہاتھ اُٹھتے تھے، ایک قدم کے ساتھ پچاس ہزار
قدم جنبش میں آجاتے تھے گویا پوری فوج ایک زندہ پہاڑ تھی
جیسے ایک طاقتور ہاتھ جدھر چاہتا تھا گردش دیتا تھا۔ اور یہاں
سمع وطاعت ناپید، نظم وضبط مفقود، وحدتِ فکر وعمل معدوم
تھی۔ اس بن سری فوج میں نہ کوئی آمر تھا نہ مامور۔ نہ کوئی حکم
دینے والا تھا نہ سننے والا، گویا ۵۰ ہزار سنگ ریزے منتشر تھے،
جن کو ایک چٹان بنا دینے والی بندش نصیب نہ تھی۔

اس تفاوت کو دیکھتے ہوئے، ہر صاحب نظر انسان یہ
سمجھ سکتا تھا کہ نادر شاہ اور محمد شاہ کا درحقیقت کوئی مقابلہ
ہی نہیں ہے۔ اسی بنا پر نظام الملک یہ چاہتے تھے کہ جنگ کو
جہاں تک ممکن ہو ٹالتے رہیں، اور التوائے جنگ کی حالت میں
محض اپنی ڈپلومیسی کی مہارت سے نادر شاہ کو مصالحت پر آمادہ

کرلیں۔ مگر جو لوگ دماغ سے نہیں، صرف ہاتھ سے لڑنا جانتے تھے، انکی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آسکتی تھی کہ جب محمد شاہ کے پاس نادرشاہ سے زیادہ فوج، توپخانہ، سامان جنگ، اور مال و دولت موجود ہے تو وہ کیوں اس سے نہ لڑے۔ اسی قسم کے لوگوں نے آخرکار لڑائی چھیڑ دی اور اپنی شتاب کاری سے وہ بھی اسطرح چھیڑی کہ توقع سے بھی زیادہ اسکا انجام خراب ہوا۔ ۱۴ ذی قعدہ (۱۳ فروری) کو برہان الملک سعادت خاں صوبہ دار اودھ محمد شاہ کی امداد کے لئے بیس یا تیس ہزار فوج لیکر دھاوے مارتا ہوا کرنال پہنچا۔ اس کی آمد کے بعد ایک مجلس جنگ منعقد کی گئی، جس میں وہ بھی شریک ہوا۔ ابھی مشورے ہو ہی رہے تھے کہ اطلاع آئی کہ سعادت خاں کا سامان جو پیچھے آرہا تھا، نادرشاہ کے قراولوں نے لوٹ لیا، اور محافظوں کو قتل کرڈالا۔ سعادت خاں نے یہ سنتے ہی جوش میں آکر تلوار اٹھائی اور بادشاہ سے جنگ پر جانے کی اجازت مانگی۔ نظام الملک نے اس جلد بازی کی سخت مخالفت کی۔ انھوں نے کہا کہ اول تو اودھ کی فوج کامل ایک مہینے سے دھاوے مارتی چلی آرہی ہے۔ اس تھکی ہوئی فوج کو لیکر نادر کی تازہ دم فوج سے لڑنا ایک غیر دانشمندانہ فعل ہے۔ دوسرے اتنی بڑی لڑائی اس طرح نہیں چھیڑی جاتی کہ اٹھے اور سیدھے میدان جنگ میں جا پہنچے۔ اسکے لئے پہلے سے طیاری کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہاں میدان میں جانے کی کوئی طیاری نہیں ہے۔ صمصام الدولہ اور بعض دوسرے امیروں نے بھی جنگ کو دوسرے دن پر ملتوی رکھنے کا مشورہ دیا۔ مگر سعادت خاں

نے کسی کی نہ سنی۔ اس نے فوراً اپنی فوج میں جنگ کی منادی کر دی اور پہلی آواز سنتے ہی جو لوگ اسکے گرد جمع ہو گئے انہیں لیکر وہ میدان کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ جمعیت مشکل سے ۵ ہزار آدمیوں پر مشتمل تھی، کیونکہ تھکے ماندے سپاہی جنہوں نے ابھی کمر بھی نہ کھولی تھی، جنگ کی نفیر سے جی چرانے پر فطرۃً مجبور تھے۔

سعادت خاں نے جب نادر شاہ کی فوج پر حملہ کیا، تو وہ تھوڑے سے مقابلہ کے بعد پسپا ہو گئی۔ یہ سمجھا کہ شکست کھا کر بھاگ رہی ہے۔ اس نے پیچھا کرنا شروع کیا، اور بادشاہ کو پیغام بھیجا کہ فتح ہوا چاہتی ہے، تھوڑی سی کمک لے جانے کا حکم دیا جائے۔ نظام الملک نے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ ایرانیوں کی ایک جنگی چال ہے۔ وہ پسپا ہو کر برہان الملک کو دھوکہ دے رہے ہیں، اور جب اپنے مرکز سے بہت دور نکل جائے گا تو دفعتہً اس پر پلٹ پڑینگے۔ لیکن یہ بات کسی کی سمجھ میں نہ آئی اور صمصام الدولہ بھی بغیر کسی طیاری کے صرف ۸ ہزار فوج لیکر میدان کی طرف چلا گیا۔ یہ ابھی راستے ہی میں تھا کہ اُدھر نادر شاہ نے اچانک پلٹا کھا کر برہان الملک پر حملہ کیا، اور ایک گھنٹہ کے اندر اسکی ساری فوج کا قلع قمع کر کے خود اس کو گرفتار کر لیا۔ اسکے بعد وہ صمصام الدولہ کی طرف بڑھا اور دو گھنٹہ کی گھمسان لڑائی کے بعد اس کو بھی، شکست فاش دیدی، اُس کی فوج کے بڑے بڑے سردار مارے گئے، خود وہ مہلک زخم کھا کر لشکر واپس آیا، اور دو دن بعد دنیا

سے رخصت ہو گیا۔[لہ]

اس شکست نے تمام ہندوستانی فوج کے دل توڑ دیے، اور مقاومت کی رہی سہی طاقت بھی باقی نہ رہی۔ رات کے وقت مجلس مشاورت منعقد ہوئی جس میں بادشاہ، وزیر اعظم اور بعض دوسرے امرا نے اس پر زور دیا کہ دوسرے دن ضرور جنگ کرنی چاہیے۔ مگر نظام الملک نے انکو سمجھایا کہ اس حالت میں لڑنے کا نتیجہ بجز تباہی کے اور کچھ نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ نادر شاہ سے صلح کرنے کی کوشش کی جائے۔ دوسری طرف برہان الملک سعادت خاں سے نادر شاہ نے گفتگو کی، اور ہم جنسی و ہم کیشی کی بنا پر اُس سے کہا کہ مجھے ترکی سلطان سے لڑنے کے لیے واپس جانا ہے۔ تم رائے دو کہ کسطرح میں تمھارے بادشاہ سے بآسانی زر فدیہ وصول کر سکتا ہوں۔" اس نے جواب دیا کہ "نظام الملک سلطنت ہند کی کنجی ہے، اسکو بلائیے اور شرائط صلح طے کر لیجئے۔" چنانچہ دوسرے روز نادر شاہ نے اپنا ایلچی محمد شاہ کے پاس بھیج کر

[لہ] محمد شاہ کے لشکر کی اخلاقی حالت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جونہی صمصام الدولہ اور سعادت خاں نے میدان جنگ کا رخ کیا، ان کے خیمہ و خرگاہ کو خود ان کی فوج کے اوباشوں نے لوٹ لیا حتیٰ کہ ان کے پڑاؤ کی جگہ پر ایک راوٹی کا بھی نشان نہ چھوڑا۔ جب صمصام الدولہ نیم مردہ حالت میں میدان سے لایا گیا تو اسکے لیے سر چھپانے کو جگہ نہ تھی ہمراہیوں نے ایک مانگے کا خیمہ لیکر اسمیں اسے اتارا۔ یہ افواج ہند کے سالار اعظم کا حشر خود اپنے کیمپ میں ہوا۔

نظام الملک کو طلب کیا، اور قرآن کی قسم کھا کر وعدہ کیا کہ انکو کسی قسم کا گزند نہ پہنچیگا۔ سعادت خاں نے بھی اسکے ساتھ عرضی بھیجی کہ آپ مصالحت کی گفت و شنید کیلئے نظام الملک کو بھیج دیجئے۔ محمد شاہ کے پاس امرائے کبار میں سے ایک نظام الملک ہی باقی رہ گئے تھے۔ اس لئے وہ انکو بھیجتے ہوئے ڈرتا تھا۔ اس نے کہا کہ "اگر تمھارے ساتھ غدر کیا گیا تو میں کیا کرونگا؟" نظام الملک نے جواب دیا کہ "قرآن ہمارے اور اسکے درمیان ہے۔ اگر غدر کیا گیا، تو خدا اسکا بدلہ لیگا۔ ایسی صورت میں آپ مانڈو یا کسی اور مضبوط قلعہ میں پناہ لیں، اور ناصر جنگ کو دکن سے بلا کر ایرانیوں سے جنگ کریں۔"

آخرکار ۱۵ ذی قعدہ (۱۴ فروری) کو نظام الملک وکیل مطلق کی حیثیت سے نادر شاہ کے پاس گئے، اور نادر نے ان سے شائستہ برتاؤ کیا۔ دوران گفتگو میں اس نے ان کی شخصیت، فرزانگی اور تدبر سے متاثر ہو کر سوال کیا کہ "مقام حیرت ہے، جب بادشاہ ہندوستان کے پاس تم جیسے امیر موجود ہیں تو کس طرح تنگ دھڑنگ مرہٹے دھلی کی دیواروں تک تاخت کرتے ہوئے پہنچ جاتے ہیں، اور اس سے فدیہ وصول کرتے ہیں۔" نظام الملک نے جواب دیا "جب سے نئے امیروں کا اثر بڑھا ہے ظل سبحانی جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ میرے مشورے ان کے نزدیک قابل قبول نہیں ہیں۔ اسی لئے میں مایوس ہو کر دکن میں گوشہ گیر ہو گیا ہوں"۔ اس کے بعد صلح کی

گفت وشنید شروع ہوئی، اور بحث ومباحثہ کے بعد یہ طے ہوا کہ نادر شاہ ۵۰ لاکھ روپیہ[1] لیکر ہندوستان سے واپس چلا جائیگا، اس رقم میں سے ۲۰ لاکھ اسی وقت ادا کئے جائینگے، دس لاکھ لاہور پہنچنے پر، دس لاکھ اٹک سے اترنے بعد، اور دس لاکھ کابل میں۔ اس سمجھوتہ کے بعد نظام الملک لشکر نادر شاہی سے واپس ہوئے اور نادر نے ان کے ذریعہ سے محمد شاہ کو دعوت بھیجی کہ دوسرے دن وہ اسکے ہاں کھانا کھائے۔ چنانچہ دوسرے روز نظام الملک محمد شاہ کو لیکر نادر شاہ کے ہاں گئے، اور انکے ساتھ اعتماد الدولہ قمر الدین خاں، اور موتمن الدولہ اسحاق خاں بھی شریک ضیافت ہوئے۔

اس دوستانہ ملاقات کے بعد یہ امید قائم ہو چکی تھی کہ ایران وہندوستان کے درمیان صلح پایہ تکمیل کو پہنچ گئی ہے۔ لیکن ایک واقعہ نے دفعتہً حالات کا رخ بدل دیا۔ اس دوران میں صمصام الدولہ خان دوراں کا انتقال ہو چکا تھا۔ محمد شاہ نے نادر کی ضیافت سے واپس آکر نظام الملک کو اسکی جگہ امیر الامرائی ومیر بخشی گری کا عہدہ عطا کر دیا، اور انھوں نے یہ عہدہ اپنے بڑے بیٹے غازی الدین خاں فیروز جنگ کی طرف منتقل کر دیا۔ اس کی اطلاع برہان الملک سعادت خاں کو (جو نادر شاہ کے ہاں

---

[1] سیر المتاخرین اور فتوحات آصفی میں لکھا ہے کہ مصالحت دو کرور روپیہ پر ہوئی تھی۔

اسیر تھا) اسی روز پہنچ گئی ، اور وہ سخت رنجیدہ ہوا ، کیونکہ وہ خود اس منصب کا امیدوار تھا۔ جذبہ حسد سے بے خود ہو کر اس نے نظام الملک کی طے کردہ صلح کو درہم برہم کرنے کا فیصلہ کرلیا اور نادر شاہ سے مل کر کہا کہ "سلطنت ہندوستان سے صرف ۵۰ لاکھ روپیہ پر صلح کر لینا کوئی دانشمندی نہیں ہے۔ اگر آپ چند قدم آگے بڑھ کر دھلی پہنچ جائیں تو آپ کو زر و جواہر کی شکل میں ۲۰ کروڑ روپیہ بآسانی حاصل ہو سکتا ہے۔ محمد شاہ میں مقابلہ کی قوت نہیں ہے۔ اسکے بڑے بڑے امرا کام آچکے ہیں۔ صرف ایک نظام الملک ایسا شخص ہے جو اپنی فریب کاری اور فیلسوفی کے باعث موجب خطر ہو سکتا ہے۔ سو اسکو آپ ملاقات کے بہانہ سے بلائے اور قید کر لیجئے۔ پھر آپ کے لئے راستہ صاف ہے"۔ نادر شاہ نے اس مشورہ کو قبول کرلیا، اور نظام الملک کو مشورہ کے بہانہ سے بلا بھیجا۔ ۲۳ رذی القعدہ (۲۲ فروری) کو نظام الملک صلح کے اعتماد پر اسکے ہاں چلے گئے ، اور لشکر میں پہنچتے ہی اسیر کر لئے گئے۔ نادر شاہ نے انکو پیغام بھیجا کہ پچھلی مصالحت ہم کو منظور نہیں ہے۔ صلح اس شرط پر ہو سکتی ہے کہ ۲۰ کروڑ روپیہ بطور فدیہ ادا کیا جائے اور ۲۰ ہزار فوج ہماری خدمت میں پیش کی جائے۔ نظام الملک کے لئے یہ مطالبہ بالکل خلاف توقع تھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ "چغتائی خاندان کی حکومت جب سے شروع ہوئی ہے اس وقت سے آجتک ۲۰ کروڑ روپیہ خزانہ میں جمع نہیں ہوا ہے۔ شاہجہاں اپنی تمام کاہش و کوشش کے

باوجود ۱۶ کروڑ سے زیادہ جمع نہ کر سکا، اور یہ رقم بھی بعد کو عالمگیر بادشاہ نے دکن کی طویل لڑائیوں میں خرچ کر دی۔ اس وقت تو خزانہ کا یہ حال ہے کہ ۵۰ لاکھ کی پابجائی بھی مشکل نظر آتی ہے۔" مگر نادر شاہ نے ان عذرات کو سننے سے انکار کر دیا، اور کہا کہ جب تک ہمارا مطالبہ پورا نہ کیا جائے گا، تم یہاں سے نہ جا سکو گے۔

اسکے بعد نادر شاہ نے نظام الملک پر زور دیا کہ وہ محمد شاہ کو لشکر نادری میں آنے کے لئے لکھیں۔ انھوں نے اس پر بہت کچھ احتجاج کیا، لیکن نادری اصرار بڑھتا گیا۔ آخر انھوں نے مجبور ہو کر بادشاہ کو اصل واقعات لکھ بھیجے، اور یہ بھی لکھ دیا کہ نادر شاہ آپکے بلانے پر مُصر ہے۔ اس خط سے محمد شاہ کے اوسان خطا ہو گئے۔ اب اسکے پاس بڑے درجہ کے امرا میں سے کوئی بھی ایسا باقی نہ رہا تھا جس سے وہ مشورہ لیتا۔ قمر الدین خاں وزیر نے صاف جواب دیدیا کہ ان حالات میں میری عقل کچھ کام نہیں کرتی۔ چھوٹے درجہ کے امرا نے کہا کہ ہم جانبازی کے لئے طیار ہیں۔ ایک دفعہ پھر لڑ کر دیکھ لیجئے۔ لیکن محمد شاہ اتنی سمجھ بوجھ ضرور رکھتا تھا کہ اس حالت میں لڑائی کا کیا انجام ہوگا۔ جب کسی طرف امید کی کوئی جھلک نظر نہ آئی، تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ تن بتقدیر نادر شاہ کے پاس چلا جائے اور جو کچھ قسمت میں لکھا ہے، دیکھ لے۔ چنانچہ ۲۵ ذی القعدہ (۲۴ فروری) کو وہ نادر شاہ کے ہاں چلا گیا اور جاتے ہی اسیر ہو گیا۔ دوسرے روز

قمر الدین خاں وزیر بھی آکر ان اسیروں میں مل گیا، اور لشکر محمد شاہی میں اعلان کر دیا گیا کہ جو چاہے کرنال میں ٹھیرا رہے اور جو چاہے دھلی واپس چلا جائے۔ اب یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ دس لاکھ بھیڑوں کے اس عظیم الشان گلہ کا کیا حال ہوا ہوگا جسے سنبھالنے کے لیے برائے نام بھی کوئی چرواہا نہ رہا تھا۔ آن کی آن میں سارا لشکر تہ و بالا ہو گیا۔ انتہا درجہ کی پراگندگی اور سراسیمگی کے ساتھ لشکر کے لوگ دھلی کی طرف روانہ ہوئے، اور راستے میں قزلباشوں کے غارت گر دستوں نے جنہیں اب کسی مزاحمت کا خوف نہ تھا، دل کھول کر انہیں لوٹا۔

محمد شاہ کی گرفتاری کے دوسرے دن نادر شاہ نے سعادت خاں کو اپنی فوج کے ایک سردار طہماسپ خاں جلائر کے ساتھ دھلی بھیجا، اور ان دونوں نے شہر کے حاکم لطف اللہ خاں صادق سے قلعہ اور خزانوں اور تمام کارخانجات کی کنجیاں لے لیں۔ اس کے بعد ذی الحج (مارچ) کی ابتدا میں نادر شاہ خود محمد شاہ کو لیکر دھلی چلا اور ۹ ذی الحج (۹ مارچ) کو شہر میں داخل ہوا[لہ]۔ دوسرے روز عید گاہ اور تمام شہر کی مساجد میں نادر شاہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا جو اس امر کا رسمی اعلان تھا کہ اب سلطنت ہند کا مالک محمد شاہ نہیں بلکہ نادر شاہ ہے۔ لیکن نادر شاہ کا اصل

[لہ] نویں اور دسویں ذی الحج کی درمیانی شب میں سعادت خاں نے وفات پائی۔

مقصد اس وقت ہندوستان کا تخت حاصل کرنا نہ تھا، بلکہ ہندوستان کی دولت پر قبضہ کرنا تھا۔ اسلیئے اس اعلان سے اسنے ایک اور فائدہ اٹھایا۔ نماز عید کے بعد جب وہ محمد شاہ کی ضیافت میں شریک ہوا تو وہاں اسنے کہا کہ اول روز جو قرار داد ہوئی تھی میں اسی پر قائم ہوں، اور نہ صرف ہندوستان کا تخت محمد شاہ کو سونپتا ہوں، بلکہ یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ میری امداد محمد شاہ کے شامل حال رہیگی، کیونکہ ہم دونوں ایک ہی ترکمانی رابطہ میں مربوط ہیں۔ محمد شاہ نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ اس جان بخشی و تاج بخشی کا شکریہ ادا کیا اور اس کے صلہ میں بے شمار زر و جواہر اور خزائن اور نفیس و نادر سامان جنکی قیمت کروڑوں روپے تک پہنچتی تھی، پیش کیئے۔ نادر شاہ نے انکو قبول کرنے سے انکار کیا۔ مگر محمد شاہ مبالغہ کے ساتھ اصرار کرتا رہا۔ آخرکار نادر شاہ نے اس خیال سے کہ محمد شاہ کی "دل شکنی" نہ ہو، اس ہدیہ کو قبول کرلیا۔ اور اپنے امین اس تمام مال و اسباب کو ضبط میں لانے کے لئے مقرر کردیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ناٹک تھا، جس میں ایرانی بازیگر نے پہلے سے یہ طے کرلیا تھا کہ تماشے کا کونسا حصہ وہ خود ادا کریگا، اور کونسا حصہ محمد شاہ کو ادا کرنا ہوگا۔ اور اس سارے کھیل سے مقصود یہ تھا کہ دنیا کی نگاہوں میں لوٹ کو ہدیہ کا لباس پہنا دیا جائے۔

لیکن دھلی کی قسمت ابھی اس سے زیادہ تباہیوں کا تقاضا کررہی تھی۔ ۱۰ر ذی الحج کی شام کو شہر کے بازاریوں نے دفعتہً ایک

عام بلوا شروع کر دیا اور جو ایرانی سپاہی شہر میں پھر رہے تھے انکو قتل کرنے لگے۔ اس بلوے کے مختلف وجوہ بیان کئے جاتے ہیں۔

عام مورخین نے اسکی وجہ یہ بیان کی ہے کہ شہر کے بے فکروں نے یہ شوشہ چھوڑ دیا کہ قلعہ میں محمد شاہ کے اشارے سے ایک قلماقنی نے نادر شاہ کا کام تمام کر دیا ہے۔ یہ خبر آناً فاناً سارے شہر میں پھیل گئی اور اوباشوں نے یہ سمجھ کر کہ اب ایرانیوں کا کوئی سر دھرا نہیں رہا ہے، ان پر حملے کرنے شروع کر دیے۔ مگر ابو الفیض جو خود اس وقت دہلی میں موجود تھا لکھتا ہے کہ ایرانی سپاہی ہر طرف پھیل گئے تھے اور انھوں نے مفتوح شہر کے باشندوں پر ظلم و ستم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ کسی کا مال، کسی کی عزت، کسی کی جان ان کے ہاتھوں سے محفوظ نہ تھی۔ بے تکلف لوگوں کے گھروں تک میں گھس جاتے تھے، اور جو چاہتے تھے کرتے تھے۔ اس سے شہر کے لوگوں میں سخت بے چینی پھیل گئی اور وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو گئے۔ خانجہاں نے اسکی شکایت نادر شاہ سے کی اور اس نے حکم دیا کہ ہر ناکہ پر ایک نسقچی کھڑا کر دیا جائے اور وہ سپاہیوں کو ناشائستہ حرکات سے روکے۔ لیکن ابھی یہ انتظام قائم نہ ہونے پایا تھا کہ نادر شاہ کے قتل کی خبر اڑ گئی اور بازاری لوگوں نے عام بلوہ کر دیا۔ ایک اور ہم عصر مورخ ہرچرن داس بھی اس روایت کی تصدیق کرتا ہے۔ فرنگی مصنف ہانوے ((Hanway)) اسکی ابتدا اسطرح بیان کرتا ہے کہ طہماسپ خاں جلایر نے ایرانی فوج کے چند نسقچی پہاڑ گنج کی طرف بھیجے تاکہ غلہ کے بیوپاریوں کو غلہ کے

گودام کھولنے اور قیمتیں مقرر کرنے کا حکم دیں۔ قیمتوں کی تشخیص پر بیوپاریوں اور نسقچیوں میں جھگڑا ہو گیا۔ اس جھگڑے میں بازاری لوگ بیوپاریوں کے ساتھ ہو گئے اور انھوں نے نسقچیوں پر حملہ کر کے انہیں قتل کر دیا۔ یہی جھگڑا رفتہ رفتہ دوسرے بازاروں میں پھیل گیا اور نادر کے قتل کی افواہ نے اس کو اور زیادہ پھیلا دیا۔

بہرکیف دسویں تاریخ کی شام سے گیارھویں کی صبح تک دھلی کے اوباش ایرانیوں پر برابر حملے کرتے رہے، اور رات بھر میں انھوں نے تین چار ہزار آدمیوں کو قتل کر دیا۔ نادر شاہ نے اول اول جب یہ خبر سنی تو اسے یقین نہ آیا۔ اس نے کہا کہ مفتوح ہندیوں کی یہ جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ میرے سپاہیوں پر حملہ کریں۔ یہ داستان خود میری فوج والوں نے گھڑی ہے، تاکہ شہر کو لوٹنے کا ایک بہانہ ہاتھ آئے۔ مگر جب پیہم شکایات اس تک پہنچیں تو ۱۱ ر ذی الحج کی صبح کو وہ خود اصل واقعہ کی تحقیق کے لیے قلعہ سے نکلا، اور اپنی آنکھوں سے اس نے دیکھا کہ اہل شہر فساد پر تلے ہوئے ہیں۔ چاندنی چوک میں روشن الدولہ کی مسجد پر (جو سنہری مسجد کے نام سے مشہور ہے) پہنچ کر اس نے دریافت کیا کہ کن کن محلوں میں اسکے سپاہیوں پر زیادتیاں ہوئی ہیں، اور پھر اپنی تلوار سونت کر بیٹھ گیا، جو اس بات کی علامت تھی کہ قتل عام کر دو۔ یہ اشارہ پاتے ہی ہزاروں قزلباش، ترکمان، ازبک، بلوچ اور افغان دلی والوں پر ٹوٹ پڑے۔ جن جن محلوں میں ایرانی مقتولوں کی لاشیں نظر آئیں وہاں کسی کو زندہ نہ چھوڑا۔ گھروں کو لوٹا، جلایا،

مردوں عورتوں، بچوں، بوڑھوں سب کو بلا امتیاز قتل کیا۔ چند گھنٹوں کے اندر دار السلطنت ہندوستان کی آبادی ایک ہولناک ویرانہ بن کر رہ گئی[1]۔ غریب محمد شاہ دم بخود بیٹھا اپنے شہر کی تباہی کا تماشا دیکھتا رہا۔ امرائے سلطنت میں سے کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اس وقت نادر شاہ کے سامنے جاکر معافی کی درخواست کرتا۔ آخر جب تباہی کی حد ہوگئی تو دو بجے کے قریب محمد شاہ نے نظام الملک سے استدعا کی کہ وہ نادر کے پاس جاکر رحم کی درخواست کریں۔ نظام الملک کے سن وسال، انکی تہذیب وشائستگی، انکی دانشمندی وفطانت اور انکی باوقار شخصیت کا نادر شاہ پر خاص اثر تھا۔ دربار کے امرا میں وہ صرف انہی کو احترام کے قابل سمجھتا تھا۔ وہی ایک ایسے شخص تھے جو سیاسی اور رسمی مجلسوں میں جرأت وبے باکی کے ساتھ نادر شاہ سے گفتگو کرتے تھے اور جنکی

---

[1] مختلف مصنفین نے مقتولوں کی تعداد مختلف بیان کی ہے۔ آٹھ ہزار سے لیکر تین چار لاکھ تک اندازہ کیا گیا ہے۔ مگر ایک معتدل تخمینہ یہ ہے کہ اس ہنگامہ میں ۲۰ ہزار اور ۳۰ ہزار کے درمیان آدمی مارے گئے۔ خصوصیت کے ساتھ جو محلے تباہ ہوئے وہ چاندنی چوک، دریبہ، جامع مسجد اور پہاڑ گنج تھے۔ مقتولوں میں ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی بھی تھی جنھوں نے ذلت کی موت سے بچنے کے لیے خود اپنا کام تمام کرلیا۔ بہت سے لوگوں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کردیا اور سرفروشانہ لڑکر جان دی۔ ان کے علاوہ عورتوں اور بچوں کی ایک بڑی تعداد ایرانیوں کے ہاتھ اسیر بھی ہوئی۔

باتوں کو وہ توجہ کے ساتھ سنتا تھا۔ اس وجہ سے محمد شاہ اور اسکے امرا نے خیال کیا کہ اس قہر و غضب کی حالت میں اگر کوئی شخص نادر شاہ کے سامنے جانے اور اس سے کچھ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے تو وہ یہی پیر مرد ہے، اور اس سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی باتوں سے نادر کے غصہ کو ٹھنڈا کر سکیگا۔ چنانچہ محمد شاہ کے حکم سے نظام الملک اپنا سر ہتھیلی پر لیکر اس خوفناک موقع پر سنہری مسجد پہنچے اور[۱] نادر شاہ کے سامنے حاضر ہو کر اس سے رحم کی التجا کی۔ مشہور ہے انھوں نے نادر کو خطاب کر کے یہ شعر پڑھا تھا:۔

کسے نہ ماند کہ او را بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

اس پر نادر شاہ نے یہ کہہ کر کہ "بپاس خاطرت امان دادم" اپنی تلوار نیام میں رکھ دی، اور اسی وقت شہر میں امان کی منادی کرا دی۔ فوج پر نادر شاہ کے ضبط کا یہ عالم تھا کہ جس سپاہی نے بادشاہ کی امان کا حکم سنا، اس نے فوراً قتل و غارت سے ہاتھ روک لیا۔

اس کے بعد شہر پر زر فدیہ کی مصیبت نازل ہوئی۔ جو امرا، شرفا، معززین، اور عام شہری باشندے قتل و غارت سے بچ

---

[۱] ابوالفیض نے لکھا ہے کہ اس موقع پر فیروز جنگ ان کے ساتھ تھے۔ مگر زیادہ معتبر اور متواتر روایت یہ ہے کہ اعتماد الدولہ قمر الدین خاں وزیر اعظم ان کے ساتھ گئے تھے۔

رہے تھے ان پر تاوان لگایا گیا جو اکثر حالات میں انکی کل مالیت کے نصف کے برابر تھا، اور اسکو ہر قسم کی سختیوں کے ساتھ وصول کیا گیا۔ شہر کو پانچ حصوں پر تقسیم کر کے ہر حصہ میں تاوان کی تشخیص اور تحصیل کے لیے پانچ ایرانی سردار پانچ ہندوستانی امیر مقرر کیئے گئے۔ ہندوستانی امیر جو اس کام پر مقرر ہوئے تھے وہ نظام الملک، اعتماد الدولہ قمر الدین خاں، ظہیر الدولہ عظیم اللہ خاں، مبارز الملک سربلند خاں، اور مرتضیٰ خاں تھے۔ جو محلے نظام الملک اور اعتماد الدولہ کے سپرد تھے ان میں تشخیص بھی نرمی کے ساتھ کی گئی اور تحصیل بھی۔ اکثر غربا کا تاوان خود نظام الملک اور قمر الدین نے اپنے پاس سے ادا کر دیا۔ مگر عظیم اللہ خاں، سربلند خاں اور مرتضیٰ خاں نے ایرانیوں کے ساتھ مل کر خود اپنے اہل ملک پر ظلم وستم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، گھر کے گھر اور خاندان کے خاندان تباہ ہو گئے، مدفون خزانوں کی تلاش میں گھروں کو کھود ڈالا گیا، عورتوں کے جسم پر سے زیور اور کپڑے تک اتار لئے گئے، دھوپ میں کھڑا کر کے، بیدیں لگا کر اور ہر قسم کے عذاب دے دے کر رقموں کے اقرار کرائے گئے، اور چھپی ہوئی دولت کے پتے پوچھے گئے۔ بہت سے لوگوں نے ان ذلتوں سے بچنے کے لئے خودکشی کر لی، اور بہت سے لوگ عذاب کی سختیوں سے ہلاک ہو گئے۔ غرض ان تدبیروں کے ساتھ اہل شہر سے دو کروڑ روپیہ وصول کیا گیا۔ اسکے علاوہ کئی کروڑ روپیہ امراء و اعیان شہر سے بھی لیا گیا، جن میں خود وزیر اعظم سلطنت قمر الدین خاں بھی شامل

تھا۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ اسکو دھوپ میں کھڑا کیا گیا اور جب تک اس نے ایک کروڑ روپیہ نقد اور جواہر اور ہاتھی دینے کا وعدہ نہ کیا اس وقت تک اسے نہ چھوڑا گیا۔ لیکن اس موقع پر بھی نادرشاہ نے نظام الملک کا احترام ملحوظ رکھا اور ان سے کسی قسم کا تاوان طلب نہ کیا، نہ کوئی ایسی بات کی جو ان کے مرتبہ کے خلاف ہوتی۔

دھلی پر نادرشاہ کے تسلط اور اسکے سامنے مغل شہنشاہ کی کامل بے بسی نے تمام ہندوستان میں اضطراب برپا کر دیا، کیونکہ یہ ملک میں انقلاب کا پیش خیمہ نظر آتا تھا۔ سب سے زیادہ پریشانی اُن ہندو ریاستوں کو تھی جو مغلوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر آزاد ہو رہی تھیں یا ہو چکی تھیں۔ انکو خوف ہوا کہ شمال مغرب کا ایک اور طاقتور فاتح ہندوستان میں سلطنت قائم کرنے والا ہے جسکی حکومت اپنے زبردست نظام میں انکو پھر جکڑ لیگی۔ اسی زمانہ میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ نادرشاہ حضرت خواجہ معین الدین کے مقبرہ کی زیارت کے لئے اجمیر جانا چاہتا ہے۔ سفر اجمیر کے ارادہ کو راجپوتانہ کی تسخیر کا ارادہ سمجھا گیا، اور اس سے تمام راجپوت ریاستیں گھبرا گئیں۔ جے سنگھ سوائی اور اسکے امرا اپنے بال بچوں اور مال اسباب کو اودے پور کے پہاڑی علاقوں میں بھیج کر خود بھی مستعد ہو بیٹھے کہ نادر کے اقدام کی خبر سنتے ہی فرار ہو جائیں۔ راجپوتانہ کے بعد مالوہ، گجرات اور دکن کی طرح پیش قدمی بھی

اغلب تھی۔ اس لئے باجی راؤ نے نربدا اور بندھیاچل کی حفاظت میں بیٹھ رہنے کا خیال چھوڑ دیا، چنبل پر مدافعت کرنے کا نقشہ بنانا شروع کر دیا، ہولکر، سندھیا، چمناجی آپا اور دوسرے مرہٹہ سرداروں کو جو مختلف علاقوں میں سرگرم کار تھے، اپنے پاس بلا بھیجا اور ناصر جنگ کو لکھا کہ اس وقت ہمارے آپس کے اختلافات کوئی چیز نہیں ہیں، ہندوستان میں ہم سب کا ایک ہی دشمن ہے، جسکے مقابلہ کے لئے ہم کو مستعد و متحد ہونا چاہیے۔

لیکن یہ تمام خطرات بہت جلدی رفع ہو گئے۔ نادر شاہ ہندوستان کی تسخیر سے زیادہ ایران کے مسائل سے دلچسپی رکھتا تھا۔ دو مہینہ کے قریب دہلی میں رہنے کے بعد اس نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ۳ صفر ۱۱۵۲ھ (یکم مئی ۱۷۳۹ء) کو اس نے قلعہ میں ایک دربار منعقد کیا جس میں محمد شاہ اور اسکے امراء سلطنت بھی شریک ہوئے۔ اس دربار میں اس نے خود اپنے ہاتھ سے محمد شاہ کو سلطنت ہندوستان کا تاج پہنایا اور اعلان کیا کہ آج سے اس ملک میں محمد شاہ کا خطبہ و سکہ پھر رائج ہو[1] اور ہندوستان کے تمام امراء، رؤسا، اور صوبہ دار اسی کو اپنا شہنشاہ سمجھیں۔ جو امراء موجود تھے انکو اس نے تاکید کی کہ اپنے بادشاہ کے وفادار اور مطیع رہیں۔ اطراف ملک کے صوبہ داروں

---

[1] نادر کے دوران قیام میں محمد شاہ کا خطبہ و سکہ موقوف ہو چکا تھا۔ شہنشاہ کا لفظ صرف نادر شاہ کے لئے استعمال ہوتا تھا اور خطبہ و سکہ میں اسی کا نام لیا اور لکھا جاتا تھا

اور رئیسوں کے نام بھی اسی قسم کے فرمان لکھوائے جنمیں ناصر جنگ، راجہ ساہو، اور باجی راؤ وغیرہ شامل تھے خصوصیت کے ساتھ باجی راؤ کو یہ دھمکی دی کہ "اگر تم نے محمد شاہ کی اطاعت نہ کی تو میں اپنی فوج کے ساتھ پھر واپس آؤنگا اور تمھیں اسکی سزا دونگا" اسکے ساتھ ہی اس نے محمد شاہ کو بھی چند نصیحتیں کیں جن کا مدعا یہ تھا کہ وہ اپنی اُن زیان کاریوں سے باز آئے جن کی بدولت اسکی سلطنت تباہ ہو گئی ہے، اور ایسے طریقے اختیار کرے جو موجب استحکام دولت ہوں۔ اس نے کہا کہ تم نے اپنی حکومت کا نظم و نسق جن لوگوں کے ہاتھ میں دے رکھا ہے انمیں ایک شخص بھی اس امر خطیر کو سنبھالنے والا نظر نہیں آتا۔ جس ملک کا کاروبار ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہو وہ اگر تباہ و برباد نہ ہو تو جائے تعجب ہے۔ تمھارے ہاں صرف ایک شخص میں نے دیکھا ہے جو مدبر، جہاندیدہ اور حکمرانی کی قابلیتوں سے متصف ہے، اور وہ نظام الملک ہے۔ مناسب یہ ہے کہ تم اسکو اپنا مشیر بناؤ، اور اس کی رائے پر سب کام چھوڑ دو۔[1] محمد شاہ نے اس تاج بخشی اور

---

[1] ابو الفیض نے فتوحات آصفی ان نصیحتوں کو اسطرح نقل کیا ہے:۔

شد از غفلت پادشاہ جہاں — خراب ایں چنیں ملک ہندوستاں
زبس میدہی ارذلاں را سبق — نماندہ است در ملک نظم و نسق
کنوں ہم نرفتہ است اے شہریار — شوی گر ازیں بے خودی ہوشیار
اگر خواہی از خود بدلہا ہراس — دگر قدر شیر از سگ شناس
بمرد جہاں دیدہ بخش اختیار — کہ کارت ز رایش شود استوار
مدہ رہ بخود ہیز و اوباش را — دگر شارب خمر و عیاش را
بود ایں سخن آصف خیر خواہ — ز روی حقیقت اتالیق شاہ
نباید کہ بے رای ایں نامدار — کنی در رہ سلطنت ہیچ کار

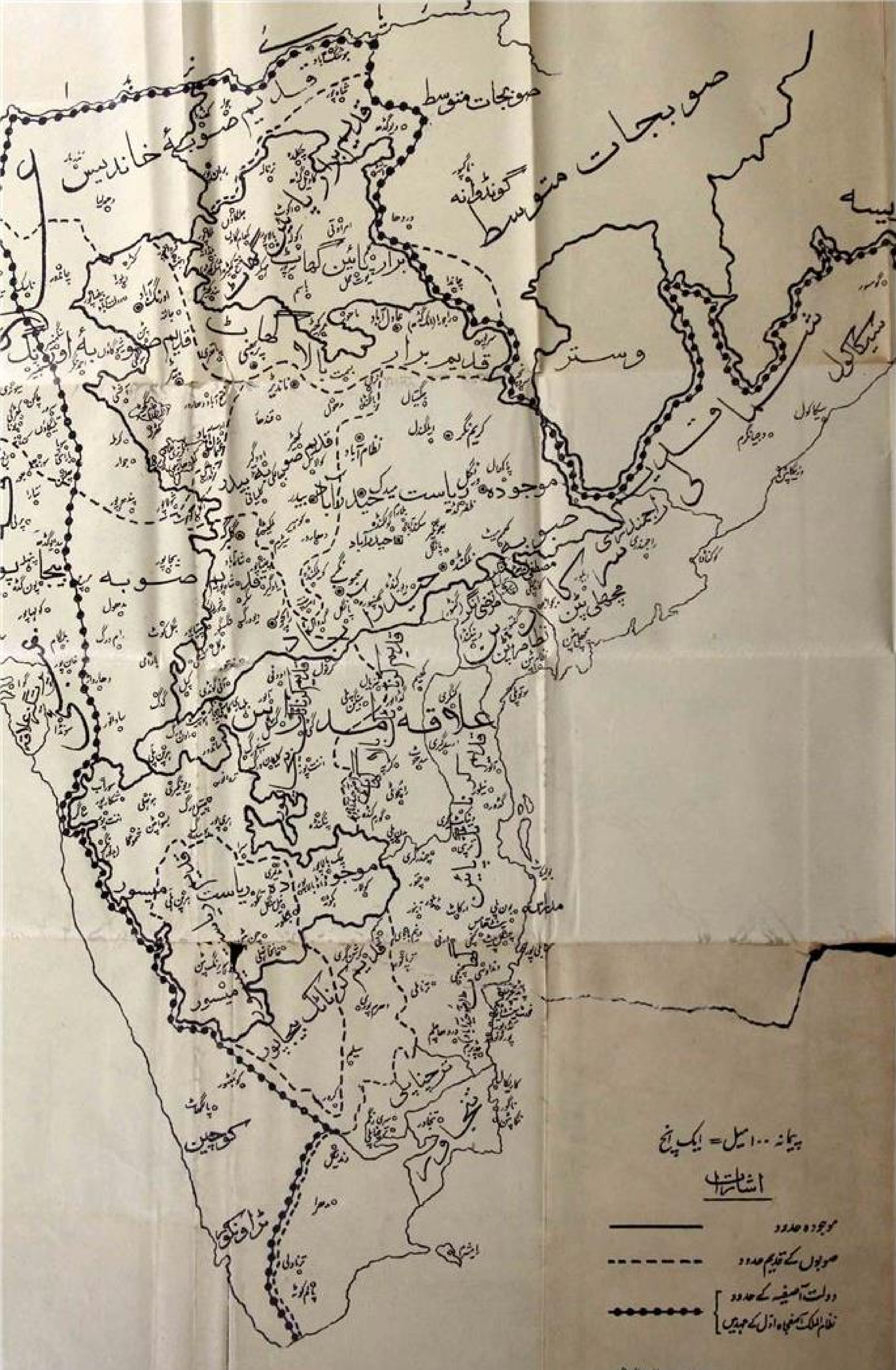
صوبجات متوسط
صوبجات متوسط
گونڈوانہ
ناگپور
قدیم صوبۂ خاندیس
برار پائین گھاٹ
قدیم برار بالا گھاٹ
قدیم صوبۂ اورنگ آباد
وستر
چکاکول
قدیم صوبۂ بیدر
موجودہ ریاست حیدرآباد
حیدرآباد
راجمندری
مچھلی پٹن
نظام پٹن
صوبہ بیجاپور
علاقہ زمیندار
موجودہ ریاست میسور
میسور
کرناٹک
ترچناپلی
تنجور
کوچین
تراونکور
پیمانہ ۱۰۰ میل = ایک انچ
اشارات
موجودہ حدود
صوبوں کے قدیم حدود
دولت آصفیہ کے حدود نظام الملک آصفجاہ اول کے عہد میں
D. by Mazhar. B.A.

ان نصائح کا شکریہ ادا کیا ، اور اس کے معاوضہ میں اپنی سلطنت کے وہ تمام صوبے جو دریائے سندھ کے اُس پار واقع ہیں برسم ضیافت پیش کیے اور ان کے ساتھ ٹھٹھ کا صوبہ بھی شامل کر دیا۔ اس دربار کے بعد ۷ صفر ۱۱۵۲ھ (۵ مئی ۱۷۳۹ء) کو نادشاہ دھلی سے ایران کی جانب روانہ ہوگیا۔

اس حملہ سے نادرشاہ کو جو فوائد اور ہندوستان کو جو نقصانات ہوئے ان کی مختلف تفصیل یہ ہے :-

— ۱۵ کرور روپیہ نقد شاہی خزانہ اور امرا اور رعایا سے ،

— بیش قیمت جواہر و نفائس جنکی مالیت کروروں روپے پہنچتی تھی ،

— شاہجہاں کا تخت طاؤس اور ۹ دوسرے مرصع تخت ،

— ۳ سو ہاتھی ، ۱۰ ہزار گھوڑے اور اسی قدر اونٹ ،

— ۱۳۰ منشی جو سلطنت مغلیہ کے محاسبات اور مالی نظم و نسق میں مہارت رکھتے تھے ، ۴۰ معمار ، ۲۰۰ آھن گر ، ۲۰۰ نجار ۱۰۰ سنگ تراش ، اور متعدد سادہ کار جو اُس وقت دھلی بلکہ سارے ہندوستان میں اپنی اپنی صنعتوں کے گلہائے سرسبد تھے ،

— کابل ، غزنیں ، کشمیر ، سندھ ، ٹھٹھ اور اس کے بندرگاہ ، غرض اٹک پار کا سارا علاقہ۔

اس کے علاوہ بالائی پنجاب کے بیشتر علاقہ جنکو نادرشاہ جنگ کرنال سے پہلے فتح کر چکا تھا ، اُنھیں اس نے محمد شاہ کے صوبہ دار لاہور کے انتظام میں چھوڑ دیا ، مگر ان پر ۲۰ لاکھ سالانہ کا خراج مقرر کر دیا۔

نقشہ کی تشریح

نظام الملک نے جس علاقہ پر اپنی خودمختار ریاست قائم کی تھی وہ سلطنت مغلیہ کے شش صوبۂ دکن پر مشتمل تھا۔ یہ چھ صوبے حسب ذیل ہیں :-

(۱) **صوبۂ خاندیس** اسکے حدود حسب ذیل تھے :

مشرق میں برار پائیں گھاٹ۔ مغرب میں سرکار سورت؛ شمال میں دریای نربدا، جنوب میں صوبۂ اورنگ آباد۔ سلسلہ کوہ سہیاچل (Sahyadoi Range) جس پر اجنٹہ آباد ہے ان دونوں صوبوں کے درمیان سرحد ہے۔ صوبہ اورنگ آباد سے صوبہ خاندیس میں جانے کا قدیم راستہ فردا پور کی گھاٹی میں سے ہوکر گذرتا تھا۔ اس صوبہ کی جمع کامل منعم خاں اور قادر خاں نے تھوڑے اختلاف کے ساتھ ۵۸۸۰۲۲۲ روپیہ، صاحب خزانہ رسول خانی نے ۵۹۴۶۱۶۱ روپیہ اور صاحب گلزار آصفیہ نے ۳۸۶۳۱۱۹ روپیہ اور گرانٹ ڈف نے ۵۴۴۹۹۱۸

روپیہ لکھی ہے لچھمی نرائن بھی اس کے قریب قریب آمدنی بتاتا ہے اس میں حسب ذیل سرکاریں (اضلاع) شامل تھیں :-

۱۔ سرکار آسیر۔ اسمیں ۳۳ محالات (پرگنے یا تعلقے تھے۔ برھانپور اسی سرکار میں ہے۔

۲۔ سرکار بگلانہ ۔ ۳۰ یا ۲۷ محال۔ مشرق میں سرکار کالنہ وندربار، مغرب میں سرکار سورت، جنوب میں سرکار جوار وتل کوکن، شمال میں دریائے تپتی۔

۳۔ سرکار بیجاگڈھ کھرگوں ۔ ۳۳ محال۔ سرکار ھانڈیہ کے مغرب میں یہ علاقہ نربدا کے جنوبی کنارے پر ہے۔

۴۔ سرکار کالنہ ۔ ۷ محال۔ یہ علاقہ صوبہ اورنگ آباد سے متصل تھا۔

۵۔ سرکار ندربار ۔ ۶ محال۔

۶۔ سرکار ہانڈیہ ۔ نربدا کے جنوبی ساحل پر۔ ہوشنگ آباد اور کھنڈوا اسی سرکار میں ہیں۔

یہ صوبہ سنہ میں غازی الدین خاں فیروز جنگ اور صلابت جنگ کی خانہ جنگی کی بدولت مرہٹوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ اب اس کا ایک حصہ صوبہ متوسط میں ہے اور دوسرا صوبہ بمبئی میں۔

۲۔ صوبہ اورنگ آباد اس کے حدود یہ تھے۔ مشرق میں سرکار پاتھری (برار) و صوبۂ بیدر، مغرب میں بحر عرب، شمال میں کوہ سہیاچل، جنوب میں صوبہ بیجاپور۔

س کی جمع کامل منعم خاں لچھمی نرائن، قادر خاں اور صاحب گلزار آصفیہ نے تھوڑے اختلاف کے ساتھ ۱۲۷۴۷۴۹۸ روپیہ، صاحب خزانۂ رسول خانی نے ۱۲۷۲۴۱۹۸، اور گرانٹ ڈف نے ۱۲۳۰۷۶۴۲ روپیہ لکھی ہے۔ اس صوبہ میں ابتدائً حسب ذیل سرکاریں شامل تھیں:-

۱۔ سرکار دولت آباد۔ ۲۷ محال۔ اس میں سے ۹ محالات اب انگریزی علاقے میں شامل ہیں۔

۲۔ سرکار احمد نگر۔ ۱۰ محال۔ میر نظام علی خاں کے اوائل عہد میں اس علاقہ پر مرہٹوں کا قبضہ ہوا اور اب صوبہ بمبئی میں شامل ہے۔

۳۔ سرکار پٹن۔ ۳ محال

۴۔ سرکار پرینڈا۔ ۱۹ محال۔ اس کے ۱۰ محالات میر نظام علی خاں کے عہد میں مرہٹوں کے حوالہ کئے گئے۔ صرف پرینڈا اور ۹ محال اسوقت دولت آصفیہ کے حدود میں ہیں۔

۵۔ سرکار بیڑ۔ ایک محال

۶۔ سرکار جالنہ۔ ۱۰ محال

۷۔ سرکار سنگمنیر۔ ۱۱ محال۔ یہ سرکار بھی میر نظام علیخاں کے عہد میں نکل گئی اور اب صوبۂ بمبئی میں شامل ہے۔ گلشن آباد ناسک، اور مشہور قلعہ تبرنبک اسی میں واقع ہیں۔

۸۔ سرکار شولاپور۔ ۳ محال۔ یہ علاقہ بھی میر نظام علیخاں کے عہد میں نکلا، اب صوبۂ بمبئی میں شامل ہے۔

۹ - سرکار فتح آباد دھارور - ۱۱ محال

۱۰ - سرکار جُنیر - ۲۰ یا ۲۳ محال - پونا اسی سرکار ک
ایک قصبہ تھا - یہ سرکار غالباً کبھی نظام الملک کے قبضہ میں نہیں آئی - خود عالمگیر کے زمانہ میں بھی یہ مرہٹوں اور شاہی فوجوں کے درمیان مابہ النزاع تھی۔

۱۱ - سرکار تل کوکن - ۱۶ محال - یہ سرکار قدیم زمانہ میں کوکن نظام شاہی کہلاتی تھی - مغربی گھاٹ اور سمندر کے درمیان دابُل کے شمال سے لیکر سرکار جوار کوکن تک اسکے حدود تھے - یہ علاقہ کبھی صحیح معنوں میں سلطنت مغلیہ کے اندر شامل نہیں ہوا - وقتاً فوقتاً اس پر فوجی قبضہ حاصل ہوتا رہا اور پھر مرہٹے اسے چھینتے رہے - فرخ سیر کے آخر عہد میں اس پر مرہٹہ سوراج تسلیم کیا گیا۔

۱۲ - سرکار جوار - ۱۳ محال - یہ کوکن کا بالائی حصہ ہے اور اسکی تاریخ بھی وہی ہے جو تل کوکن کی بیان کی گئی۔

صوبہ اورنگ آباد کی مذکورہ بالا ۱۲ سرکاروں میں سے تین خارج کرنے کے بعد ۹ سرکاریں نظام الملک کی ریاست میں شامل تھیں - اور اب انہیں سے ۵ سے کچھ زائد باقی ہیں۔

(۳) صوبہ برار - اسکے حدود یہ تھے :- مشرق میں گونڈوانہ مغرب میں خاندیس و اورنگ آباد، شمال میں سرکار چھانڈیہ - جنوب میں صوبہ حیدرآباد و بیدر - یہ صوبہ دو بڑی قسمتوں پر منقسم تھا - ایک برار بالا گھاٹ، دوسرے برار پائیں گھاٹ۔

پہلا حصہ فرازِ کوہ سہیاچل پر واقع ہے اور آج کل مملکت آصفیہ کے اضلاع عادل آباد، ناندیڑ، پربھنی اور اورنگ آباد میں شامل ہے۔ دوسرا حصہ پائین کوہ مذکور میں ہے اور آج کل برطانوی ہند کے صوبجات متوسط سے ملحق ہے۔

برار بالا گھاٹ میں حسب ذیل سرکاریں شامل تھیں:۔

۱۔ سرکار پاتھری ۔ ۱۱ محال ۔ اب پربھنی میں شامل ہے۔

۲۔ سرکار باسم ۔ ۹ محال ۔ اس کا بیشتر حصہ ضلع پربھنی میں ہے۔ مگر خود باسم برار پائیں گھاٹ میں چلا گیا ہے۔

۳۔ سرکار بیتال باڑی ۔ ۹ محال ۔ اب ضلع اورنگ آباد میں شامل ہے۔ اجنٹہ اسی علاقہ میں ہے۔

۴۔ سرکار ماھور ۔ ۲۰ محال ۔ اب ضلع عادل آباد میں ہے۔

۵۔ سرکار کھکر ۔ ۱۲ محال ۔ اس کا کچھ حصہ ضلع اورنگ آباد میں ہے اور کچھ برار پائیں گھاٹ سے ملحق ہو گیا ہے۔

اس حصہ کی آمدنی لچھمی نرائن کے بیان کی رو سے ۴۰۶۷۴۵۷۴ تھی۔

برار پائیں گھاٹ کی سرکاریں حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ سرکار گاویل ۔ ۴۶ محال ۔ ایلچپور اسی میں واقع ہے۔

۲۔ سرکار کلم ۔ ۲۴ محال ۔ اس میں امراوتی واقع ہے۔

۳۔ سرکار کھیرلہ ۔ ۲۴ محال ۔ اسمیں آشٹہ واقع ہے۔

۴۔ سرکار نرنالہ ۔ ۳۷ محال ۔ بالاپور اس سرکار میں ہے۔

۵۔ سرکار پونار ۔ ۴ محال

۶۔ سرکار اسلام گڈھ عرف دیوگڈھ ۔ ۴۹ محال جمع کامل

ساڑھے گیارہ لاکھ روپیہ۔ صلابت جنگ کے زمانہ میں اس پر مرہٹے مسلط ہوگئے تھے۔ اب صوبہ متوسط میں شامل ہے۔

۷۔ سرکار سرپور۔ ۷ محال۔

اس حصہ کی آمدنی لچھمی نرائن شفیق نے ۶۷۵۵۹۰۴ لکھی ہے اور دونوں حصوں کی مجموعی آمدنی منعم خاں قادر خاں اور صاحب گلزار آصفیہ کے بیان کے مطابق ۱۲۲۶۸۷۶۷ روپیہ تھی، صاحب خزانہ رسول خانی نے ۱۴۸۶۹۶۹۳ لکھی ہے، اور گرانٹ ڈف ۱۱۵۲۳۵۰۸ روپیہ بیان کرتا ہے۔

(۴) صوبہ محمد آباد بیدر۔ اسکے حدود یہ تھے۔ مشرق میں صوبہ حیدر آباد، مغرب میں صوبہ اورنگ آباد، شمال میں برار بالاگھاٹ، جنوب میں صوبہ بیجاپور۔ اس کی جمع کامل سوانح دکن گل گشت دکن اور گلزار آصفیہ میں ۶۹۴۲۱۰۲ روپیہ، خزانہ رسول خانی میں ۷۶۴۳۱۷۸ روپیہ، اور ڈف کی تاریخ مرہٹہ میں ۷۴۹۱۸۷۹ بیان کی گئی ہے۔ لچھمی نرائن ۷۵۰۴۵۶۵ لکھتا ہے۔ اس صوبہ میں یہ سرکاریں شامل تھیں:-

(۱) سرکار بیدر۔ ۸ محال

(۲) سرکار ایتگر (فیروزگڈھ)۔ ۴ محال

(۳) سرکار ملکھیڑ (مظفرنگر)۔ ۱۴ محال

(۴) سرکار امرچینتہ۔ ۱ محال

(۵) سرکار ناندیڑ۔ ۴۴ محال

(۶) سرکار کلیانی ۔ ۲ محال

(۷) سرکار انکل کوٹ (یا اکل کوٹ) ۷ محال ۔

یہ پورا صوبہ اب بھی مملکت آصفیہ میں شامل ہے ۔ صرف سرکار انکل کوٹ میں سے ایک محال معہ انکل کوٹ صوبہ بمبئی میں چلا گیا ہے جسے میر نظام علیخاں کے عہد میں مرہٹوں نے حاصل کیا تھا ۔

(۵) صوبہ بیجاپور ۔ یہ ایک عظیم الشان صوبہ تھا جس کے حدود صوبہ اورنگ آباد کے جنوب سے لیکر مدراس تک پھیلے ہوے تھے ۔ یہ دو بڑی قسمتوں پر منقسم تھا ۔ قسمت اول صوبہ بیجاپور ، اور قسمت دوم کرناٹک بیجاپور ۔

صوبہ بیجاپور قسمت اول کے حدود یہ ہیں :۔ مشرق میں صوبہ حیدرآباد ۔ مغرب میں بحر عرب شمال میں صوبہ بیدر و اورنگ آباد ، جنوب میں کرناٹک بیجاپور ۔ اس میں حسب ذیل سرکاریں شامل تھیں :۔

(۱) سرکار بیجاپور ۔ ۳۰ محال ۔ میر نظام علی خاں کے عہد میں اسپر مرہٹوں کا قبضہ ہوا ، اور اب صوبہ بمبئی میں ہے ۔

(۲) سرکار گلبرگہ ۔ ایک محال اب بھی مملکت آصفیہ میں ہے ۔

(۳) سرکار اعظم نگر ، بلگام ۔ ۱۵ محال ۔ میر نظام علی خاں کے عہد میں مرہٹوں کا قبضہ ہوا ۔ اب بمبئی کے علاقہ میں ہے ۔

(۴) سرکار اسعد نگر اکلوج ۔ ۱۲ محال ۔ اب بمبئی کے علاقہ میں ہے

(۵) سرکار امتیاز گڈھ ادونی ۔ ۶ محال ۔ میر نظام علی خاں کے عہد میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے وقتاً فوقتاً اس پر قبضہ کیا اور

پھر آخر کار یہ صوبہ مدراس میں شامل ہوگئی۔ ادونی، بلہاری اور کرنول اس سرکار کے مشہور مقامات ہیں۔

(۶) سرکار رائچور۔ ۹ محال۔ اب بھی مملکت آصفیہ میں ہے۔

(۷) سرکار بنکاپور۔ ۱۶ محال۔ مدتوں مرہٹوں اور حیدر علی و ٹیپو سلطان کے درمیان معرض کارزار رہا۔ آخر کار صوبہ بمبئی سے ملحق ہوگیا۔ ساوانور دھارواڑ اور ہری ہر اسی سرکار میں واقع ہیں۔

(۸) سرکار تورگل۔ ۱۶ محال۔ اس کی تاریخ بھی وہی ہے جو بنکاپور کی ہے۔ بادامی کا مشہور قلعہ اس میں ہے۔ اب اس سرکار میں سے صرف ایک محال مملکت آصفیہ میں باقی رہ گئی ہے۔

(۹) سرکار رائے باغ۔ ۱۲ محال۔ اب احاطۂ بمبئی میں ہے۔ کولھاپور اور اوندھ کی ریاستیں اسی سرکار میں واقع ہیں۔

(۱۰) سرکار غازی پور (نندیال)۔ ۲۳ محال۔ اب صوبہ مدراس میں ہے۔ بیگن پلی اس سرکار میں واقع ہے۔

(۱۱) سرکار نلدرگ ۸ محال۔ اس کا کچھ حصہ مملکت آصفیہ میں ابتک موجود ہے اور کچھ احاطۂ بمبئی میں چلا گیا ہے۔

(۱۲) سرکار محمد نگر (ایکری)۔ یہ اب ریاست میسور میں شامل ہے۔ میر نظام علی خاں کے عہد میں حیدر علی نے اس پر قبضہ کرلیا تھا۔

(۱۳) سرکار مدگل۔ ۱۳ محال۔ صرف تین محال معہ شہر مدگل مملکت آصفیہ میں شامل ہیں۔

(۱۴) مصطفیٰ آباد دابل۔ ۸ محال۔ یہ وہی علاقہ ہے جو کوکن عادلشاہی کہلاتا تھا۔ اس علاقہ پر مغلوں کی فتح سے پہلے سیواجی

مسلط ہو چکا تھا۔ عالمگیر کے آخر عہد میں یہی علاقہ مرہٹوں اور مغلوں کے درمیان جنگ کا میدان تھا۔ فرخ سیر کے عہد میں اس پر مرہٹہ راج تسلیم کیا گیا۔ نظام الملک کی حکومت میں یہ علاقہ کبھی داخل نہیں ہوا۔

(۱۵) سرکار مرتضیٰ آباد مرج۔ ۶ محال۔ مدتوں مرہٹوں اور حیدر علی کے درمیان مابہ النزاع رہا۔ اب صوبہ بمبئی میں ہے۔

(۱۶) سرکار بنی شاہ درگ (پرناله)۔ ۸ محال۔ مرہٹوں کے مشہور قلعے ستارا، چندن مندن اور پرلی وغیرہ اسی میں ہیں کوکن عادلشاہی کی طرح یہ بھی سلطنت مغلیہ کے زیر حکم نہیں آیا۔ اسلئے اسکو بھی نظام الملک کی ریاست سے خارج سمجھنا چاہیے۔

(۱۷) سرکار نصرت آباد (ساگر یا سگر)۔ ۵ محال۔ ایک محال انگریزی علاقہ میں ہے۔ باقی چار محال مملکت آصفیہ میں شامل ہیں۔ مشہور مقام تالی کوٹہ اسی سرکار میں واقع ہے جہاں دکن کی اسلامی ریاستوں نے بیجانگر کو شکست دی تھی۔

اس صوبہ کی جمع کامل سوانح دکن خزانہ رسول خانی اور گلزار آصفیہ میں ۳۶۱۷۰۹۰۴ روپیہ بیان کی گئی ہے۔ اگر اسمیں سے سرکار کرناٹک کی آمدنی وضع کرلی جائے (کیونکہ ان مصنفین نے سرکار کرناٹک کو بھی قسمت اول میں شامل کر دیا ہے) تو اس صوبہ کی آمدنی ۲۰۸۷۵۹۰۴ قرار پاتی ہے۔

کرناٹک بیجاپور۔ اس کے حدود اربعہ یہ ہیں: مشرق میں کرناٹک حیدرآباد، مغرب میں کہیں مغربی گھاٹ اور کہیں

بحر عرب، شمال میں صوبہ بیجاپور کے جنوبی اضلاع، اور جنوب میں مدھرا اور ڈنڈیگل۔ یہ وسیع خطہ انتظامی حیثیت سے دو حصوں پر منقسم تھا۔ ایک وہ جو براہ راست حکومت آصفیہ کے زیر انتظام تھا۔ اور دوسرا وہ جو پالیگروں اور زمینداروں کے ماتحت تھا اور یہ نظام الملک کو خراج ادا کرتے تھے۔ حصہ اول میں تقریباً ۵۰ محالات تھے جن کو چھ سرکاروں پر تقسیم کیا گیا تھا۔ سرا، کولار، ھکوٹہ، بالاپور کلاں، پنوکنڈہ، اور بسواپٹن۔ سرا اس قسمت کا حاکم نشین شہر تھا۔ اسکی جمع کامل صاحب تذکرۃ البلاد والحکام نے ۷۲۸۱۲۰ ہن[۱] اور صاحب گلزار آصفیہ نے ۰۰۰۵۲۹۵ روپیہ بیان کی ہے دوسرے حصہ میں تقریباً ۳۵ پالیگروں اور زمینداروں کی ریاستیں تھیں جو مغل حکومت کی باجگذار تھیں۔ ان ریاستوں کے نام یہ ہیں:۔

	آمدنی
سری رنگ پٹن (میسور)	۳۵۸۵۱۳۶۱ روپیہ
دیگر زمینداران تعلقۂ مذکور	۱۰۲۶۳۶۳۵ ”
زمیندار سوندھا (یا سونده)	۷۲۰۸۷۱ ”
زمیندار چیتل درگ	۱۱۲۵۰۰۰ ”
زمیندار جری ملا (یا جریلہ)	۹۳۷۵۰ ”
زمیندار تری گرا	۱۷۲۵۰۰ ”

زمیندار رتن گیری	۹۲۷۵۰	روپیہ
زمیندار صرہٹی	۷۵۰۰۰	"
زمیندار ماوگڈھ (یا پاوگڈھ)	۱۲۰۰۰۰	"
زمیندار نائک پالہ (دادنایک یا بیت نالک)	۱۵۰۰۰	"
زمیندار چک بالاپور	۱۹-۲۵۰	"
زمیندار گرتی کرا	۷۵۰۰۰	"
زمیندار ہرپن ہلی	۱۰۴۹۹۶۰	"
زمیندار آنی گونڈی	۱۷۳۵۵۰	"
زمیندار کنگ گیری	۹۹۱۱۶۵	"
زمیندار بلہاری	۸۶۲۵۰	"

ان کے علاوہ رائے درگ، دیوھٹی، دیون ہلی، بنگلور، انکس گری، انی گل، وینکٹ گری، پنکنور، مدن پلی، گوری گنڈہ، نیلگڈہ، سولی درگ، ھسکوڑ، بدنور، کورگ، متوری (یا متور)، ہاگل واڑی، کوڑی کوٹہ (یا کوڑی کوٹہ) اور شنکر گڈھ کے زمیندار بھی تھے جن میں سے بعض کی ریاستیں خاصی طاقت ور تھیں۔ ان کی مجموعی آمدنی تھوڑے اختلاف کے ساتھ حقیقت ہائے ہندوستان اور گلزار آصفیہ میں سوا پانچ کرور بتائی ہے۔ مگر کسی ذریعہ سے یہ نہ معلوم ہوسکا کہ ان ریاستوں سے صوبہ دار دکن کو کس قدر خراج وصول ہوتا تھا۔ کرناٹک بیجاپور کی یہ تمام ریاستیں فوجدار سِرا کے ماتحت تھیں جو اس علاقہ کا ناظم بھی تھا اور سیاسی کمیشن (پولیٹیکل ایجنٹ) بھی۔ بعد میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے

پورے کرناٹک بیجاپور کو فتح کر لیا۔ اور ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد یہ علاقہ موجودہ ریاست میسور اور صوبہ مدراس کے درمیان تقسیم ہو گیا۔

دوسرے حصہ میں میسور، چیتلدرگ، بدنور وغیرہ ۳۲ ریاستیں تھیں جنکی جمع کامل ۵۲۲۶۹۲۰۹ روپیہ تھی۔ صلابت جنگ اور میر نظام علی خاں کے عہد میں یہ پورا علاقہ مملکت آصفیہ سے الگ ہو گیا اور اب یہ ریاست میسور اور حکومت مدراس کے قبضہ میں ہے۔

(۶) صوبہ حیدر آباد ۔ یہ صوبہ بھی تقریباً اتنا ہی وسیع تھا جتنا صوبہ بیجاپور تھا۔ اسکی بھی دو بڑی قسمتیں تھیں۔ ایک صوبہ فرخندہ بنیاد، دوسرے کرناٹک بالا گھاٹ و پایان گھاٹ۔

قسمت اول صوبہ فرخندہ بنیاد کے حدود یہ ہیں:۔ مشرق میں خلیج بنگال، مغرب میں صوبہ جات بیدر و بیجاپور، شمال میں برار بالا گھاٹ، گونڈوانہ اور اڑیسہ، جنوب میں دریائے کرشنا۔ اس صوبہ کی جمع کامل سوانح دکن و گلزار آصفیہ کے مطابق ۱۷۰۸۵۳۴۷ روپیہ تھی، اور اسمیں حسب ذیل سرکاریں شامل تھیں:۔

(۱) سرکار محمد نگر گولکنڈہ - ۱۲ محال

(۲) سرکار بھونگیر - ۱۱ محال

(۳) سرکار دیورکنڈہ - ۱۲ محال - اب ضلع محبوب نگر کے نام سے موسوم ہے۔

(۴) سرکار میدک - ۱۲ محال

(۵) سرکار کولاس ۔ ۵ محال

(۶) سرکار کھمم میٹ ۔ ۱۱ محال

(۷) سرکار نلگنڈہ ۔ ۶ محال

(۸) سرکار کویلکنڈہ ۔ ۶ محال

(۹) سرکار پانگل ۔ ۵ محال

(۱۰) سرکار گھنپورہ ۔ ۹ محال

(۱۱) سرکار ایلگنندل (کریم نگر) ۔ ۲۱ محال

(۱۲) سرکار آرام گیر ۔ ایک محال

(۱۳) سرکار ورنگل ۔ ۱۶ محال

(۱۴) سرکار ملنگور ۔ ۴ محال ۔ یہ سب سرکاریں اب بھی مملکت آصفیہ میں شامل ہیں ۔

(۱۵) سرکار کان ہای الماس ۔ ایک محال ۔ جمع کامل ۔ ۲۵۵۰۰۰ روپیہ ۔ شمالی سرکاروں کی تفویض کے وقت یہ علاقہ مستثنیٰ کرلیا گیا تھا ۔ اب صوبہ ورنگل میں تعلقہ مدھرا کے قریب پرتیال کے نام سے موسوم ہے ۔ بعض مصنف اس کو سیکاکول کے علاقہ میں بتاتے ہیں ۔

(۱۶) سرکار مصطفیٰ نگر (کونڈپلی) ۔ ۲۴ محال
جمع کامل ۱۲۳۰۵۱۵ روپیہ

(۱۷) سرکار مرتضیٰ نگر (گنتور) ۔ ۵ محال
جمع کامل ۱۱۶۷۷۳۶ روپیہ

(۱۸) سرکار ایلور ۔ ۱۲ محال
جمع کامل ۵ : ۶۳۶ روپیہ

یہ پورا علاقہ ۸ سرکاروں پر مشتمل تھا میر نظام علی خاں کے عہد میں پیش کش کے عوض ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالہ کیا گیا ۔ اور اب صوبہ مدراس

(۱۹) سرکار راجمندری ۔ ۴۲ محال
جمع کامل ۶۸۵۵۲۹ روپیہ
(۲۰) سرکار مچھلی پٹن یا مچھلی بندر ۔ ۸ محال
جمع کامل ۵۴۰۹۵۸ روپیہ
(۲۱) سرکار نظام پٹن ۔ ایک محال
جمع کامل ۲۴۶۰۰۰ روپیہ
(۲۲) سرکار چلکہ سیکاکول ۔ ایک محال
جمع کامل ۸۴۰۸۲۲ روپیہ

میں شامل ہے۔ انگریز اس کو شمالی سرکاروں کے نام سے موسوم کرتے ہیں، کیونکہ یہ سرکاریں مدراس کے شمال میں واقع ہیں۔

قسمت دوم کرناٹک حیدرآباد کے بھی دو حصے تھے۔ ایک بالا گھاٹ ۔ دوسرا پایان گھاٹ ۔

کرناٹک بالا گھاٹ وہ علاقہ ہے جو مشرقی گھاٹوں کے فراز پر واقع ہے، اور ایک طرف ریاست میسور، دوسری طرف مملکت آصفیہ اور تیسری طرف مشرقی گھاٹوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس علاقہ کی جمع کامل ۴۹۶۲۳۶۳ روپیہ تھی اور اس میں حسب ذیل سرکاریں شامل ہیں:-

(۱) سرکار سرھوٹ ۔ ۸ محال ۔ اس کا حاکم نشین شہر کڑپہ تھا۔ اور اسکی آمدنی ۸۰۱۳۱۶ روپیہ تھی۔
(۲) سرکار گنجی کوٹہ ۔ ۱۵ محال
(۳) سرکار گورم کنڈہ ۔ ۱۲ محال
(۴) سرکار کھمم ۔ ۸ محال
(۵) سرکار گرنی یا گٹی ۔ ۱۳ محال ۔ جمع کامل ۸۹۹۸۱۹ ۔

میر نظام علی خاں کے عہد میں یہ پورا علاقہ حیدر علی کے تصرف میں آگیا۔ میسور کی آخری دو لڑائیوں میں نظام کو واپس ملا۔ مگر سنہ ۱۸۰۰ء کے تہنامہ کی رو سے انھوں نے اسے جمعیت نعلبندی کی تنخواہ کے عوض ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپرد کر دیا۔ اب یہ صوبہ مدراس میں شامل ہے۔

کرناٹک پایان گھاٹ۔ اس کے شمال میں سرکار گنتور و نظام پٹن، جنوب راس کماری، مشرق میں خلیج بنگال، اور مغرب میں مشرقی گھاٹ واقع ہیں۔ اسکی سرکاریں حسب ذیل تھیں:-

(۱) سرکار اودگیر۔ ۶ محال

(۲) سرکار ویلور۔ ۸ محال

(۳) سرکار پالم کوٹ۔ ۱۲ محال۔ محمود بندر، بسوا پٹن، اور وردھا چلم اسی میں ہیں۔

(۴) سرکار ترپاتور۔ ۱۰ محال۔ میلاپور، اور مدراس اسی سرکار میں ہیں۔

(۵) سرکار جگدیو پور۔ ۱۷ محال۔ وانیم باڑی، کاویری پٹن، خانخان ہلی، رائے کوٹ، اور چین پٹن اسی میں ہیں۔

(۶) سرکار چندر گیری۔ ۱۰ محال۔ چتور اور ترپتی اسی سرکار میں ہیں۔

(۷) سرکار چنگل پٹ۔ ۳ محال

(۸) سرکار سر دہ پلی۔ ۱۲ محال۔ نیلور، وینکٹ گری، اور انت ساگر اسی سرکار میں ہیں۔

(۹) سرکار کنجی (کانجی ویر) ۔ ۱۵ محال ۔ ارکاٹ اور کاویری پاک اسی سرکار میں ہیں ۔

(۱۰) سرکار ترناملی ۔ ۱۱ محال

(۱۱) سرکار نصرت گڈھ چنجی (جسے انگریز جینجی یا گنجی لکھتے ہیں) ۔ ۸ محال

(۱۲) سرکار وردادر ۔ ۹ محال ۔ فورٹ سینٹ ڈیوڈ اسی میں ہے ۔

(۱۳) سرکار وندادسی (جسے انگریز دانڈی واش لکھتے ہیں)

۳ ۔ محال

(۱۴) سرکار والکونداپور ۔ ۵ محال ۔

(۱۵) سرکار ترچناپلی ۔ یہ پہلے ایک باجگذار ریاست تھی ۔ بعد میں یہ نظامت ارکاٹ سے ملحق کرلی گئی اور مدھرا اور برناولی کے تعلقے بھی اسی سرکار میں شامل کرلئے گئے جس کی جمع کامل ۶۴۵۳۲۷۱۴۲ روپیہ تھی ۔

(۱۶) سرکار چنجاور یا تنجاور (جسے انگریز تانجور یا تنجور لکھتے ہیں) یہ ایک باجگذار ہندو ریاست تھی جسکی جمع کامل ۱۸۵۶۰۰۰۰ روپیہ تھی ۔ اب احاطہ مدراس میں شامل ہے ۔

اس علاقہ کا صدر مقام ارکاٹ تھا ۔ محمد علی والاجاہ نے انگریزی اثر سے کام لیکر میر نظام علی خاں سے فارغ خطی لکھوالی اور آخر میں انگریزوں نے والاجاہ کے خاندان سے بھی فارغ خطی لکھواکر اسے احاطہ مدراس سے ملحق کرلیا ۔ اس پورے علاقہ کی آمدنی باستثنائے تنجاور ۲۹۱۶۵۰۵۳ روپیہ تھی اور تنجاور کا

پیش کش شامل کرنے کے بعد ۳ کروڑ روپیہ سے متجاوز ہو جاتی تھی۔

ان چھ صوبوں کے علاوہ بندر سورت بھی ایک جداگانہ سرکار کی حیثیت سے نظام الملک کی مملکت میں شامل تھا۔ اور اسی باعث اس مملکت کو بعض اوقات شش و نیم صوبہ دکن کہا جاتا تھا اسکی آمدنی مجھ کو کہیں نہیں ملی۔ مگر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہاں سے در آمد و بر آمد کا محصول کثیر تعداد میں وصول ہوتا ہوگا۔ کیونکہ اس زمانہ میں اس بندرگاہ کی وہی حیثیت تھی جو آج کل بمبئی کی ہے۔ یہ تحقیق نہ ہو سکا کہ سورت کس زمانہ تک دولت آصفیہ میں شامل رہا اور کب اس سے الگ ہوا۔

اس نقشہ کی طیاری اور ان تفصیلات کی فراہمی میں حسب ذیل کتابوں سے مدد لی گئی :-

سوانح دکن ۔ یہ بہترین ماخذ ہے جس میں صوبوں، سرکاروں اور محالات کے حدود اربعہ اور انکی آمدنی بہ تفصیل درج کی گئی ہے۔

رقعات موسوی خاں جرأت ۔ اس کے ایک رقعہ میں صرف اتنا مذکور ہے کہ نظام الملک نے بے حاصلی صوبجات دکن کی شکایت کر کے بندر سورت شاہی حکومت سے مانگ لیا تھا۔

خزانہ رسول خانی ۔ اس کا ماخذ زیادہ تر سوانح دکن ہے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دوسرے ماخذ سے بھی استفادہ کیا ہے۔

کیفیت جمع و خرچ و انتظام ملک سرکار عالی ۔ (قلمی۔ کتب خانہ آصفیہ) سرسالار جنگ کے زمانہ میں کسی عہدہ دار نے لکھی ہے

جس کا نام مذکور نہیں ہے۔ نہایت مفید معلومات پر مشتمل ہے۔

گلزار آصفیہ

حقیقتہای ہندوستان۔ بیش قیمت معلومات پر مشتمل ہے۔

توزک والاجاہی } ان دونوں کتابوں میں کرناٹک کے
تذکرۃ البلاد والحکام } متعلق بیش قیمت معلومات ملتی ہیں۔

رسالۂ آمدنی و پیمایش ممالک ہند (قلمی کتب خانہ آصفیہ)
مصنف کا نام اور سنہ تالیف نہیں ملا۔

سیر الہند و گل گشت دکن۔

Imperial Gazetteer of India
Historical and Discriptive Sketch of H. E. H. The Nizam's Dominions
Hyderabad Gazetteer by M. Mehdi Khan
The Nizam, by Briggs

لیکن ان میں سے کسی کتاب میں بھی نظام الملک کی مملکت کے حدوں کی صحیح حد بندی نہیں کی ہے۔ یہ حد بندی میں نے کی ہے اگرچہ تحقیق و تفتیش کے بعد ابھی اس میں بہت کچھ ترمیم کی گنجائش ہے۔

مطبوعہ انتظامی پریس

بچوں کی کتابیں

پہلا سٹ (طبع شدہ)

(۱) کھٹی مٹھی بتیاں	۱۰/
(۲) چھو منتر کا دھاگا	۴/
(۳) رابن سن کروسو	۱۰/
(۴) لاڈلا اکبر	۱۰/
(۵) زمین گول ہے	۸/
(۶) عید	۸/
(۷) سمندری جہاز	۴/
(۸) کیڑے	۳/
(۹) سادہ زندگی	۳/
(۱۰) چھتری فوج	۳/
(۱۱) دسترخوان	۳/
(۱۲) پڑوس	۳/
(۱۳) جنگ کے بعد کیا ہوگا	۳/

دوسرا سٹ (زیر طبع)

(۱) گاؤں کا مکھیا	کوثر چاندپوری
(۲) سمندر کا شہزادہ	〃
(۳) محمود اور شاہد	〃
(۴) دغاباز دوست	〃
(۵) کالا دیو	عبدالوہاب مسلم
(۶) بولتی کیتلی	〃
(۷) قم قم قما قنیل	〃
(۸) یشی یمارو	〃
(۹) یوراشیما	〃
(۱۰) چھٹنکی خاں	〃
(۱۱) سنہری کیڑا	
(۱۲) طوفان	
(۱۳) چین کا سفر	

(ملنے کا پتہ)

کتاب خانہ انجمن ترقی اردو (ہند) عابد روڈ

حیدرآباد دکن

ہماری مطبوعات

- کنول ۔ اعظم کریوی کے بلند پایہ افسانے .... عصا ۱۲/
- سادہ اور رنگین افسانے ۔ ظفر قریشی صاحب دہلوی ...... عصا ۸/
- خانقاہ ۔ ایم اسلم کے جدید اور نئے افسانوں کا مجموعہ .... عصا ۱۲/
- لیلیٰ کے خطوط ۔ قاضی عبد الغفار صاحب ...... عصا ۸/
- لہو ترنگ ۔ سکندر علی صاحب وجد کا مجموعہ کلام ...... عصا ۸/
- ایک شاعر کا انجام ۔ ہندوستان کے مایہ ناز ادیب نیاز فتحپوری کا پہلا افسانہ ۱۲/
- مرمر اور خون ۔ عزیز احمد صاحب کا مشہور نفسیاتی ناول جسمیں بتایا گیا ہے کہ جذبات پرست امیرزادوں کیلئے مفلسی ایک کھلونا ہے .... عصہ ۸/
- کارخانہ ۔ ظریف فطرت فضل الرحمٰن صاحب کا مزاحیہ ڈرامہ ۔ سرمایہ داری، مزدور اور مزدور کی لیڈری پر عجیب انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے ۱۲/
- مشاہیر کی بیویاں (مغرب) مغرب کے مشاہیر کی بیویوں کی زندگی ... ۱۲/
- پارلیمانی طرز حکومت ۔ پارلیمان کے ذریعہ حکومت کا پورا نقشہ از منظور احسن ہاشمی ۱۲/
- مشرق بعید ۔ مشرقی ممالک کی سیاست وہاں کے سیاسی تعلقات اور معاہدات از شاہد حسین رزاقی ...... عصہ ۴/
- تقاریر جناح ۔ قائد اعظم کی حالیہ تقاریر کا اردو ترجمہ .... عصا ۸/
- مکتوبات نیاز ۔ دوسرا حصہ ۔ نیاز فتحپوری ۸/

ملنے کا پتہ ۔ کتاب خانہ انجمن ترقی اردو (ہند) عابد روڈ حیدرآباد دکن

ہماری زیر طبع کتابیں

۱۔ رقعات اُردو اول، دوم۔ مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اُردو (ہند)
۲۔ انتقادیات اول، دوم۔ تنقیدی مضامین جناب نیاز صاحب فتحپوری
۳۔ سیاحت نامہ اسلامیہ۔ قائد ملت نواب بہادر یار جنگ بہادر۔
۴۔ کلیات فانی۔ فانی بدایونی کا مکمل مجموعہ اضافہ کے ساتھ۔
۵۔ تسنیم۔ قیسی رام پوری کا اچھوتا ناول۔
۶۔ نئے افسانے۔ عزیز احمد صاحب۔
۷۔ مضامین فرحت اول، دوم، ہفتم مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کے مزاحیہ مضامین۔
۸۔ ہمارے کارخانے۔ منظور الحسن صاحب ہاشمی بی۔ اے۔
۹۔ قرآنی مملکت۔ شاہد حسین صاحب رزاقی ایم۔ اے۔
۱۰۔ مشاہیر کی بیویاں۔ مبارز الدین صاحب ایم۔ اے۔
۱۱۔ مشاہیر چین۔ میر عابد علی صاحب بی۔ اے۔
۱۲۔ پُرانے خدا۔ کرشن چندر۔
۱۳۔ مُسکراتے آنسو۔ بھارت چند کھنہ۔
۱۴۔ لینن گراڈ تا سمرقند۔ عشرت صدیقی۔
۱۵۔ افسانچے۔ برجموہن دتاتریہ کیفی

رسالہ "ہماری کتابیں" ماہانہ

یہ اردو میں اپنے طرز کا واحد علمی تحقیقی اور تنقیدی رسالہ ہے جو علی اختر صاحب حاتمی بی۔ ایس سی (عثمانیہ) کی زیرادارت شایع ہو رہا ہے اس رسالہ میں ہر ماہ عنوانات ذیل کے تحت بہترین مضامین شایع ہوتے ہیں:۔

مقالات مشاہیر مفکرین اردو اور بلند پایہ محققین ادب کے افکار جمیل اور تحقیقات انیق کے بیش بہا جواہر پارے۔

تذکرہ محسنین اردو اور مشاہیر ادب کے ذاتی حالات زندگی اور علمی و ادبی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی روشنی میں مبسوط جائزہ۔

علمی استفسارات قارئین کے تحقیق طلب استفسارات کے معلومات افزا اور بصیرت افروز جوابات نہایت دلکش رنگین اور پسندیدہ طرز بیان میں۔

تبصرہ۔ فن تنقید کے جدید اصولوں کے ساتھ زبان اردو کی بہترین تصنیفات پر ماہرانہ انتقاد۔

تعارف۔ جدید ترین مطبوعات اردو کی فن وار تقسیم اور عنوان موضوع کا سرسری خاکہ۔

علمی کتب خانہ۔ کتب خانوں اور دارالمطالعوں سے متعلق ٹھوس اور فنی مضامین۔

تکملہ۔ ایک سو سے زاید مطبوعات کے نام معہ مصنف، ناشر، قیمت سنہ اشاعت اور فن وار تقسیم

سررشتہ تعلیمات نے اس کو مدارس کیلئے منظور فرمایا ہے۔

سالانہ چندہ صرف (عہ)

مہتمم **محمد عبدالہادی** (عثمانیہ)

اردو منزل۔ اردو گلی حیدرآباد دکن

ہندوستان کا سب سے بڑا ادبی مرکز

کتب خانہ انجمن ترقی اردو ہند اردو - عابد روڈ مچھلی کمان حیدرآباد دکن

جہاں اردو کی معیاری، ادبی، سیاسی، مذہبی، معاشی، نفسیاتی، سائنٹیفک اور مختلف درسی کتب کا کثیر اسٹاک موجود ہے۔

ٹائیٹل مطبوعہ شمس الاسلام پریس